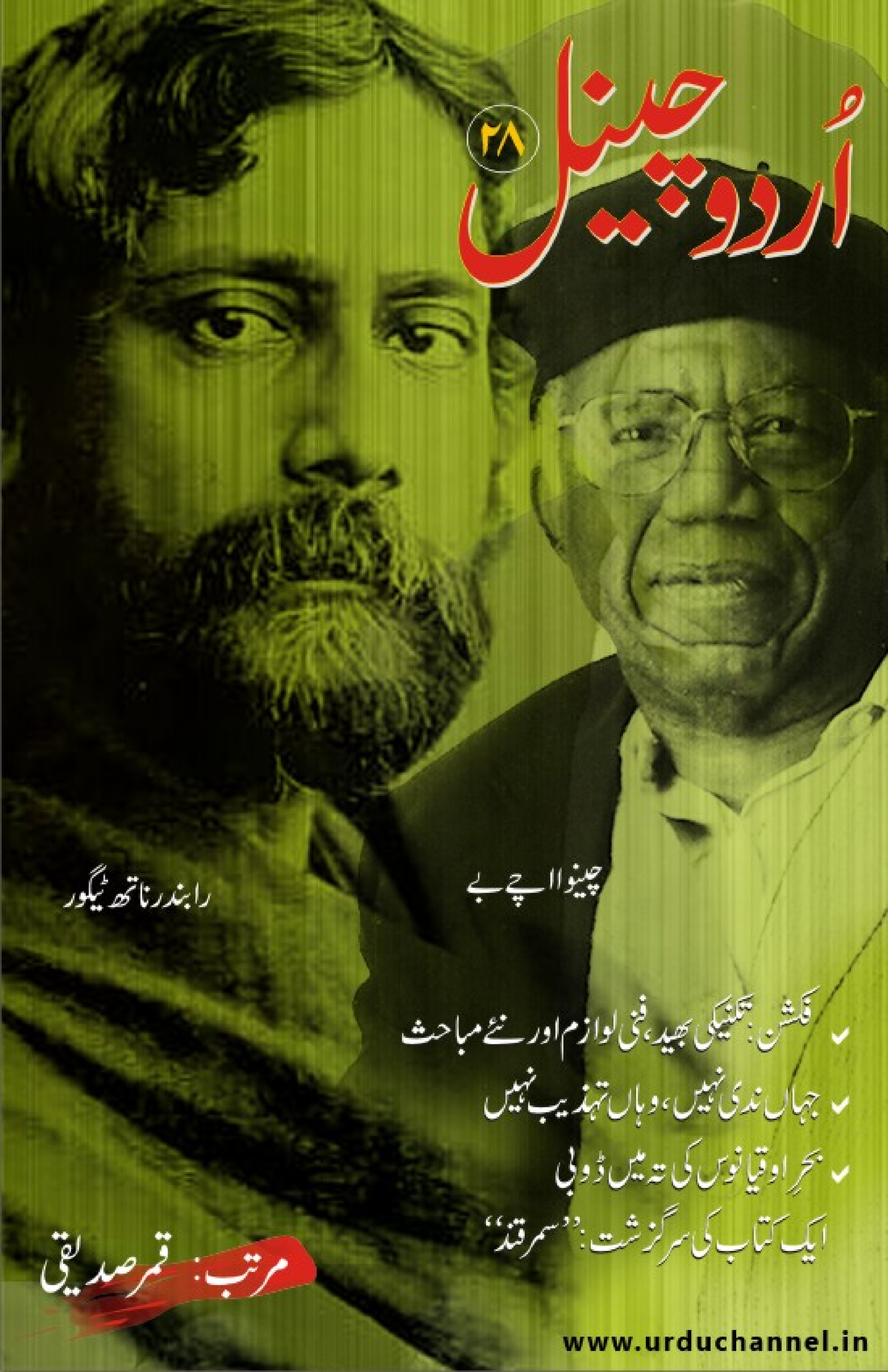
اُردو چینل
۲۸
رابندر ناتھ ٹیگور
چینوا اچے بے
فکشن: تکنیکی بھید، فنی لوازم اور نئے مباحث
جہاں ندی نہیں، وہاں تہذیب نہیں
بحرِ اوقیانوس کی تہ میں ڈوبی
ایک کتاب کی سرگزشت: ''سمرقند''
مرتب: قمر صدیقی
www.urduchannel.in

اشاعت کا بارھواں سال ❁ قائم شدہ: 1998

Web: www.urduchannel.in

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اردو چینل

کتابی سلسلہ ----------------------------

جلد: ۱۲، شمارہ ۳، (اکتوبر ۲۰۱۰ء)

قیمت-/100 روپے، زرِ سالانہ-/400 روپے

پرنٹر، پبلشر مالک: **شمس صدیقی**

مدیران: عبید اعظم اعظمی
قمر صدیقی

مشاورتی بورڈ:
پروفیسر صاحب علی ڈاکٹر قاسم امام،
جناب قاسم ندیم، ڈاکٹر شعور اعظمی، جناب خالد علی

معاونین: خالد صدیقی، مقصود بستوی،
ایم۔ غالب، مبارک علی خان

رفقائے اردو چینل

جناب منور پیر بھائی
ڈاکٹر شیخ عبداللہ
ڈاکٹر مصطفیٰ پنجابی
پروفیسر سیّد اقبال
بیگم ریحانہ اُندرے
ڈاکٹر ابراہیم سرکھوت
جناب عرفان جعفری
جناب عبداللہ امتیاز
جناب فاروق سیّد
جناب سلام عثمان شیخ
جناب خالد علی
جناب خان نصیر
جناب امانت علی
جناب محمد اسلم خان

❁ مضمون نگار کی آراء سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

❁ کسی بھی طرح کی قانونی چارہ جوئی صرف ممبئی کی عدالتوں ہی میں کی جاسکتی ہے۔

خط و کتابت و ترسیلِ زر کا پتہ:

اردو چینل 7/3121، گجانن کالونی، گوونڈی، ممبئی۔43، فون 25587860

Mob. 09773402060. Emai. urduchannel@gmail.com

D.D، M.O یا چیک صرف **Urdu Channel** کے نام ہی ارسال کریں

ایڈیٹر قمر صدیقی، پرنٹر پبلشر، مالک شمس صدیقی نے فاطمہ آفسیٹ پریس، ساکی ناکہ، ممبئی سے چھپوا کر دفتر **اردو چینل** 7/3121 گجانن کالونی، گوونڈی ممبئی۔43 سے شائع کیا۔

فہرست

آغاز 4

اداریہ قمر صدیقی 5

خراجِ عقیدت ڈاکٹر محمد کاظم 7

گوشۂ قابل اجمیری - 17

مہذب اور باشعور ذہن کا شاعر

ڈاکٹر عبادت بریلوی 18

خون کی دھار میں ڈوبی شاعری

ممتاز راشد 23

عشق انسان کی ضرورت ہے

ادیب سہیل 30

قابل اجمیری کی شاعری: ایک جائزہ

بینش سلیمی 32

حیاتِ قابل اجمیری

مشتاق احمد خان زادہ 38

گوشۂ چینوا اچے بے - 47

دن میرا زمانہ ہے اور رات آج کا دور ہے

چینوا اچے بے (انٹرویو) 48

جنگ (کہانی)

چینوا اچے ابے 55

دیوانگی (کہانی)

چینوا اچے ابے 68

پانی کا بحران - 81

نجکاری، جمہوریت کا نیا روپ ہے

راجندر سنگھ (انٹرویو) 82

جہاں ندی نہیں وہاں تہذیب نہیں

عرفان حبیب (انٹرویو) 91

کھلے بازار کا بند پانی

دتّا دیسائی 95

بگل بجانے کا وقت آ گیا ہے

امرت لال ویگڑ 99

پانی کی جنگ

سلام عثمان شیخ 103

کھانیاں

ٹھاکر کا کنواں

منشی پریم چند 105

سوکھا کنواں

آگستو سیپیڈیس 108

نل کاٹنے والا

مارگریٹ دیوراس 118

خصوصی مطالعہ - 121

سمرقند (ناول)

امین مالوف 122

کہانیاں - 149

چٹا کا شاخِ اشتہا کا

محمد حمید شاھد 150

لحاف والی لڑکی

مشرف عالم ذوقی 161

مکالمہ - 165

فکشن: تکنیکی بھید، فنی لوازم اور نئے مباحث

محمد حمید شاھد

محمد عمر میمن 166

غزلیں - 209

احمد مشتاق، مظفر حنفی، ناصر شہزاد،
بشر نواز، منور رانا، مہدی جعفر،
نصیر احمر، کرشن کمار طور، یاسمین حمید،
غلام حسین ساجد، عرفان ستار،
ڈاکٹر شعور اعظمی، عالم خورشید،
خورشید اکبر، خواجہ جاوید اختر،
خوشبیر سنگھ شاد، ذاکر خان ذاکر، قمر صدیقی

نظمیں - 221

زبیر رضوی، محمود شام، صبا اکرام،
ش۔ک۔ نظام، عبدالاحد ساز،
فاضل جمیلی، راشد انور راشد،
فرحان حنیف، پرویز عارض

کلاسک - 229

شفیق اورنگ آبادی: حیات اور کارنامے

اسلم مرزا 220

خطوط - 241

نیّر مسعود، پروفیسر فضیل جعفری،
پروفیسر سیّد محمد عقیل، زبیر رضوی،
جاوید صدیقی، بشر نواز،
پروفیسر مظفر حنفی، محمد حمید شاہد،
احمد رئیس، ڈاکٹر یونس اگاسکر،
ڈاکٹر یعقوب یاور، حیدر جعفری سیّد،
علی حیدر ملک، احمد وصی، عبدالاحد ساز،
اسلم مرزا، نور الحسنین، مشرف عالم ذوقی،
رؤف خیر، حسن جمال، نذیر فتح پوری،
عالم خورشید، راشد انور راشد،
ڈاکٹر افسر کاظمی، ابنِ عظیم فاطمی،
حماد انجم، ندیم احمد

آغاز

تخئیل دراصل قوت اختراع کا نام ہے، عام لوگوں کے نزدیک منطق یا فلسفہ کا موجد صاحب تخئیل نہیں کہا جاسکتا ، بلکہ اگر خود کسی فلسفہ داں کو اس لقب سے خطاب کیا جائے تو اس کو عار آئے گا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ فلسفہ اور شاعری میں قوت تخئیل کی یکساں ضرورت ہے۔ یہی قوت تخئیل ہے جو ایک طرف فلسفہ میں ایجاد اور اکتشافِ مسائل کا کام دیتی ہے اور دوسری طرف شاعری میں شاعرانہ مضامین پیدا کرتی ہے۔

__________علامہ شبلی نعمانی

گذارش

اگر اردو کے سنجیدہ اور حساس ادبی رسائل کے مدیر حضرات پیسہ لے کر معمولی کتابوں اور اوسط درجے سے بھی کم ادبی پہچان کے حامل ادیبوں کو تو قیر دینے کے رویے کو ناپسندیدہ نظر سے دیکھتے ہوئے اس کی حوصلہ شکنی کریں اور معیاری اور مستحق کتابوں کو پانچ دس توصیفی سطروں کے ساتھ اُن کی اعزازی تشہیر میں آمادگی سے حصّہ لیں تو اوسطیوں Mediocres کا کچھ ادبی رسائل میں یہ بڑھتا ہوا شور وغوغا ''صفر'' کیا جاسکتا ہے۔

__________زبیر رضوی

قمر صدیقی

اداریہ

’اردو چینل‘ کا شمارہ 28 آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے مجھے یک گونہ طمانیت کا احساس ہو رہا ہے کہ یہ شمارہ قدرے وقت پر آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اردو رسائل کے ساتھ اشاعتی تعطل ایک عام سی بات ہے اور یہ روگ قریب قریب اردو کے ہر غیر سرکاری رسالے کو لاحق ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کی بنیادی وجہ ضروری فنڈ کی عدم دستیابی ہے۔ فنڈ کی قلت کی جو وجوہات ہیں ان میں قاری یا خریدار کی ادبی رسائل کے تئیں بے توجہی اور اشتہارات کی ناکافی حصولیابی اہم ہیں اور میں انھیں کو جائز ذرائع سمجھتا ہوں ورنہ...............

ادبی رسائل محدود تعداد میں شائع ہوتے ہیں اور کمرشیل اشتہارات کی حصولیابی رسالے کے سرکیولیشن پر منحصر ہوتی ہے لہٰذا چند ایک سرکاری اشتہارات کو چھوڑ دیں تو ادبی رسائل کے پاس اشتہارات بالکل نہیں ہوتے۔ کمرشیل اشتہارات کی حصولیابی ادبی رسائل کے لیے یوں بھی بہت مشکل ہے کہ یہ اشتہارات بازار کی تہذیب کے مرہون منت ہوتے ہیں اور بازار کے مزاج پر ادبی پرچے کو جاری رکھنا تلوار کی دھار پر چلنے کے مترادف ہے۔ لہٰذا لے دے کے ادبی رسائل کے مالی استحکام کی ایک ہی صورت بچتی ہے اور وہ ہے اس کا قاری یا خریدار لیکن آج کمپیوٹر اور دیگر طباعتی سہولتوں کے باعث رسائل کی جو بھرمار ہوگئی ہے اس کی وجہ سے قاری کا مسئلہ بھی ادبی رسائل کے ساتھ بہت ٹیڑھا ہو گیا ہے۔ صارفیت کے اس دور میں مسابقت صارف (قاری) کے لیے ایک اچھی چیز ہے لیکن جس طرح موسمی رسائل دھڑا دھڑ نکل رہے ہیں اور بند ہو رہے ہیں اس سے رسائل کے استحکام کے تئیں قاری کا اعتماد روز بروز متزلزل ہوتا جا رہا ہے۔

دوسرا معاملہ رسائل کے مشمولات کا ہے۔ محترم حسن جمال کا کہنا ہے کہ ’’مدیروں کا یہی تو کمال ہوتا ہے کہ وہ اپنی پسند کو قارئین پر تھوپ دیتے ہیں۔‘‘ میں ان کی بات سے پوری طرح متفق ہوں لیکن غور کرنے کی بات یہ ہے کہ اب ایسے مدیر بھی کہا رہے جو اپنا وژن رکھتے ہوں اور اسی وژن اور فکر کے تحت رسالہ ترتیب دیتے ہوں۔ اب رسائل میں مدیر نہیں ’’منشی‘‘ ہوتے ہیں۔ جو اپنے یہاں آئی ڈاک کا مطالعہ کر کے انھیں آگے پیچھے شائع کرتے جاتے ہیں۔ بے چارہ قاری (بھلے ہی محدود) جو ادب پڑھنے کے لیے رسالہ خریدتا ہے اسے فاروقی اور نارنگ کی شکر رنجی کی روداد پڑھنے کو ملتی ہے۔ فکشن اور شاعری کے نام پر زبان و فن سے عاری تحریریں پڑھنے کو ملتی ہیں۔ ایسا اس لیے ہے کہ ادبی صحافت جس وابستگی اور ریاضت کی متقاضی ہے ہمارے مدیران میں اس کا فقدان ہے۔ اردو کے ساتھ مشکل یہ ہے کہ جس کو بھی چار چھ سطریں لکھنا آ گئیں وہ خود کو مصنف اور جس نے کچھ سرمایہ اکٹھا کر کے

رسالہ کے دوایک شمارے شائع کر لئے وہ اپنے کو مدیرِ اعظم تصور کرنے لگتا ہے جبکہ ہمیں اس بات کو ہمیشہ ملحوظ خاطر رکھنا چاہئے کہ جو کچھ ہم لکھتے ہیں اور جو کچھ ہم شائع کرتے ہیں اسے ہم سے کئی گنا علم رکھنے والے لوگ پڑھتے ہیں اور وہ ہماری کوتاہ بینی اور کم علمی کے باعث ہمیں مسلسل اپنی نظروں سے گراتے جاتے ہیں۔ ہم نے حتیٰ الامکان کوشش کی ہے کہ 'اردو چینل' کو اردو ادبی رسائل کی اس بھیڑ چال سے الگ رکھا جائے۔ تہذیبی ڈسکورس، عالمی ادب کے تراجم، کلاسک کا سلسلہ، ادبی موضوعات پر مکالمہ کے ساتھ ساتھ شعری و نثری تخلیقات کا بہترین انتخاب پیش کرنا ہماری کوشش ہوتی ہے اور یہی ہمارا اختصاص بھی ہے۔

اپنی اسی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے ہم نے اس شمارہ میں قابل اجمیری پر ایک مختصر گوشہ شامل کیا ہے۔ قابل اجمیری اردو کے ان شعرا میں شمار ہوتے ہیں جن کے ساتھ زندگی نے بہت زیادہ وفا نہیں کی۔ آج جب اردو رسائل میں تجارتی گوشوں اور نمبروں کی ہوڑ لگی ہوئی ہے ایسے وقت میں قابل اجمیری جیسے شاعر پر گوشہ نکالنے کا مقصد بس یہی ہے کہ حتیٰ الامکان حق دار کو اس کا حق ادا کر دیا جائے۔ قابل کے بہت سے اشعار ہندوستان میں 'نامعلوم' کے نام سے مشہور ہیں۔ نئی نسل کو قابل سے متعارف کرانا میں سمجھتا ہوں ہم سب کی ذمہ داری تھی لہٰذا اپنی مقدور بھر کوشش ہم نے کی ہے۔

چینوا اچے بے کو نائیجیریا میں قومی ہیرو کا درجہ حاصل ہے۔ اس شمارے میں اچے بے کا ایک انٹرویو اور دو کہانیاں شامل ہیں۔ اچے بے کا اردو میں پہلا تعارف غالباً پروفیسر شمیم حنفی کے ذریعے ہوا۔ ان کی کتاب 'سیاہ فام افریقی ادب' کے ایک مضمون میں اچے بے کا سرسری ذکر موجود ہے۔ اچے بے افریقی ادب کا نا قابلِ فراموش نام ہے۔ سیاست اور سماج کے بیچوں بیچ سے انھوں نے اپنی تحریروں کے لیے راستہ نکالا ہے۔ اس شمارہ میں 'پانی کے بحران' پر بھی کچھ تحریریں شامل ہیں۔ کچھ عرصہ قبل میرے ایک دوست نے کہا تھا کہ آخر اس موضوع کا ادب سے کیا تعلق ہے؟ میں اس باب میں زیادہ کلام نہ کرتے ہوئے اس عنوان کے تحت شامل تینوں کہانیاں اُن کی نذر کرتا ہوں۔

اس شمارہ میں 'خصوصی مطالعہ' کے عنوان سے امین مالوف کے ناول 'سمرقند' کے ابتدائی حصے کا ترجمہ بھی شامل ہے۔ امین مالوف 25 رفروری 1949ء کو بیروت (لبنان) میں ایک کیتھولک گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کی مادری زبان عربی ہے لیکن وہ فرانسیسی میں لکھتے ہیں۔ ان کے ناول خانہ جنگی اور ہجرت کے تجربات سے عبارت ہیں اور ان کے الفاظ زمین، زبان اور مذہب کے درمیان چلنے والے مسافر کی مانند زندگی کے تضادات کے مختلف شیڈس کو درشاتے ہیں۔ بشمول 'سمرقند' انھوں نے کل سات ناول لکھے ہیں۔ جبکہ غیر افسانوی تحریروں میں ان کی کتاب ''عربوں کی نگاہ میں صلیبی جنگیں'' بین الاقوامی شہرت کی حامل ہے۔ 'اردو چینل' کے لیے یہ اعزاز کی بات ہے امین مالوف نے نہ صرف 'سمرقند' کے اردو ترجمے کی اشاعت پر خوشی کا اظہار کیا ہے بلکہ انھوں نے اپنے پبلشر سے 'اردو چینل' میں اس ناول کی اشاعت کی اجازت بھی مرحمت فرمائی ہے۔

اردو فکشن اور خصوصاً صنف افسانہ سے متعلق میری تشویش کچھ ایسی بے وجہ بھی نہیں ہے۔ اب دیگر رسائل میں بھی اس کا اظہار ہونے لگا ہے کہ اردو میں صنف افسانہ زوال کی طرف گامزن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس شمارہ میں مکالمہ کے عنوان کے تحت فکشن کے معتبر ناقد سکندر احمد کا انٹرویو اور فکشن پر محمد عمر میمن اور محمد حمید شاہد ایک طویل بحث کا حصّہ اول شائع کیا جا رہا ہے۔

اردو دنیا کے لیے یہ خبر باعث صد مسرت ہے کہ اردو کے سرکردہ ناقد، فکشن نگار اور دانشور شمس الرحمٰن فاروقی کو پاکستان کے بلند ترین شہری اعزاز ''ستارۂ امتیاز'' سے نوازا گیا ہے جبکہ جدید شاعر شہر یار کو ہندوستان کا سب سے بڑا ادبی اعزاز ''گیان پیٹھ ایوارڈ'' تفویض کیا گیا ہے۔ ادارہ ان دونوں حضرات کو مبارکباد پیش کرتا ہے۔☆☆☆

خراجِ عقیدت

رابندر ناتھ ٹیگور

(1861-1941)

ٹیگور نے دنیا کو محض ایک ایسا رنگ منچ نہیں تسلیم کیا ہے جہاں انسان زندگی بتانے کی کوشش کرتا ہے بلکہ انھوں نے اسے ایک ممتا بھری ماں کے روپ میں بھی دیکھا ہے جو زندگی اور زندگی کے مسائل کے حل تلاش کرتے انسان کی نگرانی کرتی ہے۔

______ ہمایوں کبیر

(رابندر ناتھ ٹیگور کے ڈیڑھ سو سالہ یوم پیدائش پر بطور خراج عقیدت یہ مضمون اس شمارے میں شامل کیا جارہا ہے۔ادارہ)

ڈاکٹر محمد کاظم

رابندرناتھ ٹیگور: ایک زمانہ شناس ڈرامانگار

رابندرناتھ ٹیگور اس پُر آشوب دور کے نمائندہ ہیں جب برطانوی حکومت کا جبر اپنے شباب پر تھا۔ ایک جنگِ آزادی سے دوسری جنگِ آزادی کا سلسلہ چل رہا تھا۔ جب ہندستان کے عوام انگریزوں کی غلامی سے نجات حاصل کرنے کی کوشش میں سرگرم تھے۔یعنی 1857 کی جنگِ آزادی کی آگ ابھی ٹھنڈی بھی نہیں ہوئی تھی کہ 17 مئی 1861 کو بنگال کے ایک زمیندار گھرانے میں دابندرناتھ ٹیگور کی چودھویں اولاد کی شکل میں ٹیگور نے آنکھ کھولی اور جب جنگِ آزادی شباب پر تھی تو 17 اگست 1941 کو اس دارِفانی کو خیر باد کہا۔

رابندرناتھ ٹیگور اس ہمہ جہت شخصیت کا نام ہے جنھوں نے بہ یک وقت موسیقی، رقص، شاعری، افسانہ، ناول، ڈراما، مصوّری اور نہ جانے کن کن فنون کی نہ صرف خدمت کی بلکہ انھیں وقار عطا کیا۔ ہمیں معلوم ہے کہ ہندستان بلکہ عالمی سطح پر رابندر گیت اور رابندر رقص کو جو مقبولیت حاصل ہے وہ کسی اور کے حصّے میں نہیں آئی اور اس کی کئی وجوہات ہیں۔

ٹیگور نے ایسے گھر میں آنکھ کھولی تھی جہاں نہ صرف تہذیب وثقافت کی آبیاری ہورہی تھی بلکہ تہذیب و ثقافت کو محفوظ کرنے اور ان میں نئی نئی جہت تلاش کرنے کا سلسلہ چل رہا تھا۔ ٹیگور کے گھر میں باضابطہ ایک اسٹیج تھا جہاں رقص وموسیقی کی تعلیم دی جاتی تھی اور اس اسٹیج پر اکثر ڈراما بھی پیش کیا جاتا تھا اور کوئی گوشٹی بھی ہوتی تھی۔ یہاں میں ٹیگور کی اس ہمہ جہت تخلیقی پہلوؤں میں سے ایک یعنی ڈرامانگاری پر اپنی گفتگو کو مرکوز رکھنا چاہتا ہوں۔

ڈراما ٹیگور کی گھٹّی میں تھا۔ بنگلہ زبان میں ڈراما کی ابتدا سے ہی ٹیگور کے گھر میں ڈراما داخل ہو چکا تھا۔ ٹیگور کے دادا پرنس دوارکاناتھ ٹھاکر کو ڈراموں سے بے حد دلچسپی تھی۔ پرنس دوارکاناتھ نے چورنگی تھیٹر اور ماموسی تھیٹر قائم کرنے میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا تھا۔ ان کے والد دیوندرناتھ اور چچازاد بھائی گگیندرناتھ اور گیانندرناتھ بنگلہ اسٹیج کے ماہر اداکار تھے۔ ان کے بھائی جیوتی اندرناتھ نہایت کامیاب ڈرامانگار اور ماہر اداکار تھے۔ ان کے علاوہ اور بھی کئی اہم ڈرامانگار، فنکار اور اداکار ان کے گھر میں موجود تھے۔ گویا یہ گھرانہ نہ صرف بنگلہ اسٹیج بلکہ ہندستانی

اسٹیج کی نمائندگی کر رہا تھا۔ ایسے گھر میں رہتے ہوئے رابندر ناتھ کے اندر ڈرامہ سے دلچسپی پیدا ہونا فطری تھا اور یہ دلچسپی اتنی تیزی سے ٹیگور کے اندر پھیلنے لگی کہ پہلے کم عمری میں ہی اپنے بھائی کے ذریعہ اڈیٹ کئے ہوئے ڈرامے میں اداکاری کی اور پھر جلد ہی بیس برس کی عمر (1881) میں ایک میوزیکل ڈراما 'بالمیکی پرتبھا' لکھ ڈالا، جو نہ صرف کامیابی سے کھیلا گیا بلکہ بے حد مقبول ہوا۔

اس سے پہلے کہ ٹیگور کے ڈراموں پر تفصیلی گفتگو کی جائے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ٹیگور سے پہلے بنگال میں بنگلہ اسٹیج کی صورتِ حال پر روشنی ڈالی جائے۔

ہمیں معلوم ہے کہ بنگلہ میں ڈرامے کی ابتداء اٹھارویں صدی کے آخر میں ہو چکی تھی۔ ابتداء میں ترجمہ شدہ بنگلہ ناٹک کھیلا گیا لیکن جلد ہی بنگلہ ڈراما ترقی کرتا گیا اور اس کے تراجم انگریزی میں کئے جانے لگے۔ بنگلہ ڈراموں کے تاریخ نویسوں نے ٹیگور سے قبل کے دور کو دو حصّوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے دور کو مذہبی موضوعات پر مبنی دور کہا جاتا ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ نہ صرف بنگلہ بلکہ ہندستان میں تقریباً ہر زبان میں ناٹک کا ابتدائی دور مذہبی موضوعات پر ہی مبنی رہا ہے۔ بنگلہ زبان میں بھی ابتدائی دور اس کی پیروی کرتا ہے۔ لیکن جلد ہی بنگلہ اسٹیج پر نہ صرف ان فرسودہ مذہبی موضوعات کی نفی کی گئی بلکہ سنسکرت ڈراموں کی پیروی سے نجات کی کوشش بھی دکھائی دیتی ہے۔ رام نرائن نرکاتن، مائیکل مدھوسودن دت اور دین بندھو مترا نے اس دور میں ہونے کے باوجود اپنے بعد کے دور کی نمائندگی کرتے ہوئے اپنے ڈراموں کے ذریعہ سماج سدھار کا کام کیا۔ ان ڈراما نگاروں نے وہ زمین تیار کر دی جس کی پیروی کر کے بنگال میں سماجی اور انقلابی ڈرامے کی فصل تیار کی جا سکتی تھی۔ لیکن اس کے برخلاف ٹیگور سے پہلے کے دوسرے دور میں اسٹیج کو تجارت کا ایک حصّہ بنا دیا گیا اور ڈراما انسان اور سماج کی نمائندگی کرتے ہوئے ایک اہم میڈیم بننے کے بجائے عوام کو صرف اور صرف سستی تفریح فراہم کر کے روپے کمانے کا ذریعہ بن گیا۔ بنگلہ ڈرامے کی دوسری ایک اور قسم سامنے آئی جس نے مذہب کے نام پر انسان کے دلوں میں خلیج پیدا کرنے کا کام کیا۔ ان ناٹکوں میں مذہبی جذبات کو ابھار کر پیش کرتے ہوئے ایسے غلط قدم اٹھائے گئے جس سے بنگالی سماج میں ایک مذہب کے ماننے والوں کے دلوں میں دوسرے مذہب کے ماننے والوں کے خلاف نفرت کے جذبات ابھرنے شروع ہو گئے۔ مثال کے طور پر امرت لال کے کئی ڈراموں کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ اسی دور میں آزادیِ نسواں کے خلاف بھی چنگاری نظر آتی ہے۔ گویا پہلے دور میں مثبت اور ترقی پسند خیالات کے زیرِ اثر ڈرامے لکھنے اور کھیلنے کی جو تحریک شروع ہوئی تھی اس کو اس دور نے آگے بڑھانے کے بجائے ختم کرنے کی کوشش کی گئی۔ ایسے میں ٹیگور نے نہ صرف پھر سے پہلے دور میں جا کر اس خلیج کو پاٹنے کی کوشش کی بلکہ اپنے دور کے منفی خیالات و فکر کی نفی اور مثبت فکر و فلسفہ کو آگے بڑھانے کے لیے مشقّت بھی کی۔

ہم جانتے ہیں کہ ناٹک رابندر ناتھ ٹیگور کا نہ صرف شوق تھا بلکہ اپنے مقصد کے حصول کا سب سے اہم ذریعہ تھا۔ پہلے تماشائی پھر اداکار اور پھر ڈراما نگار کی حیثیت سے انھوں نے نہ صرف بنگلہ اسٹیج کی خدمت کی بلکہ

ہندوستانی سماج اور ملک کے عوام کے دلوں میں انسانیت، مثبت سماج اور مضبوط ملک کی تعمیر کا جذبہ پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کی۔ ٹیگور نے اپنا پہلا ڈراما 1881 میں 'بالمیکی پرتبھا' کے نام سے لکھا اور کھیلا۔ ٹیگور کے پہلے ڈراما کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے پربتھ ناتھ بشی لکھتے ہیں:

''جیون سمرتی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ نوجوان شاعر نے ایک مرتبہ ایک رزمیہ ڈراما 'پرتھوی راج پرجا' کے نام سے شانتی نکیتن کی کھلی اور دل کش فضا میں لکھا۔ یہ ڈراما کھو گیا لیکن ٹیگور کے سوانح نگار شری پربھات کمار مکھ پادھیا کے قیاس کے مطابق بعد کا ڈراما 'رودر چنڈ' پرتھوی راج پرجا ہی کی بنیاد پر دوبارہ لکھا گیا۔''

(تین ناٹک، رابندر ناتھ کے ڈراموں پر ایک سرسری نظر، ص ۸)

چونکہ ڈراما پرتھوی راج پرجا اب تک حاصل نہیں کیا جا سکا ہے اس لیے 'بالمیکی پرتبھا' ہی ان کا پہلا ڈراما ہے۔ اس کے بعد اپنے ساٹھ سالہ ادبی دور میں یکے بعد دیگرے چالیس سے زائد ڈرامے لکھے۔ ان ڈراموں میں رقص پر مبنی ڈرامے، اوپیرا گیت پر مبنی ڈرامے، یک بابی ڈرامے، طویل ڈرامے غرض ہر اقسام کے ڈرامے موجود ہیں۔ ان میں المیہ اور طربیہ دونوں طرح کے ڈرامے ملتے ہیں۔

رابندر ناتھ ٹیگور کے ڈراموں پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے تقریباً ہر ڈرامے میں کئی کئی بار تبدیلیاں کی ہیں۔ یہ تبدیلی اکثر ایسے ڈراما نگار کرتے ہیں جن کا تعلق اسٹیج سے ہوتا ہے۔ کیونکہ ڈراما جتنی بار کھیلا جاتا ہے ڈراما نگار اسے اتنی بار نئے سرے سے دیکھتا ہے اور اس میں ضرورت کے مطابق کاٹ چھانٹ کرتا رہتا ہے اور ہم اس سے بخوبی واقف ہیں کہ رابندر ناتھ ٹیگور اسٹیج سے جڑے ہوئے فنکار تھے۔ ان کے ذہن میں پہلے ڈراما کھیلنا آتا تھا پھر لکھنا۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے وقت اور حالات کی مناسبت سے ڈرامے لکھے ہیں۔ جب جس کی ضرورت انھوں نے محسوس کی اسے لکھا اور کھیلا۔ اسی لیے ان کی ڈراما نگاری میں بتدریج ارتقاء بھی نظر آتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ان کے موضوعات میں تنوع بھی دکھتا ہے۔ انھوں نے ایک جانب مذہب کے فرسودہ رسومات یا عقائد کے خلاف ڈرامے لکھے تو دوسری طرف آزادیِ نسواں کی حمایت میں کئی ڈرامے لکھے۔ ایک جانب عوام کے دلوں میں وطن سے محبت کا جذبہ پیدا کیا تو دوسری طرف سرمایہ داروں کے مظالم کے خلاف آواز بلند کرنے کی ترغیب دی۔ ایک طرف انسانیت کے خلاف کام کرنے والے عناصر کی نشاندہی کی تو دوسری جانب سماج میں موجود مثبت عناصر کی شناخت کی۔ غرض ٹیگور نے مختلف سطحوں پر کام کرتے ہوئے اپنے فکر اور فلسفہ کو ان ڈراموں کے ذریعہ پیش کیا۔

ابھی عرض کیا گیا ہے کہ ٹیگور سے پہلے کے ڈراما نگاروں نے مذہب کو موضوع بنا کر ایسے ناٹک لکھے جن سے ایک مذہب کے ماننے والے دوسرے مذہب کی پیروی کرنے والوں سے نفرت کرنے لگے۔ ٹیگور نے ان کی مخالفت کی اور اپنی شاعری، افسانے اور ناول کے ساتھ ساتھ ڈراموں کے ذریعہ مذہب کے مثبت اور مشترکہ قدروں کو اجاگر کیا۔ انھوں نے قدامت پرستی کے اس مضبوط قلعہ پر کاری ضرب لگائی جس کا مقصد نفرت پھیلانا

تھا۔ان کی یہ کوشش کارآمد ثابت ہوئی جس سے تمام مذاہب کے ماننے والوں کو تازہ ہوا کا احساس ہوا اور نئی روشنی کی کرن دکھائی دی۔ ٹیگور نے ہر اس مذہب کی مخالفت کی جو سماج اور ملک کی ترقی میں رکاوٹ پیدا کرے۔دوسری سطح پر رامائن اور مہا بھارت کے کرداروں کو اپنے ڈرامے میں ایسے پیش کیا جس سے مذہب کو سمجھنے میں آسانی ہو۔ڈراما 'اچلائتن' کے ذریعہ اپنے اس فلسفہ اور فکر کی عکاسی کرتے ہوئے اس مذہب کی اینٹ سے اینٹ بجادینے کی تلقین کرتے ہیں جو سماج اور انسانیت کی ترقی میں رکاوٹ بنے۔ان خیالات کی کامیاب عکاسی انھوں نے اپنے کئی ڈراموں میں کی ہے۔رکت کربی کا یہ حصہ دیکھیں:

گو سائیں: کسے آواز دے رہی ہو؟

نند نی: تمھارے اس اجگر کو جو آڑ میں چھپا انسانوں کو نگلا کرتا ہے۔

گو سائیں : ہری! ہری! بھگوان چھوٹے آدمیوں کو جب مٹانا چاہتا ہے تو ان کے چھوٹے منھ سے بڑی باتیں نکلواتا ہے۔دیکھو نندنی! یقین کرو میں تمھاری بھلائی چاہتا ہوں۔

نندنی: لیکن اس سے میرا بھلا نہ ہوگا۔

گو سائیں: آؤ میرے ٹھاکر دوارے میں۔تمھیں ہری نام سناؤں۔

نندنی: صرف نام کو لے کر کیا کروں گی۔

گو سائیں: من میں شانتی پاؤ گی؟

نندنی: مجھ پر پھٹکار ہو۔اگر اس سے میں شانتی پاؤں۔میں تو اس دروازے پر بیٹھی انتظار کرتی رہوں گی۔

گو سائیں: دیوتا کے مقابلے میں انسان پر تم کو زیادہ بھروسہ ہے؟

نندنی :تمہارا وہ جھنڈے والا دیوتا تو کبھی بھی نہ پسیجے گا۔لیکن جالی کی اوٹ میں جو انسان بیٹھا ہے کیا وہ ہمیشہ جالی ہی میں پھنسا رہے گا؟ جاؤ! جاؤ! جاؤ! انسان کی کھال اتارنے کے بعد اسے نام جپ سے بھلانا ہی تمھارا کام ہے۔

[مدل کیز (رکت کربی) ص۔218]

ٹیگور نے مذہب اور عام انسان دونوں پر یکساں توجہ دی ہے۔ان کے خیالات سے مذہب کی فرسودہ روایات کی نفی کرنے کے ساتھ ساتھ عوام کے جذبات کا خیال رکھنا اشد ضروری ہے۔ٹیگور کے ڈراما 'راجا' کا مکالمہ دیکھیں کہ انھوں نے کس طرح ملک اور عوام کی صورتِ حال پر روشنی ڈالی ہے:

پہلا آدمی : ذرا اس بے وقوف کی باتیں تو سنو، کہتا ہے کہ ہر راستہ وہیں پہنچا دے گا۔بھلا پھر اتنے راستوں کا کیا مطلب ہے؟

دوسرا آدمی: بھیّا! اس میں اس قدر بگڑنے کی کیا بات ہے؟ ہر دیس کی اپنی الگ ریت ورسم ہوتی ہے۔اور ذرا اپنے دیس کا حال تو دیکھو وہاں تو سڑکیں سمجھو ہوتی ہی نہیں ہیں۔ہوتی کیا ہیں؟ تنگ و پر پیچ گلیاں....... پگڈنڈیوں اور لیکوں کی بھول بھلیاں، ہمارے راجا تو سمجھتے ہیں کشادہ راستوں کی کوئی ضرورت ہی نہیں۔ان کے

خیال میں تو گلیاں ہی لوگوں کو اس کا موقع دیتی ہیں کہ ملک سے بھاگ نکلیں۔ یہاں کا ڈھنگ اور ہے۔کوئی کسی کا راستہ نہیں روکتا۔کسی کو بھی بُرا نہیں لگتا۔کوئی کہیں بھی چلا جائے پھر بھی یہ کسی کے من میں نہیں آتا کہ اس راج کو چھوڑ بھاگے۔ ہمارے دیس میں اگر ایسے راستے ہوتے تو وہاں آدمی کا نام نہ ہوتا۔[راجا،(تین ناٹک)ص61 - 60]

تمام راستوں کا ایک ہی منزل کی جانب جانا، سڑک کا چوڑا ہونا، سڑک کا نہ ہونا، پگڈنڈیوں اور لیکوں کی بھول بھلیاں، گویا ایک خدا کی جانب بڑھنے کے لیے ذہن کی کشادگی اور چھوٹی چھوٹی ضرورتوں اور مفاد کو چھوڑ کر منزل کی جانب بڑھنے کا اشارہ ہے۔

ہندستان میں باضابطہ ترقی پسند تحریک کی ابتدا 1936 میں ہوتی ہے۔اس کے اشارے اور عناصر مختلف ادب میں پہلے سے ضرور نظر آتے ہیں۔ان میں رابندر ناتھ ٹیگور کی دوسری تحریروں کے ساتھ ساتھ ڈرامے بھی ہیں۔ ٹیگور نے مختلف ڈرامے کے ذریعہ مختلف طریقے سے ترقی پسندی کی حمایت،عوام پر ڈھائے جانے والے مظالم کے خلاف، سماج کی اصلاح اور ظالم کو برباد کر دینے کی تلقین بار بار کرتے ہیں۔آدمی کی اہمیت کم ہونے کا ٹیگور کو شدت سے احساس تھا۔اس لیے ان کے اندر زبردستی تبدیلی لانے اور انسان کو انسان نہ سمجھ کر انھیں نمبر میں تبدیل کرنے والے سرمایہ داروں کے خلاف وہ اپنے شہرہ آفاق ڈراما ’رکت کوربی‘ میں ان الفاظ میں آواز اٹھاتے ہیں:

وشو :ہمارے پترے میں دن کا خانہ خالی ہے۔ایک دن کے بعد دوسرے دن، دوسرے دن کے بعد تیسرے دن، سرنگ کھودتے ہی جا رہے ہیں۔ایک ہاتھ کے بعد دو ہاتھ، کھان کی کھان سونا کھود چکے ہیں۔ایک کھان کے بعد دوسری کھان، دوسری کھان کے بعد تیسری کھان۔اس یکش پوری میں کشتیاں قطار باندھے چلی آتی ہیں۔ان کا سلسلہ ختم نہیں ہوتا۔اس لیے ان کے یہاں آدمی نہیں ہوتا۔نمبر ہوتے ہیں۔پھگو تم کیا ہو؟

پھگو لال: 47ف

وشو: میں ہوں 69 گ۔گاؤں میں آدمی تھا۔یہاں آکر پنجا، چھکا ہو گیا۔چھاتی پر جوئے کا کھیل ہو رہا ہے۔
(لال کیز، رکت کر جی۔ص۔179)

دوسرا مکالمہ دیکھیں:

چندرا: ایک بار گھر جانے کی چھٹّی دو۔

سردار: کیا؟ رہنے کے لیے جو کوٹھری دی ہے وہ تو بہت اچھّی ہے۔گھر سے کہیں زیادہ اچھّی۔سرکاری خرچ، چوکیدار تک کا انتظام کر دیا ہے۔کیوں جی 69 گ! تمھیں ان لوگوں کے ساتھ دیکھ کر ایسا لگتا ہے جیسے کوئی سارس بگلوں کی جھنڈ کو ناچنا سکھانے آیا ہو!

(لال کیز، رکت کر جی،ص۔81 - 180)

اسی طرح ڈراما ’رتھیر رشی‘ میں سماج کو رتھ سے تعبیر کیا ہے اور اس کی رسّی محنت کشوں کے ہاتھ میں پکڑا

دی ہے۔اب وہ اس کو کھینچ کر سماج کو آگے لے جائیں گے۔

امل : اور گاؤں کی عورتیں سرخ ساریاں باندھے ہوئے ندی سے پانی بھرتی ہیں۔اور گھڑے اپنے سر پر رکھ کر لے جاتی ہیں۔

گــوالا :ٹھیک ہے، بہت اچھے۔ہاں ہمارے گاؤں کی عورتیں ندی سے پانی تو لے جاتی ہیں،مگر ان میں سے ہر ایک کے پاس لال ساری باندھنے کو نہیں ہوتی...

(ڈاک گھر،ص۔26)

امــل : اس نے کہا تھا کہ وہ میری ننھی منّی پیاری سی دلہن بنے گی۔اس کے کانوں میں موتیوں کے بندے ہوں گےاور وہ بڑی خوب صورت لال ساری پہنے ہوگی... (ڈاک گھر،ص۔40)

ٹیگور نے ان خیالات کا اظہار کرتے ہوئے ترقی پسند نظریات کو پیش کیا ہے۔ان خیالات نے ترقی پسند تحریک کے اصول مرتب کرنے میں بھی معاونت کی۔ساتھ ہی ساتھ حقوقِ نسواں اور عورتوں اور لڑکیوں کو کھلی فضا میں سانس لینے کی جانب قدم بڑھانے کی تلقین کی ہے۔ٹیگور نے اس جانب عملی اقدام بھی اٹھائے۔یہی وجہ ہے کہ نہ صرف ان کے کئی ڈراموں میں نسوانی کردار کو مرکزی حیثیت حاصل ہے بلکہ دوسرے کردار بھی اس میں معاونت کرتے نظر آتے ہیں۔

ٹیگور نے تاریخی واقعات کو موضوع بنا کر جو ڈرامے لکھے ہیں ان کے ذریعہ یہ احساس دلایا ہے کہ تاریخ میں جو غلطی ہوئی ہے اسے یاد رکھنے کی ضرورت ہے تاکہ موجودہ اور آنے والے دور میں ایسی غلطی نہ ہو۔انھوں نے ’راجا‘ میں ایک اہم تاریخی واقعہ کی جانب جس فنکاری سے اشارہ کیا ہے یہ انھیں کا حصّہ ہے۔جنگِ پلاسی کے بعد کے حالات کو ذہن میں رکھ کر ڈرامے کا حصّہ دیکھیں:

راجا : بس بس!رحم کیجیے،مجھے معلوم ہو گیا کہ مجھے آپ سب کی اطاعت کرنی ہے۔میرا سر تو تعظیم میں خود بخود جھک رہا ہے۔اب اسے زمین تک جھکانے کے لیے اور کسی تدبیر کی ضرورت نہیں ہے۔میں آپ سب کی کورنش بجا لاتا ہوں۔اگر آپ براہِ کرم مجھے نکل بھاگنے کی اجازت دے دیں تو میں ایک پل بھی آپ کے سامنے نہیں ٹھہروں گا۔

کـانـچی: تم بھاگ کیوں جاؤ؟ٹھہرو،ہم تمھیں یہاں کا راجا بنائیں گے۔اب مذاق شروع ہوا ہے تو اسے پورا ہی کر دیں۔تمھارے ہمراہ کچھ لوگ ہیں؟

راجــــا : جی ہاں!بازاروں میں جو بھی مجھے دیکھتا ہے میرے ساتھ ہو جاتا ہے۔شروع شروع میں جب میرے ساتھ بہت ہی تھوڑے سے نوکر چاکر تھے تو ہر شخص مجھے شبہ سے دیکھتا تھا۔لیکن ہجوم کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ ان کے شبہات بھی ختم ہوتے جاتے ہیں۔اور اب اپنی ہی تعداد سے یہ اور زیادہ مرعوب ہوتے جاتے ہیں۔اب مجھے کچھ نہیں کرنا پڑتا۔

کـانـچی: بہت خوب!بہت خوب!اس گھڑی ہم وعدہ کرتے ہیں کہ ہم ہر طرح سے تمھاری مدد کریں گے۔اور

ہمیشہ تمھارے ساتھ رہیں گے۔لیکن اس کے صلے میں تم کو خدمت کرنی ہوگی۔

راجـــــا: میں آپ کے احکامات اور اس تاج کو جو آپ میرے سر پر رکھ رہے ہیں یکساں طور پر اپنے لیے ایک پابندی سمجھوں گا اور یہ میرے لیے مقدس رہیں گے۔

کانچی: فی الحال ہمیں سدرشن مہارانی کے درشن کے علاوہ اور کچھ نہیں چاہئے۔بس تمھیں اس کا انتظام کرنا ہے۔

راجا: میں اس کے لیے کوئی کسر نہ اٹھا رکھوں گا۔

کانچی: ہمیں تمھاری کوششوں پر بھروسہ نہیں کرنا ہے بلکہ تمھیں بالکل ہماری ہدایات پر عمل کرنا پڑے گا۔اچھّا اب جاؤ اور شاہی شامیانے میں جو جشن منایا جا رہا ہے اس میں ہر ممکن شان وشوکت سے شریک ہو۔

(راجا،ص۔ 82 - 81)

اسی سلسلے کا دوسرا مکالمہ دیکھیں:

کانچی: تمھیں حرف بہ حرف میری ہی باتوں پر عمل کرنا ہے۔کسی بھی قسم کی کوئی غلطی نہ ہونے پائے۔

راجا: کوئی بھی غلطی نہ ہوگی۔

کانچی: مہارانی سدرشن کا محل _______

راجا: عالی جاہ! میں نے وہ جگہ اچھّی طرح سے دیکھ لی۔

کانچی: تمھیں تو بس باغ میں آگ لگانی ہے اور پھر ہڑ بونگ اور گھبراہٹ کا فائدہ اٹھا کر تم بے روک ٹوک اپنا مقصد پورا کر لینا۔

راجا: مجھے یہ سب یاد رہے گا۔

کانچی: بہروپئے صاحب! میرا خیال ہے کہ ہم خواہ مخواہ خوف زدہ ہو رہے ہیں۔اس ملک میں واقعی کوئی راجا نہیں ہے۔

(راجا،ص۔100)

ٹیگور نے اپنے ڈراموں کے ذریعہ جہاں فکری اور فنّی سطح پر عوام میں بیداری لانے کی کوشش کی اسی طرح عوام کی پس ماندگی، زبوں حالی اور معاشی تنگی کو بھی دور کرنے کی کوشش کی۔1916 میں جب ضلع بانکوڑہ میں عوام بھوکوں مر رہے تھے،اس زمانے میں ٹیگور نے ناٹک 'فالگونی' کو اسٹیج کیا۔اس پیشکش سے جو آمدنی ہوئی اسے ان قحط زدہ لوگوں کی مدد کے لیے وقف کر کے یہ مثال قائم کی کہ ناٹک فن کے فروغ کے ساتھ ساتھ عوام کی معاشی تنگی کو بھی دور کر سکتا ہے۔نہ صرف عوام میں بیداری لانے بلکہ بڑے سے بڑے مقاصد کو پورا کرنے کے لیے ناٹک کی دو صورتوں میں مدد لی جا سکتی ہے۔اوّل فکری اور ذہنی سطح پر، دوئم مالی سطح پر اور اس میں حقیقت کا رنگ بھر کے ٹیگور نے بخوبی ثابت کر دکھایا۔شانتی نکیتن اور وشوا بھارتی کی ترقی میں مالی امداد کی غرض سے انھوں نے نہ صرف ہندستان کے مختلف شہروں میں اپنے ناٹک کھیلے بلکہ دیگر ممالک میں بھی ڈرامے اسٹیج کئے اور ان سے حاصل

شدہ لاکھوں روپے ان اداروں کے خزانے میں جمع کیا۔

ٹیگور کے ڈرامے کے مطالعے سے ایک اور خاص نکتہ جو سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ وہ ڈرامے میں بھی افسانوی فن کو پیش کر دیتے ہیں۔ یعنی بیک وقت ڈرامے کے ساتھ ساتھ افسانے کا لطف بھی فراہم کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر رکت کوربی کا ایک ٹکڑا دیکھیں:

وشو: تمھیں وہ کیسا لگا؟

نندنی: اچھا لگا۔ کیا بتاؤں؟ وہ جیسے ہزاروں برس کا پرانا برگد کا پیڑ ہو اور میں جیسے ننھی سی چڑیا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کی ڈال کی کسی ٹہنی پر کچھ دیر اگر جھول لوں تو اس کا دل خوش ہو جائے۔ اس یکہ و تنہا انسان کی روح کو اتنی سی خوشی دینے کی خواہش ہوتی تھی۔

وشو: پھر اس نے کیا کیا؟

نندنی: ایک بار جھوم کر اٹھ کھڑا ہوا اور اپنی بھالے کی نوک جیسی نظریں میرے چہرے پر گرا کر کہا: ''میں تمھیں جاننا چاہتا ہوں''۔ یہ سن کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ سارا بدن کانپ اٹھا۔ میں نے جواب دیا: ''جاننے کی کیا بات ہے؟ میں کچھ تمھاری پوتھی تو ہوں نہیں۔'' اس نے کہا: ''یہ پوتھی میں جو کچھ ہے وہ میں جانتا ہوں۔ لیکن تمھیں نہیں جانتا۔'' اور پھر جوش میں آ کر بولا: ''رنجن کی بابت مجھے بتاؤ، اسے تم کس طرح پیار کرتی ہو؟'' میں نے جواب دیا: ''اس پتوار کی طرح جو پانی کے اندر رہتی ہے لیکن آسمان سے باتیں کرنے والے بادبان سے پیار کرتی ہے۔ بادبان میں ہوا کے گیت ہوتے ہیں اور پتوار میں موجوں کا رقص۔'' ایک بے انتہا لالچی بچّے کی طرح میری طرف تکتے ہوئے وہ چپ چاپ سنتا رہا۔ ایک بارگی چونک کر اس نے پوچھا: ''اس کے لیے جان دے سکتی ہے؟'' میں نے جواب میں پوچھا۔ ''ابھی۔'' ''کبھی نہیں''۔ وہ گرج کر چلا اٹھا، جیسے غصّے میں بھرا ہو۔ ''ہاں دے سکتی ہوں'' میں نے کہا۔ ''اس سے تمھیں کیا فائدہ ہوگا؟'' اس نے پھر سوال کیا۔ سب ہی باتوں کا وہ صاف صاف مطلب سمجھنا چاہتا تھا اور جب کوئی بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی تو وہ بے چین ہو جاتا ہے۔ پھر جاتا ہے۔

(لال کیز، رکت کوربی، ص۔ 89 - 188)

ٹیگور کے ڈراموں پر نظر ڈالنے سے ایک اہم نکتہ جو منظرِ عام پر آتا ہے وہ یہ کہ ان کے ڈراموں میں ویلن سامنے نہیں آتا۔ یعنی ظالم ہماری نظروں کے سامنے نہیں ہوتا، اس کا ظلم ہوتا ہے یا پھر صرف اس کی آواز۔ بعض ڈراموں کا ہیرو بھی پس پردہ رہتا ہے۔ اس کا مثبت پہلو یہ سمجھ میں آتا ہے کہ ٹیگور کسی خاص ظالم کو سامنے لانے کے بجائے ہر ظلم کرنے والوں کے بارے میں بتانا چاہتا ہے۔ مختلف ماحول اور حالات میں ظالم کی شکل مختلف ہو سکتی ہے لیکن ظلم تو بس ظلم ہے .... ہے تو مٹ جاتا ہے۔ دوسری صورت میں ہیرو کا منظرِ عام پر نہ لانے کا جواز بھی یہی ہے کہ عوام اس کی خصلت، اس کے رویے سے اپنے ہیرو کی شناخت کرے نہ کہ کسی خاص شخص یا سیاسی ذہن رکھنے والے کو۔ یہ دونوں صورتیں کسی ایک ڈرامے میں ایک ساتھ نہیں ہوتی۔

رابندر ناتھ ٹیگور کے کئی ڈرامے اردو میں ترجمہ ہوکر مقبول ہو چکے ہیں ان میں سے چند کامیابی کے ساتھ اسٹیج پر کھیلے بھی جا چکے ہیں۔ان کے ڈرامے کا دوسری ہندستانی زبانوں میں بھی نہ صرف ترجمہ ہو چکا ہے بلکہ اس سے کہیں زیادہ تعداد میں کھیلے جا چکے ہیں۔ان کے ڈراموں کو نئے ڈائرکٹر کھیل کر اپنی شناخت بناتے ہیں تو ہندستانی اسٹیج کے کہنہ مشق اور بڑے ہدایت کار مختلف انداز میں اسے کھیل کر مختلف طرح سے ان ڈراموں کا Interpetation کرتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ٹیگور کے ڈراموں کی نہ صرف اہمیت میں اضافہ ہورہا ہے بلکہ اس کی معنویت بھی بڑھتی جارہی ہے اور جب تک اسے کھیلا جاتا رہے گا اس کی پرتیں کھلتی جائیں گی۔

آخر میں یہ عرض کرتا چلوں کہ ٹیگور نے باضابطہ ڈرامے تو لکھے ہی ہیں ساتھ ہی ساتھ انھوں نے اپنی کہانیوں اور ناولوں کو بھی ڈرامے کی شکل میں ڈھالا ہے۔میرے خیال سے ان کے ذہن میں فارم کے بجائے موضوع یا بات اہمیت رکھتی تھی اس لیے کام کی باتیں مختلف فارم میں کرتے تھے۔اس کی پیروی آج بھی ہورہی ہے۔ہمیں معلوم ہے کہ ان کے ناول اور افسانے کو نہ صرف ڈرامے کی شکل میں مختلف زبانوں میں ڈھالا اور پیش کیا گیا ہے بلکہ کئی فلمیں بھی بن چکی ہیں اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ان کے ڈراموں کو ہندستان کی مختلف زبانوں میں ڈھالا گیا ہے اور ان پر تحقیقی کام بھی ہوئے ہیں۔آج ہم جس پُر آشوب دور سے گزر رہے ہیں ایسے میں ٹیگور کی تخلیقات کی اہمیت مزید روشن ہوتی نظر آتی ہیں۔اس لیے ہمیں ان تخلیقات کی نشاندہی کر کے اسے از سرِ نو منظرِ عام پر لانا چاہئے جس سے انسانیت، سماج اور ملک کی مثبت قدریں روشن ہوں اور منفی فکر وفلسفہ اور اس کو ماننے والوں کا خاتمہ ہو۔ان کی ایک نظم کے اس بند پر اپنی بات ختم کرتا ہوں۔

ہائے! کتھائی جابے
اننت اجانا دیش،نتانتو جے ایکا تو می
پتھ کتھائی پابے
ہائے! کتھائی جابے
جورا ساتھے رہی بے نا
جورا کتھا کہی بے نا
جودی تو رڈاک شنے کیونہ آشے تو بے ایکلا چلورے (نظم 'کتھائی')

☆☆☆

گوشۂ قابل اجمیری

قابل کے کلام سے ان کی انفرادیت نمایاں ہے اور یہی بنیادی خصوصیت شاعر کے لئے اہم اور اہم تر ہے۔ میں نے پہلی بار جب ان کا کلام خود انہیں کی زبانی سنا تو حقیقتاً بہت متاثر ہوا۔ خیالات اور جذبات کے ساتھ ساتھ اسلوب بیان بھی شگفتہ و پاکیزہ اور تغزل کا حامل ہے۔

_____جگر مراد آباد

اردو ادب کا ایسا کون سا سنجیدہ طالب علم ہوگا جو قابلؔ سے واقفیت نہ رکھتا ہو۔ راجستھان کے شعر و ادب سے بالعموم اور اجمیر کے ادب سے بالخصوص میرا پہلا تعارف ہی قابلؔ اجمیری کے توسط سے ہوا تھا۔

_____شمس الرحمٰن فاروقی

ڈاکٹر عبادت بریلوی

مہذب اور باشعور ذہن کا شاعر: قابلؔ اجمیری

جناب قابلؔ اجمیری اردو کے جانے پہچانے شاعر ہیں۔ نوجوان غزل گو شاعروں میں وہ خاصے مشہور ہیں جدید اردو شاعری سے دلچسپی رکھنے والے جو لوگ مشاعرے سنتے اور نمایاں رسائل پڑھتے ہیں ان کے لئے قابلؔ صاحب کا نام اجنبی اور نامانوس نہیں ہے۔ انھوں نے بہت تھوڑے عرصہ میں نمایاں شہرت حاصل کی ہے اور ان کی یہ شہرت اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ ان کی شاعری میں پڑھنے اور سننے والوں کے لیے دلچسپی کا خاصا سامان موجود ہے۔ اسی لیے وہ ایک حلقے میں بہت مقبول ہیں۔ مقبولیت حاصل ہونا آسان نہیں ہوتا۔ اس کے لیے تو جوہر قابل ہونا ضروری ہے۔ قابلؔ صاحب بھی صحیح معنوں میں ایک جوہر قابل ہیں۔ اُن کا کلام پکار پکار کر ان کے بارے میں یہی کہتا ہوا معلوم ہوتا ہے اور یہی سبب ہے کہ شعر و شاعری سے دلچسپی رکھنے والے انھیں اتنا پسند کرتے ہیں۔

یوں تو قابلؔ صاحب نے غزلیں بھی کہی ہیں اور نظمیں بھی لیکن بنیادی طور پر وہ غزل کے شاعر ہیں۔ ان کے مزاج کو غزل کے ساتھ خاص مناسبت ہے اور اس میں شک نہیں کہ اُن کے جوہر غزل ہی میں کھلتے ہیں۔ اس صنف میں انھوں نے اپنا ایک مخصوص انداز پیدا کیا ہے۔ وہ غزل کی روایت سے پوری واقفیت رکھتے ہیں اور اس روایت سے انھوں نے خاطر خواہ استفادہ کیا ہے۔ اس روایت کا رچاؤ جگہ جگہ ان کے کلام میں ملتا ہے۔ لیکن اس روایت کے علاوہ بھی ان کے یہاں بہت کچھ ہے۔ وہ لکیر کے فقیر نہیں ہیں ان کے یہاں تقلید کا شائبہ بھی نہیں ہوتا۔ وہ نئی باتیں کہتے ہیں اور نئے انداز میں کہتے ہیں، وہ نئے رجحانات سے آشنا ہیں، انھیں ان رجحانات کی اہمیت کا احساس ہے، وہ غزل کی صنف کو وسیع کرنے کے قائل نظر آتے ہیں اسی لیے ان کے کلام میں وسعت اور پھیلاؤ کا احساس ہوتا ہے، جدّت اور اُپج نظر آتی ہے۔ بدلتی ہوئی زندگی کے بارے میں ان کا نقطۂ نظر رجائی ہے۔ اسی لیے ان کے یہاں خاصی جولانی کا پتہ چلتا ہے۔ وہ زندگی کو بسر کرنے اور برتنے کے قائل معلوم ہوتے ہیں۔ اسی لیے ان کے کلام میں عمل اور افادیت کے تصورات جگہ جگہ اُبھرتے ہیں لیکن اُن کی شاعری میں ہنگامہ پسندی نہیں ہے۔ برخلاف اس کے خاصی مہذب اور ستھری فضا کا احساس ہوتا ہے ان کا زاویہ نظر مفکرانہ نہیں ہے لیکن ایک عام انسان جس طرح زندگی اور اس کے معاملات و مسائل کو دیکھتا اور سمجھتا ہے۔ قابلؔ صاحب بھی اسی طرح دیکھتے اور سمجھتے ہیں اسی لیے ان کی شاعری میں تنوّع نظر آتا ہے اور پھر سب سے بڑی

بات یہ ہے کہ ان سب کا اظہار قابلؔ صاحب شاعرانہ انداز میں کر سکتے ہیں۔ قابلؔ صاحب کی غزلوں میں عشق کا بڑا مہذب تصور ملتا ہے۔ یوں وہ حُسن و عشق کی باتیں ذرا کھل کر کم ہی کرتے ہیں۔ ان کے یہاں وہ عام موضوعات نہ ہونے کے برابر ہیں جن کو عام طور پر ولی سے لے کر اس وقت تک غزل کا موضوع بنایا جاتا رہا ہے بلکہ بادی النظر میں دیکھنے سے تو یہ شبہ ہوتا ہے کہ حسن و عشق کی عام فضا سے ان کی غزلیں خالی ہیں لیکن ایسا نہیں ہے۔ ان کے یہاں حسن و عشق کے مختلف پہلو ملتے ہیں لیکن ان میں عمومیت کا پتہ نہیں چلتا۔ ان میں سطحیت نظر نہیں آتی۔ جن کیفیات و واردات کو انھوں نے اس سلسلہ میں پیش کیا ہے وہ ذہنی طور پر ایک مہذب اور باشعور انسان کی واردات و کیفیات ہیں۔ شاید یہی سبب ہے کہ ان موضوعات میں جدت کا پہلو سب سے زیادہ نمایاں نظر آتا ہے اور وہ انھیں افراد کو زیادہ متاثر کر سکتی ہیں جو نئی زندگی کے تقاضوں کو سمجھتے ہیں، جن کو اس بات کا یقین ہے کہ نئے حالات میں احساسات کے زاویوں کو بھی بدلنا پڑتا ہے۔ قابلؔ صاحب کی غزلوں میں جہاں تک حسن و عشق کا تعلق ہے کچھ اس قسم کے اشعار زیادہ ہیں۔

ہم نے دیئے ہیں عشق کے تیور نئے نئے
اُن سے بھی ہوگئے ہیں گریزاں کبھی کبھی

راحتوں سے گریز ، غم سے فرار
بعض لمحے عجیب ہوتے ہیں

تم جنھیں عمر بھر نہیں ملتے
وہ بڑے خوش نصیب ہوتے ہیں

خوشبوئے انتظار سے مہکی ہوئی ہے رات
قابلؔ نہ جانے کس کو بلاتی ہے چاندنی

کچھ حُسن آ چلا تھا شب انتظار میں
کاش اور تھوڑی دیر نہ ہوتی سحر ابھی

یہی ہے دل کی ہلاکت یہی ہے عشق کی موت
نگاہِ دوست پہ اظہار بیکسی ہو جائے

مقامِ عاشقی دنیا نے سمجھا ہی نہیں ورنہ
جہاں تک تیرا غم ہوتا وہیں تک زندگی ہوتی

دل کی دھڑکن کا اعتبار نہیں
ورنہ آواز تو تمھاری ہے

ان کے حسن ستم کا کیا کہنا
لوگ سمجھے خطا ہماری ہے

وہ خیالوں میں کہیں شعلہ کہیں شبنم جیسے
ایک اندازِ کرم مختلف عالم رہے

ہمیں شہر نگاراں میں لے چلو یارو
کسی کے عشق کا آزار ہم بھی رکھتے ہیں

یہ چاک چاک گریباں یہ داغ داغ جگر
متاعِ حسرتِ دیدار ہم بھی رکھتے ہیں

رکا رکا سا تبسّم جُھکی جُھکی سی نظر
تمہیں سلیقۂ بیگانگی کہاں ہے ابھی

کوئی وعدہ نہیں امید نہیں
پھر مجھے انتظار سا کیوں ہے

بیکسی سے بڑی امیدیں ہیں
تم کوئی آسرا نہ دے جانا

یہ ظالم زمانہ دکھائے گا کیا کیا
تری آنکھ بھی آج نم دیکھتے ہیں

بے نیازی کو اپنی خو نہ بنا
یہ ادا بھی کسی کو پیاری ہے

اپنے لب ہی نہیں سئے ہم نے
آپ کی زلف بھی سنوای ہے

ان کی پلکوں پر ستارے اپنے ہونٹوں پر ہنسی
قصہ غم کہتے کہتے ہم کہاں تک آ گئے

رضائے دوست قابلؔ میرا معیار محبت ہے
انھیں میں بھول سکتا تھا اگر ان کی خوشی ہوتی

رفتہ رفتہ رنگ لایا جذبۂ خاموشِ عشق
وہ تغافل کرتے کرتے امتحاں تک آ گئے

تم کو بھی شاید ہماری جستجو کرنی پڑے　　ہم تمھاری جستجو میں اب یہاں تک آ گئے
دلِ دیوانہ عرضِ حال پر مائل تو کیا ہوگا　　مگر وہ پوچھ بیٹھے خود ہی حالِ دل تو کیا ہوگا

یہ اشعار جیسا کہ ان کے موضوعات سے ظاہر ہے خاصے مہذب اور باشعور ذہن کی پیداوار ہیں ان میں سے کوئی ایک شعر بھی ایسا نہیں جو جذبات و احساسات کے نئے زاویوں کو پیش نہ کرتا ہو۔ ان میں خارجی حسن کا بیان نہیں، ان میں معاملہ بندی بھی نہیں، یہ لذت اور تعیش سے بھی کوئی سروکار نہیں رکھتے۔ یہ تو سب کے سب نیازِ عشق کی مختلف منزلوں کے ترجمان ہیں لیکن اس کے باوجود ان میں انفعالی آہنگ نہیں۔ حزن و یاس، قنوطیت اور بیزاری کا ان میں پتہ نہیں چلتا۔ ان میں تو عشق کرنے والے کی اہمیت کا احساس چھایا ہوا ہے۔ اس کی جو ذہنی اور جذباتی کیفیت مخصوص حالات میں ہو سکتی ہے اس کی ترجمانی زیادہ نظر آتی ہے۔ اسی لیے توازن کے نئے ہونے کا احساس ہوتا ہے۔ کبھی کبھی کسی خاص ذہنی کیفیت کے زیرِ اثر محبوب سے گریزاں ہو جانا بظاہر تو عجیب بات معلوم ہوتی ہے لیکن جذبۂ صادق کے ہاتھوں کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ اس سے خود عشق کو نئے تیور ملتے ہیں۔ یہ عشق بھی عجیب ہوتا ہے اس میں داخل ہو کر انسان کبھی بہ یک وقت راحتوں سے گریز اختیار کرتا ہے اور غم سے فرار بھی۔ بظاہر یہ بات بھی عجیب ہے لیکن جب عشق کی بنیاد جذبۂ صادق ہو تو اس کیفیت کا پیدا ہونا عجیب نہیں ہوتا۔ اس عشق میں انتظار کا عالم بھی ایک لطف پیدا کرتا ہے۔ حالانکہ یوں عام طور پر انتظار سے تکلیف اور پریشانی کی کیفیت وابستہ ہے لیکن اگر عشق متوازی انداز رکھتا ہو تو پھر انتظار کے لمحے بھی حسین ہو جاتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ اسی طرح کی کیفیات جوان اشعار کا موضوع ہیں اپنے اندر ایک جدّت اور نیا پن ضرور رکھتی ہیں لیکن اس میں اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا۔ یہ نامانوس نہیں معلوم ہوتیں کیونکہ ان کی تخلیق کرنے والے نے ان میں زندگی اور اس کی عام نفسیات کو الگ نہیں کیا ہے بلکہ بڑے متوازن انداز میں ان کی ترجمانی کی ہے۔ قابلؔ صاحب نے ایسے اشعار میں غزل کی روایت کا پورا پورا رچاؤ پیدا کیا ہے۔ اسی لیے وہ جدید ہونے کے باوجود صحیح معنوں میں غزل کے شعر معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے ہاتھوں ہیجان انگیزی کا وجود نہیں ہوتا بلکہ وہ خود مہذب ہیں اور اسی لیے تہذیب کو پیدا کرنے اور مہذب بنانے کی پوری صلاحیت رکھتے ہیں۔ قابلؔ صاحب کے عشقیہ اشعار میں خاصا تنوع ہے لیکن اس تنوع کے ہاتھوں ان کی انفرادیت کو ٹھیس نہیں لگتی اس تنوع میں بھی ان کے مخصوص زاویہ نظر ایک یک رنگی کو پیدا کرتا ہے۔ بہرحال قابلؔ کی عشقیہ شاعری میں بڑی ہی صاف اور ستھری فضا ہے اور اس میں کسی جگہ بھی ابتذا کا پتہ نہیں چلتا وہ اس دور کے انسان کے لئے اجنبی اور نامانوس نہیں کیونکہ وہ حقیقت سے بھرپور ہے اور اس زمانہ کی جذباتی زندگی کی روح اس میں موجود ہے ظاہر ہے ایسی شاعری تمام تر جذباتی نہیں ہو سکتی۔ قابلؔ صاحب کی شاعری میں بھی نری جذباتیت نہیں ہے اس میں حقیقتوں کا احساس بہت نمایاں ہے وہ عشق اور معاملات و کیفیاتِ عشق کو اس سماجی پس منظر میں دیکھتے ہیں جو ان کے آس پاس اور گرد و پیش موجود ہے اسی لیے ان کے یہاں غمِ عشق اور غمِ روزگار کا تذکرہ ساتھ ساتھ ملتا ہے لیکن اس موضوع کو انھوں نے محض رسمی اور روایتی انداز میں پیش نہیں کیا ہے۔ ان کے اس قسم کے اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ وہ خود ان حالات میں ہو کر گزرے ہیں۔ اسی لیے اس موضوع کو پیش کرنے میں ان کے یہاں خاصی جدت نظر آتی ہے۔ کیسے عجیب عجیب شعر انھوں نے اس موضوع پر نکالے ہیں۔

اے گردشِ دوراں آ تجھ کو بھی اماں بخشیں
ہم نے غمِ جاناں کو سینے سے لگایا ہے

یہ ظالم زمانہ دکھائے گا کیا کیا
تری آنکھ بھی آج نم دیکھتے ہیں

ہم بیکسوں کی بزم میں آئے گا اور کون
بیٹھی ہے آ کے گردش دوراں کبھی کبھی

لذتِ گردشِ ایام وہی جانتے ہیں
جو کسی بات پہ اٹھ آئے ہیں میخانے سے

غمِ جہاں کے تقاضے شدید ہیں ورنہ
جنونِ کوچۂ دلدار ہم بھی رکھتے ہیں

ان اشعار کا موضوع صرف گردش دوراں اور غمِ روزگار ہی نہیں ہے بلکہ اس موضوع کا سہارا لے کر ان میں زندگی کی بعض اہم حقیقتوں کے بے نقاب کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ غمِ جاناں کو سینے سے لگا لینے کے بعد گردش دوراں کو اماں بخشنے کا خیال عشق کے مارے ہوئے بے کسوں کی بزم میں گردش دوراں کے آبیٹھنے، کسی بات پر میخانے سے اُٹھ آنے۔ لذتِ گردشِ ایام کو صحیح طور پر محسوس کرنے، اور جنون کو چہ دلدار رکھتے ہوئے بھی غمِ جہاں کے تقاضوں کی شدت کو دیکھتے رہے اور ظالم زمانے کے ہاتھوں کسی کی آنکھ کے نم نظر آنے کا خیال اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ قابلؔ صاحب زندگی اور اس کے حالات کا گہرا شعور رکھتے ہیں اور جذباتی زندگی کو ان حقائق سے علیحدہ کر کے نہیں دیکھتے اسی لیے ان کی شاعری میں ایک نئے ذہن نئے شعور کا احساس سب سے زیادہ ہوتا ہے۔

قابلؔ صاحب کی غزلوں کے موضوعات محدود نہیں ہیں۔ ان کے یہاں تو موضوعات کے تنوع کا احساس قدم قدم پر ہوتا ہے۔ عشق ان کی شاعری کا اہم موضوع ضرور ہے لیکن چونکہ وہ زندگی کے دوسرے پہلوؤں سے الگ نہیں ہے اس لیے عشقیہ موضوعات بھی ان کے یہاں خاصے پہلودار متنوع کیفیت کے حامل نظر آتے ہیں لیکن ان کی غزلوں میں اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔ زندگی کے عام سیاسی اور سماجی حالات کی ترجمانی وہ بڑی خوبی سے کرتے ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ قابلؔ صاحب پر اپنے زمانے کے حالات کا گہرا اثر ہے وہ خود ان حالات میں سے ہو کر گزرے ہیں جن سے اس زمانے کی زندگی دو چار ہے۔ خیر ان موضوعات کو غزلوں میں پیش کرنا ایسی کوئی اہم بات نہیں ہے۔ یہ کام تو ہر شاعر کر سکتا ہے لیکن ان حالات کو شدت کے ساتھ محسوس نہ کیا جائے اور جب تک انھیں مزاج کا جزو نہ بنالیا جائے اس وقت تک ان میں جان پیدا نہیں ہوتی۔ قابلؔ صاحب نے ان موضوعات کو اپنے مزاج میں داخل کر لیا ہے اسی لیے وہ ان کو غزل کی صنف کے ساتھ ہم آہنگ کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں انھوں نے ان موضوعات کو غزل میں کچھ اس طرح سمویا ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے لیے اجنبی اور نا مونوس نہ رہے۔ یہ چند اشعار دیکھئے۔

ٹھنڈے پڑے ہیں انجمن رنگ کے چراغ
اک نغمۂ بہار بہ طرزِ فغاں سہی

ذوقِ سفر جوان ہے قابل بڑھے چلو
منزل بھی آج گردِ رہ کارواں سہی

ہمیں تو رونق دنداں بنا دیا تم نے
چمن میں صبحِ بہاراں کی بات کون کرے

کسی کو رنگ سے مطلب کسی کو خشبو سے
گلوں کے چاک گریباں کی بات کون کرے

نہ گھبرا شبِ ہجر کی تیرگی سے
سحر بھی نمودار ہوگی اسی سے

یوں بھی ہوا ہے جشنِ چراغاں کبھی کبھی
کچھ اور بڑھ گئی ہے اندھیروں کی زندگی

صبح ہوتی ہے مگر صبح سے کیا ہوتا ہے
ایک دل تاب تجلّی کو ترستی ہے نظر

مگر گلشن کے جلنے کا سماں کچھ اور ہوتا ہے
بہار آتی ہے تو اکثر نشیمن جل ہی جاتے ہیں

قابلؔ صاحب کے کلام میں اس قسم کے اشعار کی تعداد خاصی ہے۔ ان میں دیکھنے کی صرف یہی بات نہیں ہے کہ یہ زندگی سے متعلق نئے موضوعات کے حامل ہیں، دیکھنے کی بات تو ان میں یہ ہے کہ یہ شدید تاثر کا نتیجہ ہیں۔ شاعر نے ان کو پیش کرنے کی کاوش نہیں کی بلکہ وہ تو اسکی شخصیت اور مزاج میں داخل ہیں۔ اسی لئے وہ غزل کے حدود سے باہر نہیں نکلتے۔ اس کی بندشوں کو توڑتے نہیں۔ اس کے احتسابات کا خون نہیں کرتے۔ قابلؔ صاحب نے ان موضوعات کو غزل کا مزاج دیا ہے یہی وجہ ہے کہ یہ جدید ہونے کے باوجود غزل کے اشعار معلوم ہوتے ہیں اور یہی اُن کا کمال ہے۔

ایک بات قابلؔ صاحب کے کلام میں اور بھی قابل ذکر ہے۔ وہ یہ کہ زندگی کی محرومیوں کو محسوس کرنے کے باوجود وہ زندگی سے بیزار اور مایوس نہیں ہیں۔ ان کے یہاں زندگی کی کسک کو محسوس کرنے کے باوجود خاصی جولانی کا احساس ہوتا ہے اور یہ جولانی انھیں عمل کی طرف راغب کرتی ہے۔ چنانچہ عمل کی راہ پر آگے بڑھنے کا احساس ان کی شاعری میں بہت نمایاں ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ زندگی کے غم کو محسوس نہیں کرتے اس غم کی تو ان کی شاعری میں ایک لہر سی دوڑی ہوئی نظر آتی ہے۔ لیکن اس غم کا احساس ان کے یہاں انفعالیت کو پیدا نہیں کرتا۔ وہ زندگی سے بیزار نہیں ہوتے۔ ان پر قنوطیت طاری نہیں ہوتی۔ اسی لیے وہ ایسے شعر کہہ سکتے ہیں۔

منزل بھی آج گردِ رہِ کارواں سہی
ذوقِ سفر جوان ہے قابل بڑھے چلو

حادثے پھر بھی ہمارے حوصلوں سے کم رہے
ہر قدم پہ حادثہ ، ہر آرزو بھی حادثہ

یہاں ایک اُمنگ اور ولولے کا احساس پڑھنے والے کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے آگے بڑھنے کی خواہش اور ایک والہانہ انداز میں آگے بڑھنے کی خواہش اس پر چھا جاتی ہے اور یہ خیال اس کے دل میں جاگزیں ہو جاتا ہے کہ زندگی میں اصل چیز حوصلہ اور ولولہ ہے کہ اس کے بغیر انسان کی زندگی موت بن جاتی ہے اور وہ دنیا میں کسی کام کا نہیں رہتا۔ قابلؔ صاحب کے یہاں انسانی زندگی میں محرومیوں اور ناکامیوں کی کسک کا احساس اس کیفیت کے ساتھ شامل ضرور ہے لیکن وہ اس کے باوجود آگے اور کچھ کرتے رہنے کے قائل ہیں کہ یہی ان کے نزدیک زندگی ہے۔

قابلؔ صاحب کہنہ مشق شاعر ہیں وہ غزل کے مزاج کو سمجھتے ہیں اس کو برتنے کے آداب سے خوب واقفیت رکھتے ہیں انھیں غزل کو غزل بنانے کا گُر خوب آتا ہے اسی لیے ان کے یہاں ہر موضوع غزل کا موضوع معلوم ہوتا ہے۔ بات یہ ہے کے قابلؔ صاحب غزل کے اصول سے واقفیت ہی نہیں رکھتے بلکہ وہ اس میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کے ان کے یہاں کوئی بات بھی ہو وہ بڑی آسانی سے غزل کا روپ اختیار کر لیتی ہے۔ حالانکہ اس سلسلے میں انھیں کسی قسم کی کاوش نہیں کرنی پڑتی۔

☆☆☆

ممتاز راشد

خون کی دھار میں ڈوبی ہوئی شاعری

فراق گورکھپوری نے اختر الایمان کی شاعری کو خون کی دھار میں ڈوبی ہوئی شاعری کہا ہے۔ فراق کے جس مضمون میں یہ جملہ شامل تھا اسے میں نے بہت پہلے پڑھا تھا اور اس وقت اس مضمون کو بس سرسری طور پر ہی پڑھا تھا لہٰذا کسی خاص جملے کی اہمیت سمجھنے یا اسے اہمیت دینے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ برسوں کے بعد فراق کے خون کی دھار میں ڈوبی ہوئی شاعری والے جملے کی معنویت مجھ پر آشکار ہوئی۔ ریڈیو نے چند برسوں پہلے ایک ہفت روزہ نشریاتی سلسلہ صدائے رفتگان شروع کیا تھا اس پروگرام میں پاکستان کے مرحوم نامور فنکاروں کی تخلیقات انھیں کی ٹیپ کی ہوئی آواز میں پیش کی جاتی تھیں ایک بار میں صدائے رفتگان سن رہا تھا۔ اچانک اناؤنسر نے اعلان کیا کہ اب آپ کے سامنے جدید شعر و ادب کے ایسے ممتاز منفرد شعراء کا کلام انھیں کی آواز میں پیش کیا جائے گا جو اب ہم میں نہیں رہے ہیں۔ یہ فنکار ہیں مرحوم ناصر کاظمی، یوسف ظفر، باقی صدیقی اور مرحوم قابل اجمیری۔ اوّل الذکر تینوں شعراء کو بہت دلچسپی اور احترام کے ساتھ سنا گیا۔ آخر میں قابل مرحوم کی آواز سنائی دی۔ کلام کے ساتھ قابل کی آواز میں کچھ ایسی جلتی اور سلگتی ہوئی کسک تھی یا پھر ان کے کلام کے ساتھ قابل کی آواز میں ایسی تاثیر تھی کہ اچانک ''خون کی دھار میں ڈوبی ہوئی شاعری'' کے معنی اپنے تمام تر امکانات کے ساتھ ذہن میں روشن ہوتے چلے گئے۔ قابل کی وہ غزل (جسے اناؤنسر نے مرحوم کی آخری غزل کہا تھا) اور ان کی آواز آج بھی جیسے ذہن میں گونج رہی ہے۔

کوئے قاتل میں ہمیں بڑھ کے صدا دیتے ہیں — زندگی آج ترا قرض چکا دیتے ہیں
کوئے محبوب سے چپ چاپ گزرنے والے — عرصہ زیست میں اِک حشر اٹھا دیتے ہیں
تیرے اخلاص کے افسوں تیرے وعدوں کے طلسم — ٹوٹ جاتے ہیں تو کچھ اور مزہ دیتے ہیں
ہم نے اس کے لب و رخسار کو چھو کر دیکھا — حوصلے آگ کو گلزار بنا دیتے ہیں

میں قابل اجمیری کے فکر و فن سے بہت پہلے متعارف ہو چکا تھا۔ ان دنوں میں نویں کلاس کا طالب علم تھا۔ مصرعے موزوں کرنے کے ساتھ ساتھ مشاعروں میں شریک ہونے کا چسکا پڑ چکا تھا۔ ادبی رسائل ذوق و شوق

سے پڑھتا تھا۔ ایک دن پاکستان کے کسی ادبی جریدے میں ایک غزل نظر سے گزری۔ شاعر کا نام تھا قابل اجمیری۔ نام کے ساتھ اجمیری کی نسبت دیکھ کر فوراً غزل پڑھنا شروع کر دی۔

وحشت بڑے دلچسپ دوراہے پہ کھڑی ہے | ہونٹوں پہ ہنسی آنکھ میں تاروں کی لڑی ہے
محسوس ہوا پاؤں میں زنجیر پڑی ہے | چاہا بھی اگر ہم نے تیری بزم سے اُٹھنا
تکمیل تمنّا کے لیے عمر پڑی ہے | دل رسم و رہِ شوق سے مانوس تو ہو لے
قابل غمِ دوراں کی ابھی دھوپ کڑی ہے | کچھ دیر کسی زلف کے سائے میں ٹھہر جائیں

غزل پڑھنے کے بعد قابل کے لیے ایک تجسّس پیدا ہو گیا۔ یہ کون صاحب ہیں؟ کیا کرتے ہیں؟ اتنے اچھے شاعر ہونے کے باوجود اجمیر کے مشاعروں میں نظر کیوں نہیں آتے؟ وقت کے ساتھ یہ تجسّس بڑھتا رہا۔ اتفاق سے انہی دنوں محترم احمد رئیس صاحب علی گڑھ سے آ گئے۔ احمد رئیس صاحب قابل اجمیری کے بارے میں بہت کچھ جانتے تھے، ان کے اور کچھ دوسرے معتبر حضرات کے ذریعہ قابل اجمیری کے بارے میں بہت سی باتوں کا علم ہوا۔ قابل اجمیری حیدرآباد (سندھ پاکستان) میں قیام پذیر تھے اور تپِ دق کے موذی مرض کا شکار تھے۔

قابل اجمیری کا اصلی نام عبدالرحیم تھا۔ سات سال کی عمر میں والدین کے سائے سے محروم ہو گئے تھے۔ قابل کے دادا امیر بخش صاحب نے ان کی پرورش کی۔ قابل کے آباو اجداد پٹھانوں کے دورِ حکومت میں اجمیر آ کر آباد ہوئے تھے۔ اعلیٰ فوجی خدمات کے عوض حکومت وقت نے انھیں بڑی بڑی جاگیریں عطا کیں لیکن امتدادِ زمانہ کی وجہ سے قابل کے والدین کے حصّے میں صرف دو مکان آئے تھے (پاکستان میں قابل کو ان میں سے کسی مکان کا معاوضہ نہیں ملا) قابل نے ابتدائی تعلیم مدرسہ نظامیہ درگاہ حضرت خواجہ معین الدین چشتی میں حاصل کی۔ اس زمانے میں مدرسے کے اساتذہ ملک کے بلند پایہ اصحاب علم و فضل تھے۔ جنھیں نظام دکن ہندوستان کے طول وعرض سے منتخب کرتے تھے۔ قابل کا بچپن اسی علمی و ادبی اور روحانی ماحول میں گذرا۔

چودہ پندرہ سال کی عمر سے قابل شعر موزوں کرنے لگے تھے، پہلے انھوں نے حضرت ارمان اجمیری سے مشورۂ سخن کیا۔ بعد میں قابل مولانا عبدالباری معنی سے رجوع ہوئے۔ مولانا معنی ایک جید عالم دین تفسیر وحدیث اور تاریخ کے بلند پایہ محقق تھے۔ مولانا معنی کے فیضانِ صحبت نے قابل کی تخلیقی صلاحیتوں کو مزید جلا بخشی مولانا معنی کی معیّت میں قابل نے پہلی بار اجمیر میں منعقد ہونے والے ایک آل انڈیا مشاعرے میں شرکت کی۔ اس وقت کے بعض مشاہیر شعراء شریک مشاعرہ تھے جن میں ساغر نظامی، حفیظ جالندھری، سیماب اکبرآبادی اور جگر مرادآبادی وغیرہ کے اسماء گرامی قابل ذکر ہیں۔

مرحوم مخمور سعیدی سے روایت ہے کہ جگر صاحب کو اگر کسی نئے شاعر کے اشعار پسند آتے تو وہ اس سے یہ ضرور دریافت کرتے کہ میاں ابھی تک کسی کو مرکزِ تخیّل بھی بنایا ہے یا نہیں؟ شاعر کا جواب اثبات میں ہوتا تو جگر صاحب اطمینان کا اظہار کرتے بصورت دیگر شاعر کو نصیحت فرماتے ''بغیر کسی مرکزِ تخیل کہ سچی شاعری ممکن نہیں'' وغیرہ

وغیرہ۔ پتہ نہیں جگر صاحب نے مشاعرے کے بعد قابل سے بھی ان کے مرکزِ تخیّل کے بارے میں دریافت کیا یا نہیں۔لیکن اس وقت تک قابل ایک ''ہستی'' کو اپنے تخیّل کا مرکز بنا چکے تھے،ان خاتون کا تعلق ایک خوشحال مذہبی و علمی خاندان سے تھا۔ انھوں نے بھی یقیناً قابل سے کسی نہ کسی طرح اپنی دلچسپی کا اظہار کیا ہوگا، ''کسی نہ کسی طرح'' اس لیے کہ چھوٹے شہروں کے مُسلم معاشرے میں شادی سے قبل جوان لڑکے لڑکی کا آزادانہ میل جول آج بھی پسند نہیں کیا جاتا۔آج سے تیس چالیس سال پہلے تو اس طرح کی ایکٹیویٹیز کا تصّور بھی ناممکن تھا یہی سوچا جاسکتا ہے کہ اُن خاتون سے قابل کی وابستگی محض دیدار سر راہ جلوۂ پس چلمن یا کبھی کبھی نامہ و پیام تک محدود رہی ہوگی بہر حال ایک دن سلسلہ بھی ختم ہوگیا۔گھر والوں کے دباؤ یا بدنامی کے خوف سے یا کسی اور وجہ سے نظریں پھیر لیں۔

کس کڑے وقت میں بدلی ہیں نگاہیں تم نے جب مجھے حوصلۂ ترکِ تمنا بھی نہیں

حوصلۂ ترک تمنّا نہ ہونے کا نتیجہ یہ نکلا کہ قابل تپ دق کا شکار ہوگئے۔قابل کے چھوٹے بھائی محمد شریف بھی اچانک تپ دق کا شکار ہوکر چل بسے تھے۔ملک تقسیم ہوا۔مملکت خداداد پاکستان وجود میں آئی۔کچھ دنوں کے بعد قابل بھی ترکِ وطن کر کے کراچی پہنچ گئے۔مہاجرین Claim داخل کر کے مکان دوکانیں، زمینیں اپنے اپنے نام الاٹ کروا رہے تھے لیکن اس قسم کے مادی فوائد حاصل کرنے کے لیے جس قسم کی صلاحیتوں کی ضرورت ہوتی ہے قابل اُن سے یکسر محروم تھے۔ ماہر القادری مرحوم نے اپنے رسالے ''فاران'' کے دفتر میں سر چھپانے کی جگہ دے دی اس زمانے میں جگر صاحب کراچی تشریف لائے۔''فاران'' کے دفتر ہی میں ماہر القادری کے توسط سے قابل کا تعارف جگر صاحب سے ہوا حسبِ معمول جگر صاحب نے شعر سنانے کی فرمائش کی،قابل کے اشعار سن کر جگر صاحب اتنے متاثر ہوئے کہ قابل کو اپنے ہمراہ حیدرآباد سندھ کے مشاعرے میں لے گئے۔حیدرآباد سندھ میں اجمیر سے ترک وطن کر کے جانے والے مہاجرین کی اکثریت ہے۔مشاعرے میں قابل کا تعارف خود جگر صاحب نے کروایا۔جگر صاحب کے شاندار تعارف اور پھر قابل کے کلام نے اہل حیدرآباد سندھ (ساتھ ہی اہل اجمیر) کے دلوں کو تسخیر کر لیا۔

قابل نے حیدرآباد سندھ کو وطن ثانی بنالیا۔دن گذرتے رہے۔ادبی حلقوں میں قابل کی شہرت پھیلتی رہی۔ وفات سے دو سال پہلے قابل کی زندگی میں انتہائی خوشگوار موڑ آیا۔اس خوشگوار موڑ کے پیچھے ایثار کی انتہائی عظیم الشان مثال ہے۔قابل کوئٹہ (بلوچستان) کے ریلوے سینی ٹوریم میں زیرِ علاج تھے کہ اسپتال کی ایک اسٹاف نرس قابل کی زندگی میں داخل ہوئیں اور کچھ دنوں کے بعد بیگم نرگس قابل بن گئیں۔شادی سے پہلے بیگم قابل تمام حالات سے بخوبی واقف تھیں کہ قابل شاعر ہے اور وہ بھی اردو زبان کا،قابل کا مرض جان لیوا ہے۔قابل کے پاس کوئی سرکاری یا غیر سرکاری عہدہ نہیں، جاگیر نہیں کوئی بینک بیلنس نہیں۔لیکن اس کے باوجود اُنھوں نے قابل کا ہاتھ تھام لیا۔اپنی پرخُلوص رفاقت سے قابل کی زندگی میں اجالے بکھیر دیئے،اس میں جینے کا حوصلہ پیدا کیا۔یہاں تک کہ شاعر ایک بار پھر پکار اٹھا۔

جی رہا ہوں اس اعتماد کے ساتھ زندگی کو مری ضرورت ہے

3 اکتوبر 1962 کی بات ہے میں اور احمد رئیس صاحب اودے پور میں تھے وہیں 3 اکتوبر کی شام کسی

دوست نے ریڈیو پاکستان کے حوالے سے یہ خبر سنائی کہ قابل اجمیری کا انتقال ہو گیا۔ دوسرے دن انجمن ترقی اُردو اودے پور کی جانب سے ایک تعزیتی جلسے کا انعقاد کیا گیا۔ جلسے میں احمد رئیس نے مضمون پڑھا اور میں نے قابل کی چند غزلیں سنائیں۔

قابل کی پہلی برسی کے موقع پر احمد رئیس نے ''یوم قابل'' کا اہتمام کیا۔ ''یوم قابل'' کے مشاعرے میں۔ شہاب جعفری، کمار پاشی اور رفعت سروش وغیرہ شریک ہوئے تھے۔ ''بزم مقالات'' میں قابل کے فکر وفن میں مضامین پڑھے گئے۔ ان میں سب میں سے اہم مقالہ مشہور جدید نقاد محمود ہاشمی کا تھا۔

قابل کی تخلیقی صلاحیتوں اور منفرد شاعرانہ شخصیت کا اعتراف کرنے والوں میں ہر مکتبہ فکر کے نمائندہ حضرات نظر آتے ہیں لیکن قابل کی زندگی میں ایک وقت ایسا بھی آیا تھا جب ایک خاص گروہ نے ان کی شاعرانہ شخصیت کو داغدار کرنا چاہا۔ اس گروہ کے سرخیل تھے مشہور ترقی پسند شاعر حمایت علی شاعر، معاصرانہ چشمک اور ادبی تنازعہ کو حمایت علی شاعر اور ان کے حواریوں نے کیا روپ دیا تھا اس کا اندازہ مندرجہ ذیل اقتباسات سے لگایا جاسکتا ہے۔

''ایک زمانہ میں حمایت علی شاعر سے ان کی اہم عصرانہ چشمک چلی تھی۔ قابل فن کے پرستار اور ادبی حلقوں میں مقبول۔ حمایت علی شاعر ریڈیو سے وابستہ اور ادبی حلقوں سے باہر بھی عزیز لیکن ظاہر ہے جو شخص دس سال تک موت سے لڑتا رہا ہو وہ حمایت علی شاعر سے کیا ہار مانتا، جیت قابل کی ہوئی۔ اس کی زندگی میں نہ سہی موت کے بعد تو مجموعہ شائع ہو گیا''۔

''مجھے اچھی طرح یاد ہے مشاعرہ شباب پر تھا اچانک صدر مشاعرہ نے مائک سنبھالا اور ایک رندھی ہوئی آواز نے فضا میں سوگواری کی سی کیفیت پیدا کر دی ''حضرات میری صدارت پر میرے ایک ہم عصر شاعر کو اعتراض ہے اس لیے میں صدارت سے دستبردار ہوتا ہوں'' قابل اجمیری اسٹیج سے اُتر کر بھاری قدموں کے ساتھ مشاعرہ گاہ کے دروازے کی طرف بڑھنے لگے۔ میں نے محسوس کیا جیسے یہ میری توہین ہوئی ہے۔ قریب ہی مرزا عابد عباس بیٹھے تھے میں نے ان کہا'' یہ سخت زیادتی ہے قابل صاحب کو روکنا چاہئے عابد صاحب کی تائید پا کر میں تیزی سے دروازے کی طرف لپکا اور کوشش کر کے قابل صاحب کو اسٹیج پر لے آیا۔ اب میری باری تھی۔ مائک پر آ کر میں نے کہا'' حضرات یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ اس ادبی محفل میں سیاست در آئی ہے لیکن ادبی محفل میں سیاست کا کیا کام؟ میری درخواست ہے کہ قابل صاحب صدارت جاری رکھیں آپ حضرات سے اُمیّد ہے کہ تائید فرمائیں گے مجمع میں جیسے جان پڑ گئی۔ چاروں طرف سے تالیوں کی آواز آنے لگی اور اس طرح مشاعرہ دوبارہ شروع ہوا۔''

''مجھے یہ بھی یاد ہے کہ ایک رات کوئی گیارہ بجے کا عمل ہوگا، سوسائٹی کے نزدیک قابل صاحب سے ملاقات ہو گئی۔ قابل صاحب افسردہ لہجے میں بولے اب تو مجھے شاعر ماننے سے انکار کیا جا رہا ہے۔ میں نے اِدھر اُدھر کی باتوں میں ان کے ذہن کو الجھا دیا۔ کوئی ایک بجے وہ مجھ سے جُدا ہوئے۔ اور میں دیر تک سوچتا رہا۔ تپ دق کا مریض یوں بھی حساس ہوتا ہے، اگر وہ شاعر ہو تو اور بھی زیادہ حساس ہوتا ہے شاید یہی وجہ تھی کہ قابل صاحب

ذرا ذرا سی باتوں کو بھی اہمیت دینے لگے تھے۔''

''مجھے وہ نشست بھی یاد ہے جہاں حیدرآباد سندھ کے منتخب ادیب شعراء جمع تھے۔ قابل صاحب نے اپنی غزل تنقید کے لیے پیش کی۔ ایک شاعر اور ان کے حمایتیوں نے بے معنی اعتراضات کی بوچھار کر دی، جوشِ تنقید میں نہیں بلکہ جوشِ تنقیص میں وہ شاعر قابل صاحب کے ایک شعر کو باقی صدیقی کا شعر بتانے لگے۔ حالانکہ بعد میں تحقیق کرنے پر پتہ چلا کہ باقی نے اس زمین میں کبھی کوئی شعر نہیں کہا''

(چند یادیں، محسن بھوپالی، قابل نمبر'' طالب علم ڈائجسٹ مطبوعات، حیدرآباد سندھ پاکستان)

مندرجہ بالا واقعات اس وقت بھی میرے ذہن میں تازہ تھے جب برسوں کے بعد مشہور نقاد شمس الرحمٰن فاروقی صاحب سے میری پہلی ملاقات ہوئی، ڈیڑھ، دو سال پہلے شمس الرحمٰن فاروقی صاحب اپنی فیملی کے ساتھ اجمیر آئے ہوئے تھے، ان دنوں میں بھی اجمیر میں تھا پیاین ٹی گیسٹ ہاؤس کے کمرے میں فاروقی صاحب سے جدید شاعری اور جدید شعراء پر گفتگو ہو رہی تھی گفتگو کے دوران میں نے اچانک پوچھ لیا فاروقی صاحب! آپ قابل اجمیری سے بھی واقف ہیں؟ فاروقی صاحب نے بے ساختہ فرمایا'' آپ بھی کمال کرتے ہیں اردو ادب کا ایسا کون سا سنجیدہ طالب علم ہوگا جو قابل سے واقفیت نہ رکھتا ہو راجستھان کے شعر و ادب سے بالعموم اور اجمیر کے ادب سے بالخصوص میرا پہلا تعارف ہی قابل اجمیری کے توسط سے ہوا تھا۔ میں چٹکی لی'' لیکن قابل جدید شاعر تو نہیں تھے''! فاروقی نے کہا'' جی نہیں ایسی کوئی بات نہیں اچھی اور سچی شاعری ہمیشہ جدید رہتی ہے۔''

شمس الرحمٰن فاروقی جیسے کٹر نقاد کی قابل اجمیری کے بارے میں یہ بے لاگ رائے سن کر مجھے یقین ہو گیا کہ اگر شاعر میں واقعی دم خم ہے تو اس کی آواز کو بہت دنوں تک نہیں دبایا جا سکتا۔

قابل کی تحقیقی کاوشیں پہلی بار ایک مختصر سے کتابچے کے ذریعہ منظر عام پر آئی تھیں۔ اس مختصر سے کتابچے کا نام تھا۔'' قابل کے سو اشعار'' جس کے، دیباچے میں جگر مرادآبادی نے اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا تھا۔

قابل کے کلام سے ان کی انفرادیت نمایاں ہے اور یہی خوبی شاعر کے لیے اہم اور اہم تر ہے خیالات اور جذبات کے ساتھ ساتھ ان کا اسلوب بیان بھی شگفتہ و پاکیزہ اور تغزل کا حامل ہے۔

ڈاکٹر عبادت بریلوی اپنے مضمون'' جوہر قابل'' میں رقم طراز ہیں۔ قابل کے یہاں تقلید کا شائبہ تک نہیں ہوتا وہ نئی بات کہتے ہیں اور نئے انداز سے کہتے ہیں۔ غزل کی روایت سے پوری واقفیت رکھنے اور اس سے خاطرِ خواہ استفادہ حاصل کرنے کے باوجود وہ کبھی لکیر کے فقیر نہیں بنے۔ ان کے یہاں خاصا تنوع ہے لیکن اس تنوع کے ہاتھوں ان کی انفرادیت کو ٹھیس نہیں لگتی ان کا مخصوص زاویہ نظر اس تنوع میں بھی ایک یک رنگی پیدا کرتا ہے۔''

جانے کس عالم میں آئیں آنے والے قافلے | سایہ دیوار جاناں جاوداں کرتے چلو
کتنے روشن ہیں وہ عارض کتنے شریں ہیں وہ لب | راستہ کٹ جائے گا ذکر بتاں کرتے چلو
زمانے سے شکایت کیا زمانہ کس کی سنتا ہے | مگر تم نے تو آواز جنوں پہچان لی ہوتی

رضائے دوست قابل میرا معیار محبت ہے — انھیں بھی بھول سکتا تھا اگر ان کی خوشی ہوتی

ڈاکٹر فرمان فتح پوری اپنے مضمون ''قابل۔ تجدد کی ایک مثال'' میں فرماتے ہیں ''قابل اجمیری میں نکتہ سے نکتہ پیدا کر لینے اور روایت میں بلا کی حدّت اور احساس میں غضب کی تازگی و انفرادیت ہے۔ یہی سبب ہے کہ غزل کی بعض حد درجہ فرسودہ اور ناموافق زمینوں میں بھی وہ ایسے آبدار نشر نکال لیتے ہیں کہ خدا کی توفیق یاد آجاتی ہے۔''

زمانہ دوست ہے کس کس کو یاد رکھو گے — خدا کرے کہ تمہیں مجھ سے دشمنی ہو جائے

لُطف صبح نشاط مجھ سے پوچھ — میں نے شامِ الم گذاری ہے

دل کی دھڑکن کا اعتبار نہیں — ورنہ آواز تو تمہاری ہے

اپنے لب ہی نہیں سئے ہم نے — آپ کی زلف بھی سنواری ہے

کتنی شمعیں بجھا کے اے قابل — دل میں ایک روشنی اتاری ہے

ہم چراغِ یقیں جلاتے رہے — وقت کو راستہ دکھاتے رہے

زندگی کتنی مختلف تھی مگر — ہم ترے ساتھ مسکراتے رہے

ایک پوچھتی پھرے گی حیات — اہلِ دل کس نگر میں رہتے ہیں

لاکھ ہم خانماں خراب سہی — حادثوں کی نظر میں رہتے ہیں

جلوہ گاہ یار سے بھی تشنہ کام آئے ہیں لوگ — جانے امیدیں زیادہ تھیں کہ جلوے کم رہے

کٹ گئے ہجر کے پہاڑ سے دن — وقت کو تیرا انتظار نہ تھا

مرحلے زیست کے بھی کم تو نہیں اے دوست — اور جی لیں گے تیری زلف کے سر ہونے تک

سحر انصاری رقم طراز ہیں: ''حسرت موہانی نے تہذیب رسم عاشقی کی جو بنیاد غزل میں رکھی تھی اُسے قابل نے بھی اپنایا ہے۔ تہذیب میں عموماً تصنع کا رنگ آجاتا ہے۔ لیکن قابل نے تصنع کی اس منفی کیفیت کو اپنے دائرہ احساس سے خارج کر دیا ہے ان اشعار میں آپ کو قابل کے مزاج کی مخصوص ساخت کا اندازہ ہو جائے گا۔''

خود تمہیں چاک گریباں کا شعور آجائے گا — تم وہاں تک آ تو جاؤ ہم جہاں تک آ گئے

حُسنِ ترتیب ہے دلیلِ چمن — ورنہ صحرا میں کیا بہار نہیں

بے نیازی کو اپنی خو نہ بنا — یہ ادا بھی کسی کو پیاری ہے

ہم بدلتے ہیں رخ ہواؤں کا — آئے دنیا ہمارے ساتھ چلے

مقامات فکر و نظر کون دیکھے — یہاں لوگ نقش قدم دیکھتے ہیں

ان کی زندگی میں ایک خاص رکھ رکھاؤ اور آن بان تھی۔ وہ دریوزہ گر آتش بیگانہ نہیں ہونا چاہتے تھے، دوستی کے پردے میں کسی احسان کو قبول کرنا ان کے لیے سزا سے کم نہیں۔

بے کسی سے بڑی امیدیں ہیں — تم کوئی آسرا نہ دے جانا

کوئی احسان کرکے قابل پر دوستی کی سزا نہ دے جانا
نامرادی نے کر دیا خوددار اب سر شوق خم نہیں ہوتا
وقت کرتا ہے پرورش برسوں حادثہ ایک دم نہیں ہوتا
اس کی محفل میں بیٹھ کر دیکھو زندگی کتنی خوبصورت ہے
جی رہا ہوں اس اعتماد کے ساتھ زندگی کو مری ضرورت ہے

ادارہ سماجی بہبود (لاہور) کی جانب سے قابل اجمیری کی چوتھی برسی منائی گئی تھی۔ اس موقع پر شاہد احمد دہلوی نے اپنے تحریری پیغام میں قابل کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار اس طرح کیا تھا۔

قابل مرحوم بڑے خوددار اور وضعدار آدمی تھے۔ انہوں نے اپنی تکلیفوں کا کسی سے ذکر نہیں کیا اور نہ کسی کے آگے ہاتھ پھیلایا خاموشی کے ساتھ سرو چراغاں کی طرح دھڑ دھڑ جلتے رہے اور ایک روز یہ نور افشانی اچانک ختم ہوگئی۔ اندھیروں نے اعلان کیا کہ ایک اور جوہر قابل اٹھا لیا گیا۔ قابل اجمیری واقعی ایک جوہر قابل تھے۔ گو جوانی میں ہی بیماری نے ان پر غلبہ پا لیا تھا، بھری جوانی میں نیم جاں جئے اور دیکھتے ہی دیکھتے بے جاں ہوگئے غزل ہماری شاعری کی سب سے محبوب صنف سخن ہے مگر یہ غزل کہنا بظاہر جتنا آسان ہے بباطن اتنا ہی مشکل ہے۔ بلا مبالغہ روزانہ ہزاروں غزلیں کہی جاتی ہیں مگر ان میں سے ایک فیصد بھی زندہ نہیں رہتی۔ خوش نصیب ہیں وہ شاعر جن کی غزلیں زندہ رہتی ہیں۔ وقت خود بڑا بے رحم نقاد ہے انہیں خوش نصیبوں میں جن کی غزلوں پر دست و برد زمانہ کا اثر نہ ہوگا قابل اجمیری بھی ہیں۔

☆☆☆

بڑی زبان کا زندہ رسالہ

ذہنِ جدید

ترتیب: زبیر رضوی

زبیر رضوی پر پچھلے پچاس برسوں میں ان کے معاصرین کی لکھی تحریروں کا انتخاب

متاعِ سخن

مرتب: اسلم پرویز

صفحات: ۳۷۵ قیمت: ۲۵۰/روپئے

رابطہ: 197/8, AB Complex, Zakir Nagar, New Delhi-25. Ph.011-26983804

اديب سہیل

عشق انسان کی ضرورت ہے

قابل اجمیری چاہے جانے والے فرد کی شخصیت کے حامل تھے۔ کتاب کی پشت پر ان کی تصویر یہی کچھ بتاتی ہے۔ ورنہ تپ دق جیسے موذی مرض میں مبتلا ہو کر جب قابل اجمیری کوئٹہ کے اسپتال میں زیر علاج تھے تو ان کی تیماردار نرس نرگس یہ سب بھول کر کہ قابل موذی مرض میں مبتلا ہیں اور زندگی کا کوئی بھروسا نہیں، یہ چراغ کسی وقت بھی گل ہوسکتا ہے، وہ ہمیشہ کے لئے ان کی ہو رہیں۔ یہ جذبہ سرشاری اس بات کی یقین دہانی کراتا ہے کہ دنیا میں ایسے لوگ اب بھی موجود ہیں۔

قابل صاحب کی شاعری اچھی تھی، شعر و ادب کے حلقے میں پسند کی جاتی تھی ورنہ پسندیدگی کی یہ دھمک سابق مشرقی پاکستان میں رہنے والے ہم جیسے لوگوں تک کیسے پہنچ سکتی تھی۔ قابل پر ''شعلہ مستعجل'' کا اطلاق ہوسکتا ہے۔ انھوں نے کم لکھ کر (بہت لکھنے کا موقع ہی ان کی زندگی نہ دیا) جتنی مقبولیت حاصل کی۔ بہت سے عمر بھر کاروبار شعر کر کے اس قابل نہ ہو سکے۔ قابل صاحب کے باب میں یہ بات سچ کہی گئی ہے کہ ان کی شاعری سچی اور دل سے نکلی ہوئی آواز تھی اور سچی آواز آفاق گیر اور ہمہ جہت ہوتی ہے۔ قابل کے ہاں غم دوراں اور غم ذات ایک سکے کے دو رخ معلوم ہوتے ہیں، آپس میں ایسے گھلے ملے کہ دوئی کا اشتباہ بھی نہیں ہوتا۔ مثلاً

جی رہا ہوں اس اعتماد کے ساتھ
زندگی کو مری ضرورت ہے

خود تمھیں چاک گریباں کا شعور آجائے گا
تم وہاں تک آتو جاؤ، ہم جہاں تک آگئے

اے گردش دوراں آ تجھ کو بھی اماں بخشیں
ہم نے غمِ جاناں کو سینے سے لگایا ہے
ہم بدلتے ہیں رُخ ہواؤں کے
آئے دنیا ، ہمارے ساتھ چلے

محسن بھوپالی کی یہ بات مبنی بر صداقت ہے کہ قابل کے شعری دیوان میں ایسے اشعار خاصے ہیں جن میں ضرب المثل بننے کی صلاحیت ہے۔قابل صاحب کا یہ شعر بھی اسی زمرے میں آتا ہے۔

وقت کرتا ہے پرورش برسوں
حادثہ ایک دم نہیں ہوتا

ضرب المثل کے حوالے سے قابل اجمیری کا یہ شعر آدمی کو لمحہ بھر کے لئے بے پناہ کر دیتا ہے، معنویت کا ایک اژدہام اپنے پیچھے لئے ہوئے محسوس ہوتا ہے۔قابل صاحب کے زیر بحث شعری مجموعہ کا نام ان کے اس شعر کا دوسرا مصرع ہے۔

تم نہ مانو مگر حقیقت ہے
عشق انسان کی ضرورت ہے

بولتا ہوا مصرع ہے، ایک فلسفیانہ آہنگ رکھتا ہے۔ یہ کہنا بڑا دشوار ہے کہ عشق انسان کی ضرورت ہے، یا انسان عشق کی ضرورت! انسان اور عشق ایسے لازم وملزوم ہیں کہ کہنا پڑتا ہے کہ دونوں ہی ایک دوسرے کی ضرورت ہیں۔ جس طرح آدمی کو انسان تک رسائی کے لئے بہت سے مدارج درکار ہوتے ہیں اسی طرح دلی تعلق کو عشق کے بہت سے مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔جس دل میں عشق نہیں وہ خالی برتن ہے۔مسلک صوفیا میں طریقت سے حقیقت عظمیٰ تک کی راہِ عشق طے کراتا ہے۔

☆☆☆

خواجہ جاوید اختر کا پہلا شعری مجموعہ
نیند شرط نہیں
شائع ہو چکا ہے
قیمت: ۲۰۰ روپے
رابطہ: شب خون کتاب گھر، 313، رانی منڈی، الہٰ آباد

بینش سلیمی

قابل اجمیری کی شاعری: ایک جائزہ

غالباً کی 1949-48 کی بات ہے میں نے جے پور میں قابل اجمیری صاحب کے کچھ شعر سنے تھے۔ آج ان شعروں کا صحیح صحیح تاثر تو ذہن میں محفوظ نہیں ہے لیکن اتنا یاد ہے کہ میں انھیں سن کر چونک سا گیا تھا۔ اور میں نے کچھ ایسا محسوس کیا تھا کہ ان اشعار میں ایک نیا پن ہے غزلیت بھی ہے اس کے بعد جب میں حیدر آباد آ گیا تو ایک محفل میں قابل صاحب کی زباں سے ان کی غزلیں سنیں، نکلتا ہوا قد سانوالا رنگ، روشن آنکھیں ہونٹوں پر کھیلتی ہوئی مسکراہٹ، لباس سادہ مگر مقبول۔ یہ تھے قابل اجمیری۔ کم گو بھی کم آمیز بھی مگر جب دوست بن جاتے تو سر تا پا خلوص و محبت نظر آتے۔

غالباً 52ء ہی میں میرے ان سے دوستانہ مراسم قائم ہو گئے اور یہی وہ زمانہ تھا جب ان کی غزل گوئی ایک خاص رنگ اختیار کر رہی تھی اور اس زمانہ میں ان کی علالت تشویش ناک مراحل میں داخل ہو رہی تھی یا شاید داخل ہو چکی تھی۔ یہ عجیب بات تھی کہ نہ وہ اپنی علالت کو گفتگو کا موضوع بناتے اور نہ ان کے چہرے سے یہ پتہ چلتا کہ وہ بہت جلد زندگی کو خیر باد کہہ دینے والے ہیں۔

قابل بڑی خوبیوں کے آدمی تھے حد درجہ ملنسار اور یکسر مرنجان مرنج، جو شگفتگی اور محبت اور ظرف وضبط ان کے اشعار میں ہے اسی سے ان کا مزاج بھی عبارت تھا۔ حالانکہ زندگی میں شاید ہی کوئی راحت انہیں میسر آئی ہو مگر جب بھی ملتے سراپا خلوص نظر آتے۔ بات کرنے سے پہلے مسکراتے، دلجوئی ان کی عادت، دردمندی ان کی فطرت تھی۔ مجھے ان کے ساتھ کئی کئی گھنٹے گزارنے کا موقع ملا مگر کبھی انھوں نے اپنے اشعار سنانے میں پہل نہیں کی۔ اکثر یہ ہوتا کہ میں اصرار کرتا اور وہ ٹالتے رہتے۔ شعر و شاعری پر جب کبھی گفتگو ہوتی تو اپنے بارے میں کبھی کوئی بات نہیں کرتے۔ شاعری کے باب میں انھیں نہ اپنے ہمعصروں سے کوئی حسد تھا اور نہ اپنے بارے میں کسی قسم کی خود فریبی، شاعری اور شائستگی کے امتزاج نے ان کی شخصیت میں ایک عجیب محویت پیدا کر دی تھی۔ ان کی شاعری اور شخصیت ایک دوسرے سے اس طرح ہم آہنگ ہیں کہ ایک کو دوسرے سے الگ کر کے دیکھنا اور سمجھنا مشکل ہے۔ ان کی شخصیت غزل ہی کا ایک روپ معلوم ہوتی ہے اور ان کی غزل ایک متوازن شخصیت کی آئینہ دار ہے۔

قابل اگست 1931 میں پیدا ہوئے اور 3 اکتوبر 1962 کو عین نوجوانی کے عالم میں اس دنیا سے رخصت ہو گئے اس طرح انھوں نے زندگی کے گویا اکتیس برس گزارے۔ ان اکتیس برسوں میں سے اگر ان کی علالت کے دس گیارہ سال نکال دیے جائیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ بیس اکیس برس میں زندگی کے کچھ اچھے دن دیکھے ہوں گے پھر اگر یہ صحیح مان لیا جائے کہ انھوں نے چودہ پندرہ سال کی عمر سے شعر گوئی کا آغاز کیا ہوگا تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ان کی شعر گوئی کی مجموعی عمر دس پندرہ سال سے زیادہ نہیں ہے اور حیرت ہوتی ہے۔ اتنی کم مدت کی مشق میں انھوں نے غزل گوئی میں ایسا رنگ کیسے پیدا کر لیا جو نصف صدی سے کم کی مشق سخن کے بغیر ناممکن ہے۔ پندرہ سال کی عمر میں شعر کہنا شروع کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ انھوں نے 46ء سے شعر کہنا شروع کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب برصغیر کی آزادی کی تحریک ایک فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہو چکی تھی اور آزادی کی منزل بقول مولانا آزاد اس قدر نزدیک تھی کہ اس کی طرف اشارہ بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ قابل صاحب اس تحریک سے تو براہ راست متاثر نہ تھے لیکن اس زمانے میں جو غزل گو نمایاں تھے ان کے انداز فکر و نظر سے قابل ضرور متاثر تھے اصل میں پندرہ سولہ سال کی عمر انسان میں کچھ اتنا شعور بھی کہاں پیدا کر سکتی ہے کہ وہ سماجی سیاسی و تہذیبی تقاضوں کو سمجھ سکے اور زندگی اور وقت کے ارتقاء کا اندازہ لگا سکے پھر آزادی کے بعد جو حالات سامنے آئے۔ وہ ایسے تھے کہ نوعمر شعراء کا تو خیر ذکر ہی کیا ہے بڑے بڑے کہنہ مشق شعراء پر ایک جمود سا طاری ہو گیا۔

میرا ایسا اندازہ ہے کہ غزل بھی آزادی کے بعد سے ہنگامی حالات اور ان کے ردعمل کا شکار ہو گئی اور زندگی کی اصل اقدار کا کوئی خاص تصور غزل گو شعراء کے سامنے نہیں رہا اب تک پاک و ہند میں غزل جو کچھ گزری ہے وہ کچھ زیادہ محتاج بیان نہیں ہے بلکہ پوری شاعری جس کشمکش اور گومگو کے عالم میں رہی وہ بھی کچھ چھپی ہوئی بات نہیں ہے ایسے حالات میں اگر کوئی شاعر غزل کے مزاج اور اس کی روایات کو مجروح کیے بغیر اچھی غزل کہتا رہا تو یہ بھی اپنی جگہ بڑی بات ہے۔ ایسی اچھی غزل کہنے والوں میں کے بعد سے اب تک جتنے شاعر سامنے آئے ہیں ان میں ایک نام قابل اجمیری کا بھی ہے۔ ان کی غزل متوازن اور تخلیقی حسن و شعور کی حامل ہے۔ سب سے زیادہ حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ زندگی کے انتہائی نامساعد حالات سے دوچار رہنے کے باوجود زندگی کے باب میں ان کا نقطۂ نظر قنوطی نہ ہو سکا بلکہ وہ زندگی سے پیار اور زندگی اور عشق دونوں کی عظمت کا احساس رکھتے تھے۔

بات کچھ یوں ہے کہ غزل گوئی فن اور اس کے حسن پر گفتگو بڑی مشکل چیز ہے۔ غزل کو غزل کہہ دینا ہی کافی نہیں۔ اس کی نازک تشبیہوں اور لطیف نزاکتوں سے متعلق غور و فکر بھی ضروری ہے اور پھر غزل میں لطافت اور نزاکت سے زیادہ اور کچھ اور بھی ہے اور بہت کچھ وہ ہے جسے صرف محسوس کیا جا سکتا ہے، بیان کرنا شاید ممکن نہیں۔ پھر بھی میرا ایسا خیال ہے کہ غزل ذہنی عیاشی نہیں تزکیہ نفس ہے، اظہار جذبات نہیں بلکہ اجتناب جذبات ہے' یہ کچھ کہنے سے زیادہ شاید ''کچھ کہہ نہ سکنے'' کا اعتراف ہے غزل بیانِ حسن ہی نہیں حسنِ بیان بھی ہے اور یہ حسن بیان عبارت ہے رمز و اشارات سے، جذبے کی صداقت سے اور فکر کے شعری پہلو سے۔ شاعری میں بالعموم اور غزل میں

بالخصوص ایک چیز کی بڑی اہمیت ہے جسے ''لب ولہجہ'' کہتے ہیں۔ میؔر و غالبؔ کو چھوڑ کر غزل کے جو شاعر ایک رنگ' ایک انفردیت کے حامل ہیں وہ ان کا لہجہ ہی ہے۔ آتشؔ' حسرتؔ' فانیؔ جگرؔ' فراقؔ، یگانہؔ سب کے یہاں انفرادیت کو نمایاں کرنے والا ان کا لہجہ ہے۔ یہ لہجہ ایک' شخصیت' ایک مزاج' ایک نقطہ نظر چاہتا ہے۔ یقیناً قابل لہجہ کے اعتبار سے اتنے بڑے شاعر نہیں ہیں کہ انھیں غزل کے بڑے شاعروں میں شمار کیا جائے لیکن اپنے ہمعصر شعراء میں ان کا لہجہ اتنا نمایاں ہے کہ وہ غزل کے ایک ممتاز شاعر قرار دیئے جاسکتے ہیں اور وہ بھی محض دس سال کی مشقِ سخن کے ساتھ!

میرے اندازے کے مطابق 52ء سے قابل کے یہاں غزل میں وہ بات پیدا ہو چکی تھی جو ان کے ہمعصروں میں انھیں منفرد اور ممتاز بنانے والی تھی قابل ادب و شعر کی کسی خاص تحریک سے وابستہ نہیں تھے وہ اشتراکیت سے متاثر تھے اور نہ فرائڈ سے انھیں کلاسیکی غزل سے عشق کی حد تک وابستگی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں حالیؔ اور فانیؔ کا رنگ بھی ملتا ہے اور فراقؔ اور فیضؔ کا بھی۔ فانی سے وہ بہت متاثر رہے شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ انھوں نے فانیؔ سے زیادہ غم واندوہ سے بھرپور زندگی بسر کی تھی بلکہ میرے اندازے اور مشاہدے کے مطابق ان کی تیس سالہ زندگی میں شاید ہی ان کا کوئی دن اطمینان اور بے فکری کا گزرا ہو۔ وہ چاہتے تو فانی کی آواز بازگشت بن کے رہ سکتے تھے لیکن انھوں نے اپنی انفرادیت کو جو فانیؔ کے مقابلے میں کچھ زیادہ قابل ذکر نہیں ہے' برقرار رکھا۔ ان کی غزل سے زندگی کے حوصلہ خیز اور نشاط انگیز امکانات کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔ یہ بھی بڑی بات ہے اگر آپ میرؔ وغالبؔ سے قطع نظر کر کے دیکھیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ معدودے چند کو چھوڑ کر غزل کے سارے قابل ذکر شعراء کے ہاں زیادہ تر اسلوب بیان ہی کا حسن ہے۔ قابل کے ہاں اسلوب بیان کچھ اور زیادہ نکھر گیا ہے اس لیے کہ وہ تغزل اور اس کی روایت کا پورا پورا احترام کرتے تھے۔ غزل سے انھیں ایک نوع کی وابستگی تھی وہ غزل کے مزاج کو سمجھتے تھے۔

52ء سے اب تک جو غزل گو اپنی انفرادیت کے ساتھ سامنے آئے ہیں ان میں قابل سب سے زیادہ نمایاں اور سب سے زیادہ انفرادیت کے حامل ہیں یہ الگ بات ہے کہ بعض شعراء مشاعروں اور اپنے گروہ کے نقادوں کے سہارے ضرورت سے زیادہ ہی شہرت پا گئے لیکن شہرت کوئی معیار نہیں ہے اور پھر شہرت بھی وہ جو بیساکھیوں کے سہارے قائم ہو۔

یہ جو تنقید نام کی ایک چیز ہمارے ہاں پائی جاتی ہے اس کا ان دنوں کچھ عجیب حال ہے کچھ بڑے نقاد تو ایسے ہیں جو نئے شعراء کو پرکھانے یا تعارف کرانے میں اپنی توہین محسوس کرتے ہیں۔ یہ میر غالبؔ، فراقؔ، فانیؔ اور فیضؔ سے کم درجہ اور مرتبہ کے شاعر کے متعلق کچھ لکھنے کی قسم کھائے ہوتے ہیں۔ اگر یہ نقاد کسی نئے شاعر پر کچھ لکھتے بھی ہیں تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ احسان کیا گیا ہے۔ بعض نقاد وحضرات گروہ بندی کا شکار ہیں اور وہ تنقید سے زیادہ ادبی بددیانتی سے کام لیتے ہیں اور اپنے گڑھ کے شاعروں کو اسنادمرحمت فرمانے کا فرض انجام دیتے ہیں کچھ ایسے نقاد بھی ہیں جو خود شاعر بھی ہیں اور اپنے سے بڑا شاعر کسی کو مانتے ہی نہیں۔ بہر حال تنقید پر آجکل بڑا نازک وقت آپڑا ہے اور افسوس ناک بات یہ ہے کہ خود نقاد کو اس کا احساس تک نہیں ہے شاعروں کا حال اس سے بھی ابتر ہے (اور ہونا بھی چاہئے) وہاں شعر سے زیادہ ''ہوٹنگ'' کے سننے سنانے کا اہتمام کیا جاتا ہے اور پھر اس کے سامعین وہی ہوتے ہیں

جومیلہ مویشیاں سے لے کر پہلوانوں کے دنگل تک میں دیکھے جاتے ہیں ایسی صورت میں مشاعروں سے حاصل ہو نے والی شہرت کی حقیقت معلوم.... یہ بات تو بر سبیل تذکرہ نکل آئی ہیں یہ عرض کرر ہا تھا کہ 52ء کے بعد کی غزل کے شعراء میں قابل ایک اہم شاعر ہیں۔افسوس کہ اس وقت جب ان کی غزل ''دامان باغیاں'' کف گلفروش بنتی جارہی تھی طویل عرصہ تک موت حیات کی کشمکش میں مبتلا رہنے کے بعد ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئے۔

قابل کے دو مجموعے ''دیدۂ بیدار'' اور ''خون رگ جاں'' شائع ہو چکے ہیں اور دونوں مجموعے ان کی وفات کے بعد شائع ہوئے۔ ان میں سے 'دیدۂ بیدار' انھوں نے اپنی زندگی میں ترتیب دے لیا تھا۔ وہ اس کی کتابت بھی کرا چکے تھے مگر معلوم نہیں کہ کن وجوہ سے وہ ان کی زندگی میں شائع نہ ہوسکا۔ یوں تو ان کے دنوں مجموعوں میں غزل نظم رباعی قطعات سبھی کچھ ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ قابل صرف غزل کے شاعر تھے۔ واردات عشق ومحبت ان کی غزل کا بنیادی موضوع ہے۔ یوں تو ہر دور میں غزل کا بنیادی موضوع عشق ہی رہا ہے لیکن عشق عشق میں فرق ہوتا ہے اور یہ فرق جذبہ واحساس کی صداقت اور اظہار کے خلوص سے عبارت ہے۔

قابل کے ہاں عشق سطحی یا عمومیت لیے ہوئے نہیں ہے۔ یہ روایتی بھی نہیں ہے۔ انھیں سب سے زیادہ عشق تو زندگی ہی سے تھا جوان کے لیے سب سے زیادہ سفاک بھی تھی۔ واردات عشق ومحبت کے سلسلہ میں دو ہی پہلو اہم ہوتے ہیں ایک وصال دوسرا ہجر۔ قابل وصال کے نہیں ہجر کے شاعر ہیں لیکن ان کے ہاں مایوسی ،محرومی اور حسرت وناکامی کی وہ فضا نہیں ہے جو بالعموم احساس ہجر سے مخصوص ہے، ان کے ہاں ہجر بھی اس فضا سے عبارت ہے جو بڑی وصال آفرین ہے۔ یہ چند شعر دیکھئے۔

ہوا تھا ہجر کا احساس لمحہ بھر کے لئے	پھر اس کے بعد تیری یاد عمر بھر آئی
خوشبوئے انتظار سے مہکی ہوئی رات ہے	قابل نہ جانے کس کو بلاتی ہے چاندنی
کچھ حسن آچلا تھا شب انتظار میں	کاش تھوڑی دیر نہ ہوتی سحر ابھی

ان اشعار میں کتنی تازگی اور شگفتگی ہے۔ یہی تازگی اور شگفتگی قابل کے ہاں تغزل کا ایک خاص جزو بن گئی ہے۔ ان کے ہاں فرسودگی، گھٹن اور یاس نام کی کوئی چیز نہیں ہے ان کی غزلوں میں اشعار کی تعداد بھی زیادہ نہیں ہوتی اور پھر جو فضا ان کی غزلوں میں ملتی ہے ان میں تر وتازہ پھولوں کی سی رنگینی اور شگفتگی نمایاں ہے۔ ان کا لہجہ شکوہ وفریاد کا لہجہ نہیں ہے۔ ایسا یاد پڑتا ہے کہ مولانا ماہر القادری نے ایک جگہ ان کے کلام پر اظہار رائے کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ''ان کے ہاں نغمہ وفریاد کا حسین امتزاج ملتا ہے'' مگر میرا اندازہ کچھ ایسا ہے کہ قابل نے فریاد کو بھی نغمہ ہی بنادیا ہے۔ ان کے تغزل میں بنیادی چیز نغمگی ہے، یہ نغمگی محبوب کی بعض اداؤں کے بیان میں اپنی انتہا کو پہنچ جاتی ہے دیکھئے۔

رکا رکا سا تبسم جھکی جھکی سی نظر	تمہیں سلیقہ بیگانگی کہاں ہے ابھی
ئی جواب ہے اس طرز دلربائی کا	سکوں بھی لوٹ لیا بے قرار بھی نہ کیا
بے نیازی کو اپنی خو نہ بنا	یہ ادا بھی کسی کو پیاری ہے

قابل غزل کی روایت کو سمجھتے تھے اور اسے برتنا بھی جانتے تھے۔اسی لیے ان کی غزلوں میں جہاں روایت کا رچاؤ نمایاں ہے وہیں اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے کہیں لکیر کا فقیر ہونا گوارا نہیں کیا۔جن احساسات و کیفیات کو انھوں نے شعری آہنگ میں ڈھالا ہے وہ احساسات و کیفیات مستعار نہیں ہیں بلکہ ان کی اپنی زندگی سے متعلق ہیں ۔ان میں سچائی ہے، شدت ہے، تڑپ ہے۔یہ صحیح ہے کہ ان کے ہاں فکر کی گیرائی اور گہرائی کم ہے لیکن زندگی کے معاملات ومسائل سے وہ یکسر بے خبر بھی نظر نہیں آتے۔ان کی غزلوں میں زندگی اپنے سارے تنوع کے ساتھ نمایاں ہے۔اسی لیے ان کے ہاں وسعت اور پھیلاؤ کا احساس ہوتا ہے اور احساسات وجذبات کے نئے زاویے ملتے ہیں۔

غزل کا وہ رخ جو عشق و محبت سے متعلق ہے ہمیشہ سے غزل کی جان رہا ہے۔قابل کے ہاں بھی بنیادی موضوع عشق ہی ہے۔ان کے ہاں عشق کے بیان میں تہذیب وشائستگی ،ضبط وتوانائی اور توازن کی ایک عجیب دلکش اور پُر تاثیر فضا ملتی ہیں جن میں ابتذال، سطحیت اور تقلید کا شائبہ تک نہیں۔یہ چند شعر دیکھئے یہ روایت کا کیسا رچاؤ اور اسلوب بیان کا کیسا اچھوتا پن لئے ہوئے ہیں۔

ہم نے دیئے ہیں عشق کو تیور نئے نئے ‏ ‏ ‏ ان سے بھی ہو گئے ہیں گریزاں کبھی کبھی
رفتہ رفتہ رنگ لایا جذبہ خاموش عشق ‏ ‏ ‏ وہ تغافل کرتے کرتے امتحاں تک آ گئے
زہر بھی ہم نے پی کے دیکھ لیا ‏ ‏ ‏ عشق میں تشنگی ہی رہتی ہے

میں نے ایک جگہ لکھا ہے کہ زندگی کے باب میں قابل کا نقطہ نظر اس حد تک رجائی ہے کہ ان کے ہاں غم جاناں اور غم روزگار کا ذکر بھی انفعالیت لیے ہوئے نہیں ہے۔وہ زندگی کی محرومیوں اور ناکامیوں سے پوری طرح آگاہ ہیں لیکن اس کے باوجود ان کی غزلوں میں یاس وناامیدی اور بیزاری کہیں نہیں پائی جاتی۔یہی نہیں بلکہ ان کے ہاں جذبہ جولانی کا غلبہ ہے۔وہ زندگی کو اس کی ساری سنگ دلی اور سفاکی کے ساتھ، پیار کے قابل چیز سمجھتے ہیں۔وہ آنسو بہانے کے نہیں آنسو پینے اور پی کر مسکرانے کے قائل ہیں۔انھوں نے غم کو اس کی عظمتوں کے ساتھ سمجھنے کی کوشش کی ہے۔اسی لیے ان کے ہاں عزم عمل کی فضا ملتی ہے اور جذبہ واحساس کا ہر مثبت پہلو نمایاں ہے۔یہ قابل کی غزل کا ایک خاص رخ ہے۔

جی رہا ہوں اس اعتماد کے ساتھ ‏ ‏ ‏ زندگی کو میری ضرورت ہے
ہجرت کی رات ہو کہ صبح نشاط ‏ ‏ ‏ زندگی زندگی ہی رہتی ہے
کبھی تم نے بھی آواز شکست دل سنی ہوتی ‏ ‏ ‏ یہ وہ نغمہ ہے جس پر زندگی رقص کرتی ہے

ایک اور بات جو قاری غزل کے شاعر کے بارے میں جاننا چاہتا ہے وہ شاعر کا مذاق جمالیات ہے۔دوسرے الفاظ میں یوں سمجھئے کہ ہم غزل گو کے اس نقطہ نظر کو بھی جاننا چاہتے ہیں جو حسن و جمال یا محبوب سے متعلق ہے۔غزل کے ہر شاعر کے ہاں اس کا اپنا مذاق جمالیات زیادہ سے زیادہ ہوتا ہے۔شاعر کا احساس حسن ہی بڑی حد تک غزل کو وہ رنگ دیتا ہے جسے ہم تغزل، غزلیت یا شعریت کہتے ہیں۔یہ اشعار دیکھئے ان میں بیان حسن بھی ہے اور حسن بیان بھی ان سے قابل کی غزل کا وہ رخ بھی سامنے آتا ہے جسے جمالیاتی رخ بھی کہہ سکتے ہیں۔

حسن کرتاہے چہرہ ماہ سے چھیڑ آنکھ لیکن جھکی ہی رہتی ہے
دل کی دھڑکن کا اعتبار نہیں ورنہ آواز تو تمھاری ہے
نگاہ دوست نے بخشی ہیں سرفرزیاں کیا کیا حوصلے آگ کو گلزار بنادیتے ہیں

میں نے شروع میں عرض کیا تھا کہ قابل نے محض دس بارہ سال کی مشق سخن سے اپنی غزل میں وہ بات پیدا کرلی جو نصف صدی کی مشق سے پہلے ممکن نہیں ہوتی۔ اسے آپ شاید مبالغہ سمجھیں گے مگر میں سمجھتا ہوں کہ میری بات مبالغہ آمیز نہیں۔ میں یہاں آخر میں قابل کے چند منتخب اشعار پیش کرتا ہوں جنھیں پڑھ کر آپ خود اندازہ لگا سکیں گے کہ ان میں کیا کچھ ہے اور یہ بھی اس لیے کہ شعر کہنے والا اپنا کوئی مقام دیرینہ رکھتا بھی ہے یا نہیں۔ ان اشعار پر نگاہ ڈالنے سے پہلے یہی بات خاص طور پر سامنے رکھنے کی ہے کہ یہ اس شاعر کے اشعار ہیں جو دس بارہ سال سے زیادہ شعر گوئی کی مدت نہیں پا سکا۔

جیسے ہم جان ہی نہیں رکھتے موت کا اضطراب تو دیکھو
راستہ ہے کہ کٹتا جاتا ہے فاصلہ ہے کہ کم نہیں ہوتا
نہ جانے زندگی کیسے گزر گئی اے دوست کہیں ٹھہر کے ترا انتظار بھی نہ کیا
کون یاد آگیا اذان کے وقت بجھتا جاتا ہے دل چراغ جیسے
آ ہی جائے گی اسیرانِ قفس تک اک روز نکہت گل کہیں پابند چمن ہوتی ہے
مقامات فکر و نظر کون سمجھے یہاں لوگ نقش قدم دیکھتے ہیں
آپ اپنے رقیب ہوئے ہیں اہل دل بھی عجیب ہوتے ہیں
لطف لیتا ہے مگر شکوہ سرا ہوتا ہے شوق احسان فراموش جفا ہوتا ہے

☆☆☆

مسلسل ۷ برسوں سے ممبئی سے شائع ہونے والا اردو کا بے باک اخبار

ہفت روزہ
سیرت

مذہبی، سماجی، تعلیمی اور سیاسی قائدینِ قوم کی حقیقتوں کو بے نقاب کرنا جس کا مشن ہے

ایڈیٹر: **معین الدین شیخ اجمیری**

زرِ سالانہ: ۲۰۰/روپئے تاعمر خریداری: ۲۵۰۰/روپئے

رابطہ: 144, Maulana Shaukat Ali Road, 79, Imperial Building Compund,

Two Tank, Mumbai-400008. Ph: 09322672230

حیات قابل اجمیری

قابلؔ محفل شعروسخن میں ایک تابندہ ستارہ بن کراُ بھرا مگر جلد ہی عدم کی ظلمتوں میں ڈوب گیا۔اگر چہ ملک کا یہ ممتاز شاعر دنیا کی محفل سے اٹھ گیا مگر ہمارے لیے اپنی شاعری کے جواہر پارے اوراپنی زندگی کے اُن دکھوں کی یاد چھوڑ گیا جنھوں نے عمر طبعی سے بہت پہلے ہمارے متعدد جواں سال شاعروں کی زندگی میں ختم کر دیا اورکرتے رہیں گے۔

قابلؔ کی زندگی امنگوں،حوصلوں سے بھرپور شروع ہوئی اورمحرومیوں،مایوسیوں میں گھر کرختم ہوگئی۔ وہ زندگی کوروشن سے روشن تر دیکھنے کی تمنائیں پالتارہااوراس کی اپنی زندگی آہستہ آہستہ تاریک سے تاریک تر ہوتی چلی گئی۔اس نے اردوشاعری کوتخلیقی قوتوں کا قیمتی سرمایہ سونپا،اپنا خون جگر پلایا۔ایسے نادرخیالات سےنوازے جن میں غمِ روزگار کے باوجود،مستقبل کوسنوارنے کی اُمنگیں ہیں۔حسن ہے،نفاست وسادگی ہے۔مگرزندگی نے اُسے پریشانیاں،پشیمانیاں،الجھنیں اوربے چینیاں دیں۔وہ زندگی سے محبت مانگتا رہا،مسرت،سکون اورآسودگی چاہتا رہامگرزندگی اس سے رفتہ رفتہ دور کھنچتی چلی گئی،یہاں تک کہ سبزہ زارزندگی کواپنے خون جگر سے سینچنے والا یہ شاعربے مایہ آخرکشمکش حیات سے تنگ آکرموت کی آغوش میں جاسویا۔

قابلؔ جن کااصل نام عبدالرحیم تھا۔ہندوستان کے ضلع اجمیر کے قصبہ چرّلی میں 27اگست 1931 کو پیدا ہوئے۔ابھی موصوف صرف سات سال کے تھے کہ والدین کے سایہ عاطف سے محروم ہوگئے۔یہ ان کی زندگی کا پہلاالمناک سانحہ تھا۔دوسراسانحہ جس نے ان کی زندگی میں زہرگھول دیادق کا جان لیوامرض تھا جوانھیں چھٹپن میں والدین کی طرف سے ملا۔ان کے والدعبدالکریم اوران کی والدہ دونوں دق کے مرض میں مبتلا تھے۔

ان کے والد تقسیم ہند سے قبل تعمیرات کی ٹھیکیداری کا کام کرتے تھے۔موصوف بہت فرض شناس تھے۔ اس لئے خود تیز اورجھلستی ہوئی دھوپ میں گھنٹوں کھڑے رہ کرتعمیری کام کی نگرانی کرتے تھے۔چنانچہ اس مسلسل اور صبر آزمانگہداشت کی وجہ سے ان کے کمزورجسم پرانتہائی مضراثرات پڑے۔یہاں تک کے وہ دق کے مرض میں

مبتلا ہو گئے۔ اُن پر دق کا پہلا حملہ 1932 میں ہوا جب قابل کی عمر صرف ایک سال تھی۔ یہ مرض اس تیزی سے بڑھا کہ 1938 میں ان کا اجمیر کے لونگیہ ہسپتال میں انتقال ہو گیا۔ اس صدمہ سے قابلؔ کی والدہ اس قدر نڈھال ہوئیں کہ وہ بھی چند دنوں کے بعد اس دار فانی سے رخصت ہو گئیں۔ 1937 میں قابلؔ کے چھوٹے بھائی شریف بھی دق کے مرض میں چل بسے۔ والدین کے انتقال کے بعد ان کے دادا امیر بخش صاحب نے ان کی پرورش کی۔

قابلؔ اجمیر شریف کے پیزادہ خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ اس خاندان کے افراد پٹھان سلطنت کے دور میں یہاں آباد ہوئے تھے۔ اس زمانے میں اس خاندان کے بیشتر افراد اعلیٰ فوجی عہدوں پر فائز تھے۔ انھیں اعلیٰ خدمات کے صلہ میں حکومت کی طرف سے اجمیر شہر کے قرب وجوار میں بڑی بڑی جاگیریں ملی تھیں مگر امتداد زمانہ اور گردشِ حالات کی وجہ سے یہ جاگریں ختم ہو گئیں اور جب قابلؔ نے جنم لیا تو ان کے والدین کے حصہ میں صرف دو مکانات آئے، ایک پختہ مکان ترپولیا گیٹ کے اندر محلّہ اندر کوٹ میں تھا۔ دوسرا اجمیر کے قصبہ چرلی میں واقعہ تھا۔ قسمت کی ستم ظرفی دیکھئے کہ پاکستان میں قابلؔ کو ان میں سے کسی مکان کا معاوضہ نہیں ملا۔

علمی اور رُوحانی ماحول

قابلؔ اس لحاظ سے انتہائی خوش قسمت تھے کہ انھیں اپنے محلے کے گرد و پیش سازگار تعلیمی ماحول ملا۔ ان کی رہائش گاہ کے صدر دروازہ کے کچھ فاصلے پر ڈھائی دن کے جھونپڑے کی وہ عظیم الشان مسجد تھی جسے سلطان شہاب الدین غوری نے تعمیر کروایا تھا۔ اس مسجد میں سلطان نے دینی تعلیم کے لیے ایک مثالی اور معیاری درس گاہ کا بھی اہتمام کیا تھا۔ مکان کے عقبی دروازے کے سامنے خواجہ معین الدین چشتیؒ کی وہ عظیم الشان درگاہ تھی جس میں جامعہ شاہجہانی اور مدرسہ نظامیہ جیسے بلند پایہ تعلیمی ادارے علم کی روشنی پھیلا رہے تھے۔ مدرسہ نظامیہ کے اساتذہ ایسے بلند پایہ اور جید علماء پر مشتمل تھے جنھیں نظام دکن نے ملک کے طول وعرض سے منتخب کیا تھا۔ قابلؔ نے اپنا بچپن اسی درگاہ شریف کے علمی، ادبی اور روحانی ماحول میں گذارا، عرس شریف کے قیام میں عالم اسلام کم وبیش تمام مشاہیر شخصیات، علماء اور صوفیائے کرام تشریف لاتے تھے۔ جن کی علمی اور روحانی صحبت سے بے شمار لوگ فیضیاب ہوتے تھے، درگاہ کے مناظر انتہائی روح پرور تھے۔ کہیں قرأت کی دل نشیں صدائیں بلند ہو رہی ہیں، کہیں علمی خطابت کا مظاہرہ ہو رہا ہے تو کہیں محفل سماع کی ترنم ریز نغمگی دلوں کو گرما رہی ہے، قابلؔ کا بچپن اس موحول سے بے حد متاثر ہوا۔

درگاہ معلّیٰ کے اسی ماحول میں ان کے کان شہرۂ آفاق قوالوں، نغمہ نوازوں کی صداؤں اور شاعروں کے کلام سے آشنا ہوئے۔ وہ گھر میں بیٹھے بیٹھے داغؔ کی غزلیں، بےدمؔ کی نعتیں، سعدیؔ و حافظؔ شیرازی اور حضرت غوثؔ اعظم اور حضرت امیر خسروؔ کا روح پرور صوفیانہ کلام سنتے رہتے تھے۔ بڑے بڑے شعراء کا کلام ان کو سنتے سنتے حفظ ہو گیا تھا اور وہ متاثر ہو کر قوالی کی لہن میں اکثر اوقات ان اشعار کو دہراتے رہتے تھے۔ اور اپنے دادا، دادی کو سنایا کرتے تھے۔ یہ وہ ابتدائی اثرات تھے جو آگے چل کر ان کی شاعری کا جزو اعظم بن گئے۔ ان کی شاعری میں جو غنائیت اور ترنم کے خواص بدرجہ اتم پائے جاتے ہیں ان کی اصل وجہ قوالیاں، نعتیں اور اشعار کی وہ ترنم ریز صدائیں

تھیں جو ہمیشہ ان کے کانوں میں گونجتی رہتی تھیں۔

بچپن میں ان کی زندگی پر ایک ایسی بلند پایہ شخصیت اثر انداز ہوئی جس کی بدولت انھیں تحصیل علم کا بے پناہ شوق پیدا ہوا۔ یہ شخصیت عبدالرحمٰن عرب کی تھی جو جامعہ ازہر کے فارغ التحصیل عالم و خطیب تھے۔ ان کی متعدد تصانیف عالم اسلام کی تمام دینی درسگاہوں میں رائج تھیں۔ جب مدرسہ نظامیہ کی تشکیل علم میں آئی تو نظام دکن نے عبدالرحمٰن عرب صاحب کو عراق سے بلوا کر اس مدرسہ میں بحیثیت مدرس متعین کیا۔ جب ان کا تقرر ہوا تو قابلؔ کے دادا نے اپنے مکان کا بلائی حصہ عرب صاحب کو دے دیا۔ جب عرب صاحب سودا سلف خریدنے جاتے تو قابلؔ صاحب کو سیر کے لیے لے جاتے۔ قابلؔ اکثر و بیشتر ان کے ساتھ درس گاہ بھی چلے جاتے تھے۔ اس طرح قابلؔ نہ صرف ستھرے تعلیمی ماحول سے آشنا ہوئے بلکہ عرب صاحب کی شخصیت سے بے پناہ متاثر ہوئے۔

درگاہ شریف اجمیر کے مدرسہ نظامیہ میں انھوں نے ابتدائی تعلیم حاصل کی 6 سال کی عمر میں انھوں نے بغدادی قاعدہ ختم کرلیا۔ اس درگاہ کے ابتدائی مدارج کے قابل استادوں یعنی مولانا محمد ادریس صاحب اور مولانا محمد یونس صاحب کی تربیت میں قابل نے دس سال کی عمر میں صرفِ ونحو پر عبور حاصل کرنے بعد شیخ سعدی کی گلستان بوستان ختم کر لی۔ 13 سال کی عمر میں وہ مدرسہ نظامیہ کے ثانی درجوں کی تعلیمات مکمل کر چکے تھے۔ اس زمانے میں ایک خاص واقعہ رونما ہوا جس کی بدولت ان کی طبیعت شاعری کی طرف مائل ہوئی۔ یہ 1940 کا ذکر ہے کہ ایک بزرگ پر سجادہ نشین صاحب کی سالانہ محفل سماع میں امجذاب کی اس قدر کیفیت طاری ہوئی کہ محفل ختم ہونے کے بعد بھی ان پر وجد قائم رہا۔ جب سب لوگ چلے گئے تو قابلؔ اور ان کے دوست معلوم کر کے موصوف کو ان کے گھر چھوڑنے چلے گئے۔ وہاں معلوم ہوا کہ یہ بزرگ ارمان اجمیری تھے۔ جب ان کو ہوش آیا تو انھوں نے قابلؔ کو سینہ سے لگالیا۔ ارمان صاحب اس بزرگانہ شفقت اور اس خلوص سے پیش آئے کہ قابلؔ نے مستقلاً ان کے پاس آنا جانا شروع کردیا۔ ارمان صاحب خود اچھے شاعر تھے چنانچہ ان کی شاعری نے قابلؔ کو اتنا متاثر کیا کہ وہ غزلیں کہنے لگے۔ جب ارمان صاحب کو معلوم ہوا کہ قابلؔ غزلیں کہنے لگا ہے تو وہ کمال توجہ سے ان کی غزلوں کی اصلاح کرنے لگے۔ بزم ارمان کے تحت جو ہفتہ وار اور سالانہ مشاعرے منعقد ہوا کرتے تھے ان کا قابلؔ کی شاعرانہ طبیعت پر خوشگوار اثر پڑا۔ ارمان صاحب سے فیض یاب ہونے کے بعد قابلؔ نے ایک دوسری عظیم شخصیت مولانا عبدالباری معینی صاحب سے رجوع کیا۔ مولانا معینی عربی کے جید عالم اور تفسیر حدیث کے بلند پایہ محقق تھے۔ آپ حیدرآباد دکن میں عربی ادبیات اور تاریخ کے ایک ممتاز پروفیسر تھے۔ جب مولانا اجمیر شریف تشریف لائے تو انجمن ترقی اردو کا دفتر قائم ہوا۔ جس کے آپ صدر بنائے گئے۔ قابل کے ایک دوست جناب پیکر واسطی صاحب کے توسط سے مولانا نے قابلؔ کو اپنے حلقہ تلامذہ میں شامل کرلیا۔ مولانا کے فیض صحبت سے قابل کی شاعری کو حیات نو ملی۔ مولانا کی اصلاح کی بدولت قابل کے کلام میں رفتہ رفتہ پختگی آتی گئی۔ مولانا کی معیت میں قابل نے پہلی دفعہ آل انڈیا مشاعرے میں شرکت کی۔ اس مشاعرے میں ہندوستان کے مشہور شعراء موجود تھے۔ جن میں جگر مرادآبادی، ماہر القادری، حفیظ جالندھری، ساغر نظامی، سیمابؔ اکبرآبادی قابلِ ذکر ہیں۔ یہ مشاعرہ معینہ اسلامیہ ہائی اسکول کے احاطہ میں منعقد ہوا اور اس مشاعرے ہی سے قابلؔ کی شخصیت پہلی بار منظر عام پر آئی۔ ان کے کلام پر استاد شعراء نے اس قدر دادو تحسین کا فراخ دلی مظاہرہ کیا کہ قابلؔ کو ایک شاعر کی حیثیت سے تسلیم کرلیا گیا۔ ☆☆☆

انتخاب

قابل اجمیری

تم نہ مانو مگر حقیقت ہے
عشق انسان کی ضرورت ہے

کچھ تو دل مبتلائے وحشت ہے
کچھ تری یاد بھی قیامت ہے

میرے محبوب مجھ سے جھوٹ نہ بول
جھوٹ صورت گر صداقت ہے

جی رہا ہوں اس اعتماد کے ساتھ
زندگی کو مری ضرورت ہے

حُسن ہی حُسن جلوے ہی جلوے
صرف احساس کی ضرورت ہے

اُس کے وعدے پہ ناز تھے کیا کیا
اب در و بام سے ندامت ہے

اس کی محفل میں بیٹھ کر دیکھو
زندگی کتنی خوبصورت ہے

راستہ کٹ ہی جائے گا قابلؔ
شوقِ منزل اگر سلامت ہے

قابل اجمیری

حیرتوں کے سلسلے سوزِ نہاں تک آ گئے
ہم نظر تک چاہتے تھے تم تو جاں تک آ گئے

نامرادی اپنی قسمت ، گمرہی اپنا نصیب
کارواں کی خیر ہو ہم کارواں تک آ گئے

ان کی پلکوں پر ستارے اپنے ہونٹوں پر ہنسی
قصہ غم کہتے کہتے ہم کہاں تک آ گئے

اپنی اپنی جستجو ہے اپنا اپنا شوق ہے
تم ہنسی تک بھی نہ پہنچے ہم فغاں تک آ گئے

زلف میں خوشبو نہ تھی یا رنگ عارض میں نہ تھا
آپ کس کی آرزو میں گلستاں تک آ گئے

رفتہ رفتہ رنگ لایا جذبۂ خاموشِ عشق
وہ تغافل کرتے کرتے امتحاں تک آ گئے

خود تمھیں چاکِ گریباں کا شعور آ جائے گا
تم وہاں تک آ تو جاؤ ہم جہاں تک آ گئے

آج قابلؔ میکدے میں انقلاب آنے کو ہے
اہلِ دل اندیشۂ سود و زیاں تک آ گئے

قابل اجمیری

آسودگیِ شوق کا ساماں نہ کر سکے
جلوے مری نگاہ پہ احساں نہ کر سکے

تم نے مسرتوں کے خزانے لٹا دیئے
لیکن علاجِ تنگیٔ داماں نہ کر سکے

آنکھوں سے ٹوٹتے رہے تارے تمام رات
لیکن کسی کو زینتِ داماں نہ کر سکے

شائستۂ نشاطِ ملامت کہاں تھے ہم
اچھا ہوا کہ چاک گریباں نہ کر سکے

اک والہانہ شان سے بڑھتے چلے گئے
ہم امتیازِ ساحل و طوفاں نہ کر سکے

ہم جانِ رنگ و بو ہیں گلستاں ہمیں سے ہے
یہ اور بات خود کو نمایاں نہ کر سکے

کچھ اس طرح گزر گیا طوفانِ رنگ و بو
غنچے بہار سے کوئی پیماں نہ کر سکے

ہر صبح جاگتا ہوں نئی آرزو کے ساتھ
غم مجھ کو زندگی سے گریزاں نہ کر سکے

قابلؔ فراقِ دوست میں دل بجھ کے رہ گیا
جینے کے حوصلے بھی فروزاں نہ کر سکے

قابل اجمیری

بہاروں کا فسوں ٹوٹا گلستانوں کی نیند آئی
خزاں آئی کہ تیرے چاک دامانوں کو نیند آئی

سُنے کوئی تو ساحل کا سکوت اب بھی سناتا ہے
ہمیں خاموش کر کے کتنے طوفانوں کو نیند آئی

ترے ہی حسن کی تابانیوں میں آنکھ کھولی تھی
تری ہی زلف کے سائے میں ارمانوں کو نیند آئی

یہ اہل بزم کیا خود شمع بھی محروم ہے اس سے
سکونِ دل کے جس عالم میں پروانوں کو نیند آئی

جنوں محوِ تجسس ہے خرد آواز دیتی ہے
نہ جانے کون سے عالم میں دیوانوں کو نیند آئی

ہمارے ساتھ ساری بزم بے آرام ہے ساقی
صراحی کو سکوں آیا نہ پیمانوں کو نیند آئی

زمانہ دیکھ لے گا اور تھوڑی دیر باقی ہے
ہمیں نیند آ گئی قابلؔ کے طوفانوں کو نیند آئی

قابل اجمیری

نئے چراغ لئے شامِ بیکسی آئی
کہ دل بجھا تو ستاروں میں روشنی آئی

جنونِ شوق نے پہنچا دیا کہاں مجھ کو
نگاہِ دوست بھی اکثر تھکی تھکی آئی

ہمارے پاس کہاں آنسوؤں کی سوغاتیں
کسی کو اپنا بناکے بڑی ہنسی آئی

جہانِ دار و رسن ہو کہ بزمِ شعر و شراب
ہمارے سامنے اپنی ہی زندگی آئی

تمھاری یاد کو آرامِ جاں بنایا تھا
تمھاری یاد بھی لیکن کبھی کبھی آئی

ہزار رنگ دیئے جس نے زندگانی کو
اُسی نظر سے محبت میں سادگی آئی

مِرے خلوص کا عالم نہ پوچھئے قابلؔ
شکستِ جام سے آوازِ زندگی آئی

قابل اجمیری

اعتبار نگاہ کر بیٹھے
کتنے جلوے تباہ کر بیٹھے

آپ کا سنگِ در نہیں چمکا
ہم جبینیں سیاہ کر بیٹھے

موت پر مسکرانے آئے تھے
زندگانی تباہ کر بیٹھے

شمعِ امید کے اُجالے میں
کتنی راتیں سیاہ کر بیٹھے

صرف عذرِ گناہ ہو نہ سکا
ورنہ سارے گناہ کر بیٹھے

کِس توقع پہ اہل دل قابلؔ
زندگی سے نباہ کر بیٹھے

قابل اجمیری

ہم تِری رہگزر میں رہتے ہیں
دونوں عالَم نظر میں رہتے ہیں

تیرے در کا طواف کر کے بھی
فکرِ شام و سحر میں رہتے ہیں

زندگانی کے سب نشیب و فراز
حلقہ چشمِ تر میں رہتے ہیں

کتنے شعلے سکونِ جاں بن کر
نرگسِ بے خبَر میں رہتے ہیں

ڈھونڈنے پر کہاں ملیں گے ہم
راہرو ہیں سفر میں رہتے ہیں

لاکھ ہم خانماں خراب سہی
حادثوں کی نظر میں رہتے ہیں

ایک دن پوچھتی پھرے گی حیات
اہلِ دل کِس نگر میں رہتے ہیں!

منزلِ زیست کی کشش مت پوچھ
راستے بھی سفر میں رہتے ہیں

صاحبِ درد ہو کے ہم قابلؔ
کوچۂ چارہ گر میں رہتے ہیں

قابل اجمیری

آپ اپنے رقیب ہوتے ہیں
اہلِ دل بھی عجیب ہوتے ہیں

ہجر کی پُرخلوص راتوں میں
آپ کتنے قریب ہوتے ہیں

راحتوں سے گریز، غم سے فَرار
بعض لمحے عجیب ہوتے ہیں

تم جنھیں عُمر بھر نہیں ملتے
وہ بڑے خوش نصیب ہوتے ہیں

اہلِ دانش کے قافلے گمُ راہ
منزلوں کے قریب ہوتے ہیں

گردشیں رک گئیں زمَانے کی
آج دو دل قریب ہوتے ہیں

اُس کے طرزِ کلام سے قابلؔ
کتنے وحشی ادیب ہوتے ہیں

قابل اجمیری

وہی اضطراب فراق ہے وہی اشتیاقِ وصال ہے
تری جستجو میں جو حال تھا تجھے پا کے بھی وہی حال ہے

نہ مآلِ زیست کی فکر ہے نہ تباہیوں کا خیال ہے
مجھے صرف اس کا ملال ہے کہ تمھیں بھی میرا ملال ہے

تری آرزو ہی کا فیض ہے تیری یاد ہی کا کمال ہے
کبھی مجھ کو تیرا خیال تھا مگر آج اپنا خیال ہے

نہیں کوئی راہ نما تو کیا ہے خلاف ساری فضا تو کیا
مجھے فکرِ سو دو زیاں ہو کیوں تری یاد شاملِ حال ہے

ہے جنونِ شوق عجب جنوں نہ خلش خلش نہ سکوں سکوں
کبھی خار وجہِ نشاط ہے کبھی پھول وجہِ ملال ہے

مرا حال آج زبوں ہے کیوں مرا درد آج فزوں ہے کیوں
مرے مہرباں مرے چارہ گر تیری آبرو کا سوال ہے

قابل اجمیری

تضادِ جذبات میں یہ نازک مقام آیا تو کیا کرو گے
میں رو رہا ہوں تو ہنس رہے ہو میں مسکرایا تو کیا کرو گے

مجھے تو اس درجہ وقتِ رخصت سکوں کی تلقین کر رہے ہو
مگر کچھ اپنے لیے بھی سوچا میں یاد آیا تو کیا کرو گے

کچھ اپنے دل پر بھی زخم کھاؤ مرے لہو کی بہار کب تک
مجھے سہارا بنانے والو میں لڑکھڑایا تو کیا کرو گے

تمھارے جلووں کی روشنی میں نظر کی حیرانیاں مُسلّم
مگر کسی نے نظر کے بدلے دل آزمایا تو کیا کرو گے

اتر تو سکتے ہو پار لیکن مآل پر بھی نگاہ کر لو
خدا نہ کردہ سکونِ ساحل نہ راس آیا تو کیا کرو گے

ابھی تو تنقید ہو رہی ہے مرے مذاقِ جنوں پہ لیکن
تمھاری زلفوں کی برہمی کا سوال آیا تو کیا کرو گے

ابھی تو دامن چھڑا رہے ہو، بگڑ کے قابلؔ سے جا رہے ہو
مگر کبھی دل کی دھڑکنوں میں شریک پایا تو کیا کرو گے

قابل اجمیری

ترے دیار میں ہم سر جھکائے پھرتے ہیں
نگاہِ ناز کے احساں اٹھائے پھرتے ہیں

کسی کی زلف پریشاں کسی کا دامن چاک
جنوں کو لوگ تماشا بنائے پھرتے ہیں

خیالِ منزل جاناں تری دہائی ہے
ابھی نگاہ میں اپنے پرائے پھرتے ہیں

قدم قدم پہ لیا انتقام دنیا نے!
تجھی کو جیسے گلے سے لگائے پھرتے ہیں

تمھیں خبر بھی ہے یارو کہ دشتِ غربت میں
ہم آپ اپنا جنازہ اٹھائے پھرتے ہیں

نئی سحر کے اجالے بھی اجنبی نکلے!
نگاہِ شوق سے دامن بچائے پھرتے ہیں

جہاں میں آج اندھیروں کا بول بالا ہے
ہم آستیں میں ستارے چھپائے پھرتے ہیں

فراقِ دوست سلامت کہ اہلِ دِل قابلؔ
نفس نفس کو زمانہ بنائے پھرتے ہیں

قابل اجمیری

کوئے قاتل میں ہمیں بڑھ کے صدا دیتے ہیں
زندگی آج ترا قرض چُکا دیتے ہیں

حادثے زیست کی توقیر بڑھا دیتے ہیں
اے غمِ یار تجھے ہم تو دعا دیتے ہیں

کوئے محبوب سے چپ چاپ گزرنے والے
عرصہ زیست میں اِک حشر اٹھا دیتے ہیں

تیرے اخلاص کے افسوں ترے وعدوں کے طلسم
ٹوٹ جاتے ہیں تو کچھ اور مزہ دیتے ہیں

ہاں یہی خاک بسر سوختہ ساماں اے دوست
تیرے قدموں میں ستاروں کو جھکا دیتے ہیں

سینہ چاکانِ محبت کو خبر ہے کہ نہیں
شہرِ خوباں کے در و بام صدا دیتے ہیں

ہم نے اُس کے لب و رخسار کو چھو کر دیکھا
حوصلے آگ کو گلزار بنا دیتے ہیں

چینوا اچے بے

چینوا اچے بے 16/نومبر 1930 کو نائجیریا میں پیدا ہوئے۔ اپنے پہلے ناول Things Fall Apart (1958) سے ہی شہرت کی بلندیوں پر پہنچ گئے۔ یہ ناول جدید افریقی ادب میں سب سے زیادہ پڑھا جانے والا ناول تھا۔ شروعاتی دنوں میں اچے بے ریڈیو سے منسلک رہے پھر سیاست میں سرگرمی سے حصّہ لیا لیکن سیاست میں تشدد اور بدعنوانی کے بڑھتے رجحان کو دیکھ کر وہ سیاست سے کنارہ کش ہو گئے اور 1990 میں وہ مستقل طور پر امریکہ منتقل ہو کر درس وتدریس کے پیشے سے منسلک ہو گئے۔

ان کا ایک اور کارنامہ جس نے ان کی بین الاقوامی شہرت کو استحکام بخشا An Image of Africa: Racism in Conrad's "Heart of Darkness" ہے۔ جوزف کونارڈ کے ناول کا تنقیدی مطالعہ ان کی تحقیق کا موضوع تھا۔ انھوں نے جوزف کونارڈ کے ناولوں میں نسلی تعصب کے رویہ کی نشاندہی کر کے ایک نئے تنازعہ کو جنم دیا۔

اچے بے نے پانچ ناول، آٹھ افسانوی مجموعے، چھ شعری مجموعے، آٹھ غیر افسانوی نثری کتابیں اور بچوں کے لیے چار کتابیں تحریر کی ہیں۔

انگریزی سے ترجمہ: قمر صدیقی

دن میرا زمانہ ہے اور رات آج کا دور ہے

روجر باوین: میں نے حال ہی میں واشنگٹن میں دو بار ٹیکسی لی اور ڈرائیوروں سے پوچھا کہ وہ کس ملک سے تعلق رکھتے ہیں۔ دونوں نے نائیجیریا کا ہی نام لیا۔ میں نے ان سے چینوا اچے بے کے بارے میں پوچھا تو دونوں نے بتایا کہ وہ ہمارے قومی ہیرو ہیں۔ ان سے آپ کی تحریروں کی بابت پوچھا تو انھوں نے آپ کے ناولوں کے نام بتائے۔ اس سے آپ کی تحریروں کے تئیں لوگوں کا احترام ظاہر ہوتا ہے۔ وہ آپ کو ایک بڑے مفکر کے طور پر دیکھتے ہیں۔ اس طرح دیکھیں تو نائیجیریا سے آپ کی گہری وابستگی ظاہر ہوتی ہے۔ حالیہ دنوں میں وہاں جو کچھ ہو رہا ہے اس پر آپ کا کیا ردعمل ہے؟

چینوا اچے بے: اوہ، جی ہاں! ابھی حال ہی میں، میں نے نائیجیریا حکومت کے ذریعے دیا جانے والا قومی اعزاز ٹھکرا دیا۔ حالانکہ مسئلہ کھڑا ہوا لیکن اس اعزاز کو ٹھکرانے کا میں جواز رکھتا ہوں۔ نائیجیریا میں حکومت جن لوگوں کے ہاتھوں میں ہے وہ ملک کو زوال کی طرف لے جا رہے ہیں۔ میں اس صورتِ حال سے خوش نہیں تھا۔ آخر میں بے ایمان، بدعنوان اور ٹھگوں کے ہاتھوں سے دیا گیا کوئی اعزاز کیسے قبول کر سکتا ہوں؟

روجر باوین: کیا حکومت بدعنوانی سے صرفِ نظر کرتی ہے؟ یا خود بھی شامل ہے؟

چینوا اچے بے: یہ بھی درست ہے کہ حکومت آنکھیں بند رکھتی ہے۔ اور یہ بھی کہ میں اعلانیہ کہتا ہوں کہ حکومت بھی بدعنوانی میں شامل ہے۔ یہ سب ٹھگ ہیں۔

روجر باوین: کیا صدر Obasanjo بھی شامل ہیں؟

چینوا اچے بے: جی ہاں! وہ بھی اس گھناونے عمل میں شامل ہیں۔ وہ اس گھناونے عمل کو روک سکتے تھے لیکن وہ بھی اس میں ملوث ہو گئے۔ جب وہ 1999 میں اقتدار میں آئے تو لوگوں نے ان پر بھروسہ کیا۔ لیکن انھوں نے نائجیریا اور وہاں کی عوام کی ساتھ وشواس گھات کیا۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے قومی اعزاز کو ٹھکرا دیا۔

روجر باوین: اس طرح کے ماحول میں یہ سوال بھی اہم ہے کہ کیا نائیجیریا میں تعلیمی آزادی حاصل ہے؟ میرا مطلب یہ ہے کہ کیا وہاں یونیورسٹیاں سرکاری مداخلت کے بغیر آزادانہ کام کر رہی ہیں؟

چینوا اچے بے: یقیناً ہمیں اس سوال سے آنکھیں چار کرنی چاہئے۔ وہاں کسی حد تک آزادی ہے لیکن یہ

کافی نہیں ہے۔ ہروقت سرکاری مداخلت کا خطرہ موجود ہے۔ اور پھر وہاں غربت ہے۔ وہ لوگ اساتذہ کے تنخواہوں کی ادائیگی نہیں کر پا رہے ہیں۔ طلبہ ہڑتال پر ہیں، یا اکثر رہتے ہیں۔ لمبے لمبے عرصے کے لیے یونیورسٹیاں بند رہتی ہیں۔ ایسے حالات میں کوئی تعلیمی آزادی کی بات کیسے تسلیم کرسکتا ہے؟

روجر باوین :اگر نائیجیریا کی کسی یونیورسٹی میں پولیٹیکل سائنس کی تعلیم دیتے ہوئے میں طالب علموں سے یہ کہوں کہ نائیجیریا میں جمہوریت پسماندہ ہے تو کیا مجھے اپنی نوکری گنوانی پڑسکتی ہے؟

چینوا اچیے بے :نہیں۔ کسی زمانے میں ایسا ہوسکتا تھا۔ ویسے بھی ملکی حالات اور غریبی کی بنا پر اساتذہ ملک سے ہجرت کرنے پر مجبور ہیں۔ نائیجیریا کے کئی ماہرین تعلیم نے اب یورپ کو اپنا مسکن بنالیا ہے۔

روجر باوین :آپ یہ کہنا چاہ رہے ہیں کہ نائیجیریا کے کئی دانشور یورپ اور امریکہ کی طرف ہجرت کر رہے ہیں کیونکہ وہ اپنے پیشے کے تئیں زیادہ ایماندار اور آزادی کے خواہش مند ہیں۔

چینوا اچیے بے :جی ہاں! وہ بھوکے ہیں۔ ان کی تنخواہوں کی ادائیگی نہیں ہو پا رہی ہے اور وہ کام کرنے کے لیے بہتر ماحول کے متلاشی ہیں۔

روجر باوین: برطانوی سامراج کے آخری دنوں میں نائیجیریائی یونیورسٹی میں پڑھتے ہوئے کیا کبھی آپ نے محسوس کیا کہ آپ کے اساتذہ برطانوی سامراج سے بے خوف ہوکر اپنی بات پیش کر سکتے ہیں؟

چینوا اچیے بے :ایک حدتک میرا جواب اثبات میں ہوگا۔ کچھ اساتذہ نے مجھے واقعی متاثر کیا۔ ان میں ایک دینیات کے پروفیسر تھے۔ انھوں نے بغیر کسی مصنوعی پن کے دوٹوک الفاظ میں کہا تھا کہ تمھیں کیا سیکھنا ہے اور تمھاری ضروریات کیا ہیں؟ یہ تم پر منحصر ہے۔ ہم تم کو وہی پڑھا سکتے ہیں جو ہم جانتے ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ یہ واقعی بہت حوصلے کی اور اچھی بات ہے۔

روجر باوین: آپ کو کس طرح احساس ہوا کہ آپ ایک مصنف ہیں؟

چینوا اچیے بے :مجھے اس کا احساس تھا کہ میرے اندر کہانی ہے۔ ضرورت اس کہانی کو، اس آگ کو، اس احساس کو باہر لانے کی تھی۔ لیکن اس کی کوئی شکل وصورت میرے سامنے نہیں تھی۔ پھر کسی نہ کسی طرح میں نے اسے دریافت کرلیا۔ میرے اساتذہ نے مجھے ڈکنس اور ہارڈی کے بارے میں پڑھایا تھا لیکن یہ نہیں سکھایا تھا کہ ایک افریقی ناول کس طرح لکھا جاتا ہے۔

روجر باوین: آپ کا مشہور ناول Things fall Apart شیکسپیئر سے متاثر ہے۔

چینوا اچیے بے : بلکہ Yeats سے۔

روجر باوین: آپ نے Yeats کو پڑھا ہے۔

چینوا اچیے بے :جی ہاں! میں نے پڑھا ہے۔

روجر باوین :Things fall Apart یہ عنوان ناول لکھنے سے پہلے آپ کے ذہن میں آیا تھا یا آپ نے اسے ناول تحریر کرنے کے بعد تجویز کیا تھا؟

چینوا اچیے بے :تم جانتے ہو۔ یہ مجھے ناول تحریر کرنے کے دوران سوجھا۔ Yeats کی نظموں نے مجھے اس کی تحریک دی تھی جب پہلے پہل میں نے انھیں پڑھا تھا۔ یہ بہت گہرائی وگیرائی والی تخلیقات ہیں۔ ان میں انسانی

تاریخ اوراس کے تصادم کو پوری تخلیقیت کے ساتھ برتا گیا ہے۔ میں نے ان پر کافی غور وفکر کیا ہے۔
روجر باوین: آپ کا پہلا ناول غالباً1958 میں شائع ہوا تھا، جب آپ بالکل جوان تھے۔
چینوا اچے بے :جی ہاں!اس وقت میں بہت چھوٹا تھا۔
روجر باوین:اس ناول کی بین الاقوامی سطح پر پذیرائی ہوئی ؟
چینوا اچے بے :اس معاملے میں، میں خود کو خوش قسمت سمجھتا ہوں۔
روجر باوین: کیا آپ کبھی خواہش کرتے ہیں کہ آپ کے طالب علم آپ کی تحریریں پڑھیں؟
چینوا اچے بے :ٹھیک ہے، میرے خیال میں اس کا جواب نفی میں ہونا چاہئے۔کیونکہ میں یہاں عمومی افریقی ادب پڑھاتا ہوں۔
روجر باوین :کیا آپ آج کی نائیجیریائی یونیورسٹیوں اوراپنے زمانۂ طالب علمی کی نائیجیریائی یونیورسٹیوں کا موازنہ کرنا چاہیں گے؟
چینوا اچے بے :اوہ۔یہ بالکل رات اوردن کی طرح ہیں۔
روجر باوین:ان میں دن کون ہے اوررات کون؟
چینوا اچے بے :دن میرا زمانہ ہے اوررات آج کا دور ہے لیکن اس کی وجہ طالب علم نہیں ہیں۔
روجر باوین: کیا ایسا حکومت کی وجہ سے ہے؟
چینوا اچے بے :اس کی وجہ خود نائیجیریا ہے۔حکومت کی ناکامی کی کئی وجوہات ہیں۔نائیجیریا سے متعلق بات کرنا تکلیف دہ ہے۔اس کے تعلق سے جو تصور میرے ذہن میں ابھرتا ہے اسے میں اپنی زبان کی ایک کہاوت کے ذریعہ شاید واضح کرسکوں کہ جب آپ کا گھر گر گیا ہو تو آپ یہ نہیں کہتے کہ آپ کی چھت گرگئی یا آپ کی کھڑکی ٹوٹ گئی۔نائیجیریا مکمل تباہی اور مصیبت کے دور سے گزر رہا ہے۔
روجر باوین: آپ کا ناول Things Fall Apart نائیجیریا میں برطانوی سامراج کے تباہ کن اثرات پر مرکوز ہے۔ایک غیر معمولی تباہ کن طاقت جس نے سماج میں بکھراؤ اوراجنبیت کو جنم دیا۔سامراج اپنے ساتھ اپنی ثقافت، اپنی فوج اوراپنا مذہب (عیسائیت) لے کر آیا۔آپ کے ناول میں اس منفی تجربے کا بہت واضح اظہار نظر آتا ہے اور پھر آپ یہ بھی کہہ رہے ہیں کہ تعلیم کے اعتبار سے برطانوی اقتدار کے دور کا نائیجیریا آج کے نائیجیریا سے کہیں بہتر تھا؟
چینوا اچے بے :ہاں۔لیکن میرے خیال میں ایسا اس لیے نہیں ہے کہ آج کے طلباء میرے زمانے کے طالب علموں کے مقابلہ کند ذہن ہیں بلکہ اِن میں کئی ایک بہت ذہین ہیں۔ایسا اس لیے بھی نہیں ہے کہ اساتذہ اچھے نہیں ہیں بلکہ آج کے اساتذہ بہت بہتر ہیں۔آج کا مسئلہ سہولیات کا ہے۔آج نائیجیریا میں طلباء اوراساتذہ کو کوئی سہولت نہیں ہے، کتابیں نہیں، مطالعہ کے لیے لائبریری نہیں ہے۔ایسے حالات میں پڑھنا پڑھانا ناممکن سا ہو جاتا ہے۔
روجر بلوین: کیا آپ کسی ایسے ٹیچر کی نشاندہی کرسکتے ہیں جسے نائیجیریا میں اقتدار کے خلاف سچ بولنے کی سزادی گئی ہو؟
چینوا اچے بے :ٹھیک ہے۔نائیجیریا میں ایسے حالات ہیں لیکن ایسے حالات میں اقتدار کے خلاف سچ بولنے کی جسارت کون کرے گا؟ ایسے لوگ ملک میں موجود ہی نہیں ہیں۔ وہاں کی صورتِ حال تباہ کن ہے۔

معیشت زوال کی آخری حدوں کو چھو رہی ہے، بھوک اور بے روزگاری کے اس دور میں سچ بول کر تشدد کا نشانہ بننا کون پسند کرے گا؟ مجھے نہیں معلوم ایسے حالات میں آپ کے سوال کا مجھے کیا جواب دینا چاہیئے۔

روجر باوین: یہاں آنے سے قبل کیا آپ نائیجیریا میں پڑھاتے تھے؟

چینوا اچے بے :ہاں۔

روجر باوین: آپ نے وہاں کتنے سال، کس یونیورسٹی میں پڑھایا؟

چینوا اچے بے :میں صرف یونیورسٹی آف نائیجیریا سے منسلک رہا۔اس سے قبل میں ریڈیو پر تھا۔میں نے ریڈیو کی ملازمت میں دس سال گزارے پھر نائیجیریا میں خانہ جنگی جیسا بحران پیدا ہو گیا اور..........

روجر باوین:1968 میں

چینوا اچے بے :1967 اور 1968، پھر میں نے لاگاس، نائیجیریا میں پہلی فوجی بغاوت کے بعد اپنا کام چھوڑ دیا۔ یہ بغاوت نوجوان فوجی افسروں کے ذریعے کی گئی تھی جو ملک کے مختلف حصوں سے آئے تھے۔

روجر باوین:اس کے بعد آپ وہیں ٹھہرے رہے یا وہاں سے ہجرت کر گئے؟

چینوا اچے بے :میں نائیجیریا ہی میں رہا البتہ لاگاس، کو چھوڑ کر ملک کے مشرق میں واقع اپنی آبائی ریاست میں آ گیا۔ دوسرے لاکھوں لوگوں کی طرح میں اپنی آبائی ریاست میں محفوظ تھا۔ یہ سب نائیجیریا کی تقسیم کے لیے ہو رہا تھا۔ میں نے کبھی ملٹری رول والی فوجی قیادت کو پسند نہیں کیا لہٰذا میں نے بہت دکھ کے ساتھ لاگاس کو الوداع کہا تھا کیونکہ میرے نزدیک جنگ ہمیشہ تباہی کا باعث ہوتی ہے۔

روجر باوین: کیا آپ نے اس دوران اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لایا؟

چینوا اچے بے :میری بہت سی نظمیں اس دوران ہی تحریر ہوئیں اور بہت سے افسانے بھی۔مثلاً Girls at War۔

روجر باوین: آپ کے کسی افسانے کو سنسر کیا گیا یا حکومت کے ذریعے پابندی عائد کی گئی؟

چینوا اچے بے :میرے ساتھ نائیجیریا میں جو ہوا وہ بہت ہی مہذبانہ طریقہ سے ہراساں کیا جانا تھا۔ جنگ کے دوران میں نائیجیریا میں ہی تھا۔ جنگ کے اختتام پر مجھے اس طرح ہراساں کیا گیا کہ ملک کے اندر مجھے گھومنے پھرنے کی آزادی تھی لیکن مجھے پاسپورٹ جاری کرنے سے انکار کر دیا گیا۔ جب میں نے وزیر خارجہ سے درخواست کی کہ آپ کا محکمہ مجھے پاسپورٹ جاری کرنے سے انکار کر رہا ہے تب انھوں نے اس کی تفتیش کی اور مجھے یقین دلایا کہ آپ پاسپورٹ حاصل کرنے کے مستحق ہیں۔

روجر باوین:اور آپ نے اپنا پاسپورٹ حاصل کر لیا۔

چینوا اچے بے :ہاں! 1972 میں مجھے پاسپورٹ ملا اور امریکہ آ گیا۔ دراصل میں اندر سے ٹوٹ گیا تھا۔ اس لیے میساچیوسٹ یونیورسٹی کے شعبۂ انگریزی کے صدر کی دعوت پر میں نے دو سال کے لیے اس یونیورسٹی سے منسلک ہو گیا۔اس کے بعد ایک سال کے لیے یونیورسٹی آف کانیٹکٹ سے منسلک رہا۔اس دوران نائیجیریا کی فوجی حکومت نے مجھ سے نائیجیریا آنے کی درخواست کی تو میں اپنے ملک واپس جانے کے لیے تیار ہو گیا۔

روجر باوین: آپ یونیورسٹی آف نائیجیریا واپس چلے گئے اور شاعری اور انگریزی ناول پڑھانے لگے؟

چینوا اچے بے:خصوصاًانگریزی ناول۔

روجر باوین:یونیورسٹی آف نائیجیریا میں آپ کے پڑھائے ہوئے طالب علموں میں کچھ ایسے بھی ہیں جو تصنیف وتالیف میں دلچسپی رکھتے ہیں؟

چینوا اچے بے:ہاں!ہاں!! کیوں نہیں؟ان میں کچھ یقیناً ہیں۔ایک نے توابھی ابھی میری آپ بیتی ترتیب دی ہے۔

روجر باوین:یونیورسٹی آف میساچیوسٹ اور یونیورسٹی آف کانیٹکٹ کے علاوہ بھی امریکہ میں کہیں آپ نے تدریسی خدمات انجام دی ہیں؟

چینوا اچے بے: ایک سیشن کے لیے سٹی کالج، نیویارک اورایک ٹرم کے لیے Dartmouth میں۔دراصل اسی دوران اپنے گاؤں کی یونین کے اجلاس میں شریک ہونے کے لیے جس کا میں صدر تھا مجھے اپنے وطن واپس جانا پڑااوراس کے بعد جب میں Dartmouth واپس آنے کی تیاری کررہا تھا تو ایک سڑک حادثے میں زخمی ہوگیا۔اس حادثے نے میری آنے والی زندگی پر گہرے اثرات مرتب کئے۔

روجر باوین:ہاں۔Bradhuman University کے صدر Leon Botstein نے جب آپ کی صحت کے متعلق سنا تو انھوں نے آپ کواپنے یہاں آنے کی پیشکش کی۔آپ وہاں غالباً دس سال رہے؟

چینوا اچے بے:بارہ سال۔

روجر باوین:آپ Bradhuman University میں کون سے کورسس پڑھاتے تھے؟

چینوا اچے بے:افریقی ادب،تانیثیت،افسانہ،افریقہ کے اہم ترین ادیب اورمغرب میں افریقہ کی شبیہہ میرے مضامین تھے۔

روجر باوین:آپ کی تخلیقات انسانی ذہن اورمحسوسات پرکس قدراثرانداز ہوئیں؟

چینوا اچے بے:اپنی تخلیقات کے متعلق اس طرح کی گفتگو کرنا بہت مشکل ہے۔پھربھی بہت محتاط رہتے ہوئے میں کہوں گا کہ میری تخلیقات کی اثر پذیری کی کئی جہتیں ہیں۔مثلاً چندسال پہلے مجھے کوریا کی ومن کالج سے 32 خطوں کا ایک بنچ موصول ہوا۔جس میں ہر طالب علم نے Things Fall Apart سے متعلق اپنے الگ الگ مشاہدات لکھے تھے۔ان میں سے کچھ نے ناول کے مرکزی کردار Okonkwo کو لے کرمجھ پرسخت تنقید کی تھی کہ وہ اپنی قوم کی طرف سے لڑنے والا جنگجو تھااوراسے ناکام نہیں ہونے دیا جانا چاہئے تھا۔ان میں سے ایک نے لکھا تھا کہ Okonkwo مجھےاس لیے پسند ہے کہ اس نے جاپانی سامراج کے خلاف ہماری جدوجہد کی یادتازہ کردی تھی۔

روجر باوین:سامراجیت کودیکھیں تو برطانوی سامراج جیسا تھااس کے متضاد جاپانی سامراج چین اورکوریا میں تھا۔لیکن دونوں ہی صورتوں میں اس کے شکارعوام ہوئے۔آپ کے ناول Things Fall Apart کا مرکزی کردار Okonkwo سامراجیت کے خلاف جدوجہد کا استعارہ ہے تو کیا اس کردار کوایک طرح سے عالمی کردار کے طور پر دیکھنا چاہئے؟

چینوا اچے بے:جی ہاں۔

روجر باوین:سامراجیت کی تکالیف برداشت کرنے والی عوام Okonkwo کو اپنی شناخت کے طور پر محسوس

کرتی ہے لیکن ناول میں آپ نے اسے مار ڈالا ہے۔ کیا یہ سچ ہے کہ انصاف ہمیشہ حاشیے پر رہتا ہے؟

چینوا اچے بے: ٹھیک ہے۔ ضروری نہیں کہ اچھا آدمی ہمیشہ کامیاب ہو۔ Okonkwo ایک مکمل انسان نہیں تھا۔ اس کی بربادی اس کی اپنی غلطی کی وجہ سے تھی۔

روجر باوین: Okonkwo کا کردار تخلیق کرتے ہوئے کیا آپ نے کسی سطح پر خود کو Okonkwo کی طرح محسوس کیا اور آپ کو اُس کی کون سی خصوصیت پسند ہے۔ آپ کی طرح اس کا پہلوان ہونا؟

چینوا اچے بے: نہیں نہیں میں نہیں میرے والد پہلوان تھے۔ انھوں نے عیسائی مذہب قبول کر لیا تھا اور چرچ میں ٹیچر ہو گئے تھے۔

روجر باوین: اوہ۔ تو آپ کے والد نے عیسائی مذہب قبول کیا تھا؟

چینوا اچے بے: جی ہاں۔ میرے والد اور والدہ دونوں نے۔ میری پیدائش عیسائی گھر میں ہوئی۔ لیکن میں نے اسے (عیسائیت) پسند کرنے یا ناپسند کرنے کی ضرورت کبھی محسوس نہیں کی۔

روجر باوین: لیکن آپ نے Things Fall Apart میں عیسائیت کو خصوصیت کے ساتھ تباہ کن طاقت کے روپ میں پیش کیا ہے۔

چینوا اچے بے: ہاں، ہاں۔ دیکھئے نائیجیریا میں عیسائیت نو آبادیات کا نتیجہ ہے اور اس نے وہاں تہذیبی طور کئی مسائل پیدا کر دیئے ہیں۔ میں اپنے والد اور ان کے ہم عمروں کے ذہن کو پوری طرح نہیں سمجھ سکتا۔ مجھے حیرت ہے کہ انھوں نے اپنا آبائی مذہب ترک کر کے عیسائیت قبول کی۔ یہ دھوکہ دھڑی کی طرح محسوس ہوتا ہے اور میں کبھی نہیں چاہوں گا کہ ایک دھوکہ باز والدین کی اولاد کہلاؤں۔ یہی حالت پورے نائیجیریا میں ہے۔ یہ ایک طرح کی عجیب وغریب کیفیت ہے کہ پرانی نسل کے لوگ نئی نسل کو پسند نہیں کر پا رہے ہیں اور نئی نسل کے لوگ پرانی نسل کو۔

روجر باوین: سیاسی نظریہ ساز بینجمن باربر نے دنیا کو دو خانے میں تقسیم کرتے ہوئے کہا تھا کہ ایک دنیا وہ ہے جو بہت پچھڑی ہوئی، پسماندہ، دیہاتی اور بیرونی دنیا سے کٹی ہوئی ہے۔ میرے خیال میں یہ برطانوی سامراج سے قبل نائیجیریا کے دیہات کی طرح ہے۔ بینجمن کے نزدیک دوسری دنیا گلوبلائزڈ دنیا ہے جہاں ایک طرح کی تہذیبی سامراجیت کا غلبہ ہے۔ بادی النظر میں ان دونوں مخالف دنیاؤں میں گلوبلائز دنیا غالب نظر آتی ہے۔ اب Things Fall Apart کی طرف واپس آئیں تو انیسوی صدی کا برطانوی سامراج آج امریکہ کے ثقافتی سامراج کی طرح ہی تھا۔ آج آپ جہاں بھی جائیں امریکی فلمیں لوگوں کی پہلی پسند ہیں، امریکی ٹی وی اور امریکی موسیقی کے علاوہ امریکی ملبوسات اور امریکی ہاؤ بھاؤ فیشن کے طور پر رائج ہو رہے ہیں۔ کیا ایسا لوگوں کی ذہنی معذوری کے سبب ہے یا امریکہ میں اپنے آپ کو منوانے کی صلاحیت ہے؟

چینوا اچے بے: کل ملا کر امریکہ میں اپنے آپ کو منوانے کی صلاحیت ہے۔ لیکن جہاں تک گلوبلائیزیشن کی مقبولیت کا سوال ہے تو اس کی مقبولیت کا راز پیسہ کی اثر پذیر قوت ہے۔

روجر باوین: گلوبلائزیشن کی قوت اس کی دولت ہے؟

چینوا اچے بے: ہاں۔

روجر باوین: کیا آپ سمجھتے ہیں کہ انیسویں صدی کا نائیجیریا بہت اچھا تھا؟

چینوا اچیبے:جی ہاں۔Igbo نسل کے لوگوں میں دولت اوراقتدار کو لے کر بہت اچھی سمجھداری تھی۔ چھوٹے چھوٹے گاؤں بھی ایک نظام کے تحت چلتے تھے۔امیر غریب سب کے لیے احترام کا جذبہ تھا اور کوئی کسی کو نقصان نہیں پہنچاتا تھا۔اقتدار حاصل کرنے کے لیے ذمہ داری شرط تھی اور وہ بھی پورے گاؤں کی کفالت کی ذمہ داری۔ لہٰذا آخرش دولت اقتدار کی یکجائی ہوتی بھی تو اس میں احترام اور ذمہ داری کے احساس کا جذبہ بھی تھا اور یہ سامراجیت کے پہلے تک وہاں تھا۔

روجر باوین : کیا آپ صدر Obasanjo کی اس بات سے اتفاق رکھتے ہیں کہ آپ کو امریکہ میں اعلیٰ تعلیم کے مسائل پر بھی نظر رکھنی چاہیئے؟

چینوا اچیبے :ان کا کہنا ٹھیک ہے۔دراصل میں اس طرف دھیان ہی نہ دے سکا کیونکہ میری ساری توجہ نائیجیریا پر ہی مرکوز تھی اور میں نائیجیریا کے مسائل پر لکھ رہا تھا۔ مجھے چاہیئے تھا کہ میں نائیجریا کے مسائل بیان کرنے کے ساتھ ساتھ امریکہ میں اعلیٰ تعلیم کے مسائل پر بھی لکھتا لیکن میرا سوال یہ ہے کہ اگر مجھے امریکہ پر کوئی کتاب لکھنی ہے تو میں کیوں لکھوں؟ امریکہ پر بہت سے لوگوں نے لکھا ہے۔ دس کتابیں پڑھ کر گیارہویں کتاب لکھنے کا کیا تک ہے؟

روجر باوین: مجھے یقین ہے کہ آپ میری اس بات سے اتفاق کریں گے کہ امریکہ میں اعلیٰ تعلیم بہت سے امریکیوں کی دسترس سے باہر ہے۔ انسانی حقوق کے ایک سرگرم مبصر اور ایک ناول نگار کی حیثیت سے امریکہ میں اس طرح کے انسانی سلوک پر آپ کی رائے کیا ہے؟

چینوا اچیبے :ہوسکتا ہے ایسا ہو لیکن ایک ہی وقت میں دنیا کے مختلف مسائل پر آپ توجہ نہیں مرکوز کر سکتے۔

روجر باوین: آپ نے ایک بار کہا تھا کہ جمہوریت کے ساتھ بڑی مشکل یہ ہے کہ یہ حقیقت میں اچھی طرح کام نہیں کرتی۔ امریکہ میں جمہوریت بہت قدیم اور مضبوط ہے۔کیا آپ کو لگتا ہے کہ امریکہ نائیجیریا اور دوسرے مما لک کے لیے رول ماڈل ہے؟

چینوا اچیبے : میرے خیال میں ہر قوم کو اپنا فیصلہ خود کرنا چاہیئے کہ اسے کون سا سیاسی نظام درکار ہے۔ لیکن میں جو کہہ رہا ہوں ویسا ہوتا نہیں ہے اور عوام کنفیوزن کا شکار ہو جاتے ہیں۔

روجر باوین :کنفیوزن کیسا۔ ہر قوم کو اپنا راستہ خود منتخب کرنا چاہیئے یا پھر Things Fall Apart کے لیے تیار رہنا چاہیئے۔ مستقبل کے تعین کے لیے باہری دنیا سے رابطہ اور اس سے بہت کچھ سیکھنے کے لیے تیار رہنا چاہیئے۔ آزادی ایک نعمت ہے اور جو لوگ اس کی قدر نہیں کرتے انھیں باہری مداخلت، سامراج یا پھر فوجی حکومت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

چینوا اچیبے :بالکل، ہمیں اپنے باہر کی دنیا کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے۔ ہمیں جس کی ضرورت ہے وہ دنیا کے کسی بھی حصّے سے سیکھنا چاہیئے۔ اگر آپ دوسروں سے رابطے میں نہیں رہیں گے تو اکیلے رہ جائیں گے۔

روجر باوین: کیا آپ سیاسی مصنف کے طور پر پہچانے جانا پسند کریں گے؟

چینوا اپے بے :جی ہاں! بشرطیکہ مجھے ایسا سمجھا جائے۔اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں سیاست داں ہوں۔ مجھے لگتا ہے کہ سیاست کی جڑیں زندگی اور سماج میں بہت گہرائی تک ہیں۔لیکن آج مغرب میں سیاست زوال پذیر ہے اور مغرب آج بھی غیر محسوس طور پر شہنشاہیت پرست ہے۔☆☆☆

جنگ

پہلی بار جب وہ ایک دوسرے کی راہوں سے گذرے تو کچھ بھی نہیں ہوا۔ یہ جدو جہد بھرے دنوں کی بات ہے۔ جب ہر روز نوجوانوں کواور کبھی کبھی لڑکیوں کو بھی بھرتی دفتروں سے مایوس واپس لوٹنا پڑتا تھا، کیونکہ نئے تشکیل شدہ ملک کی حفاظت کے لیے ہتھیار اٹھانے والے بہت سے لوگ آرہے تھے۔

دوسری بار وہ آنکار کے ایک چیک پوائنٹ پر ملے۔ جنگ شروع ہو چکی تھی اور دور دراز کے شمالی علاقوں سے دھیرے دھیرے جنوب کی جانب بڑھ رہی تھی۔ وہ اونتشا سے اینوگو جا رہا تھا اور عجلت میں تھا۔ حالانکہ وہ ذہنی طور پر سڑک پر کھڑی کی گئی رکاوٹوں اور تلاشی کے حق میں تھا،لیکن جب اسے خود تلاشی دینی پڑتی تھی،اس کے جذبات کوٹھیس پہنچتی تھی۔ حالانکہ وہ بذات خود اس بات کو ماننے کے لئے تیار نہیں تھا،لیکن لوگ مانتے تھے کہ اگر آپ کی تلاشی لی گئی تو آپ بڑے آدمی نہیں ہیں۔ اگر وہ اپنی اور متاثر کن آواز میں یہ کہہ کر'' ریگی نولڈ نوالکوف'' 'وزارت انصاف' اپنی تلاشی سے بچ جاتا تھا۔ اس کے جملے کا اثر فوراً ہوتا تھا،لیکن کئی بار لاعلمی کے سبب یاضدی آفیسر کی بنا پر چیک پوائنٹ کے لوگ اس کے جملے سے متاثر نہیں ہوتے تھے۔ جیسا کہ ابھی آفکا پر ہوا تھا۔ مارک ۴ کی وزنی بندوقیں اٹھائے ہوئے دو کانسٹبل دور سڑک کے کنارے سے نظر رکھے ہوئے تھے اور تلاشی کا کام انھوں نے مقامی نگراں کاروں کے حوالے کر دیا تھا۔

''مجھے جلدی جانا ہے۔'' اس نے لڑکی سے کہا، جو اس کی کار تک آ گئی تھی۔ ''میرا نام ریگی نولڈ نوانکوف ہے۔ وزارت انصاف سے وابستہ ہوں۔''

''سلام سر'' میں آپ کی کار کا 'بوٹ' دیکھنا چاہتی ہوں۔''

''اے خدا! تمھارے خیال سے کار کے 'بوٹ' میں کیا ہو سکتا ہے؟''

''میں نہیں جانتی سر۔'' غصے پر قابو رکھتے ہوئے وہ کار سے باہر نکلا، پیچھے گیا، بوٹ کھولا اور بائیں ہاتھ سے ڈھکن اٹھاتے ہوئے دائیں سے یوں اشارہ کیا، جیسے کہہ رہا ہو،اس کے بعد۔ ''ہوگئی تسلی؟' اس نے سوال کیا۔

''جی،سر۔ کیا میں آپ کی گاڑی کا پچن ہول دیکھ سکتی ہوں!''

''اوہ، میرے خدا۔''

''دیری کے لئے معافی چاہتی ہوں، سر آپ ہی لوگوں نے ہمیں یہ کام سونپا ہے۔''

''کوئی بات نہیں، تم بالکل ٹھیک کہتی ہو یہ رہا گلف باکس۔ دیکھ لو، کچھ بھی نہیں ہے۔''

''ٹھیک ہے سر، بند کر دیجئے۔'' اس نے پیچھے کا دروازہ کھول کر سیٹ کے نیچے جھانکا۔ تب اس نے پہلی بار لڑکی کو بغور دیکھا۔ پیچھے سے۔ وہ خوبصورت لڑکی تھی۔ جس نے نیلی جرسی، خاکی جینس اور کینوس کے جوتے پہن رکھے تھے اور بالوں کو نئے اسٹائل سے پلیٹوں میں باندھ رکھا تھا۔ جس سے لڑکیوں کے چہرے پر باغیانہ تیورا بھر آتا تھا۔ جسے لوگوں نے نہ جانے کیوں ''ایئر فورس پیس'' کا نام دے رکھا تھا۔ وہ کچھ کچھ جانی پہچانی لگتی تھی۔

''میں مطمئن ہوں سر'' اس نے آخر میں کہا۔ جس کا واضح مطلب تھا کہ وہ اپنا کام مکمل کر چکی ہے۔

''آپ نے مجھے پہچانا نہیں سر!''

''نہیں، کیوں!''

''جب میں اسکول چھوڑ کر فوج میں بھرتی ہونے جارہی تھی تو آپ نے مجھے اینو گوتک لفٹ دی تھی۔''

''اوں، ہاں۔ تم ہی وہ لڑکی ہو۔ میں نے تمہیں واپس اسکول جانے کے لئے کہا تھا نا، کیوں کہ فوج میں لڑکیوں کی ضرورت نہیں ہے، پھر کیا ہوا!''

''انھوں نے مجھے اسکول جانے کے لئے کہا یا ریڈ کراس میں بھرتی ہونے کا مشورہ دیا۔''

''دیکھا تم نے، میں نے ٹھیک ہی کہا تھا نا۔ تب پھر تم یہاں کیا کر رہی ہو!''

''صرف سول ڈیفنس کے ساتھ تھوڑا سا ہاتھ بٹا رہی ہوں۔''

''چلو ٹھیک ہے، یقیناً تم بہت ہی اچھی لڑکی ہو۔'' وہی دن تھا جس دن اس نے سوچا تھا کہ انقلاب میں آخر کچھ ہے۔ اس نے پہلے ہی لڑکیوں اور عورتوں کو مارچنگ اور مظاہرہ کرتے دیکھا تھا۔ لیکن وہ ان کے بارے میں ٹھیک سے سوچ نہیں بنا پایا تھا۔ اس میں تو کوئی شک نہیں کہ عورتیں اور لڑکیاں اپنے بارے میں سنجیدگی سے سوچتی تھیں، جو گلیوں میں چھڑیاں اٹھائے اور سروں پر اسٹیل ہیلمٹ کی جگہ سوپ کے کٹورے رکھے آگے پیچھے ڈرل کیا کرتی تھیں۔ ان دنوں کا سب سے مشہور مذاق تھا وہ بیز جس کے پیچھے پیچھے مقامی اسکول کی لڑکیاں چلتی تھیں اور جس پر لکھا رہتا تھا ''وی آر امپر یگینل!''

لیکن آفکا چیک پوائنٹ پر اس لڑکی سے ملاقات کے بعد وہ دوبارہ نہ تو لڑکیوں کا مذاق ہی اڑا سکا اور نہ ہی انقلاب کی بات کی، کیونکہ اس لڑکی کے کام کرنے کے طریقے نے اور سادگی و خود اعتمادی نے اسے ایک دم چھچھورے پن کا مجرم بنا دیا تھا۔ کیا کہا تھا اس نے۔ ''ہم وہی کام کر رہے ہیں جو آپ لوگوں نے ہمیں سونپا ہے۔'' اس نے میرے عہدے کا بھی لحاظ نہیں کیا تھا جس نے ایک بار اس پر احسان بھی کیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ اپنے والد کی تلاشی بھی اسی سختی سے لیتی۔

جب وہ تیسری بار ایک دوسرے کی راہوں سے گذرے تو اٹھارہ مہینے بیت گئے تھے اور حالات کافی

خراب تھے۔موت اور بھکمری نے بیتے دنوں کی خودداری کو رفو کر دیا تھا،اس کی جگہ مایوسی اور بدامنی نے لے لی تھی۔جس کی بنا پر سبھی کے ضمیر مردہ ہو گئے تھے۔حیرت کی بات ہے کہ ایسے وقت میں بھی کچھ لوگ ایسے تھے جن کی اکلوتی آرزو یہ تھی کہ زندگی میں بہترین سے بہترین چیزوں پر قبضہ جما لینا اور موج مستی کرنا۔ایسے لوگوں کے لئے دنیا میں ایک عجیب وغریب سی یکسانیت لوٹ آئی تھی۔سبھی چیک پوائنٹ غائب ہو گئے۔لڑکیاں پھر لڑکیاں بن گئیں اور لڑکے لڑکے۔زندگی خوف و دہشت سے بھری اور یاسیت زدہ ہو کر رہ گئی تھی۔جس میں کچھ اچھائیاں تھیں۔کچھ برائیاں اور ڈھیر ساری بہادری جو اس کہانی کے کرداروں سے پرے رفیوجی کیمپوں،چیتھڑوں میں لپٹے،گولی کے نشانے کے سامنے سینہ سپر،بھوکے ننگے لیکن باہمت لوگوں میں دکھائی دیتی تھی۔

ریگی نولڈ نانکوف ان دنوں اوبری میں بود و باش اختیار کئے ہوئے تھا،لیکن اس دن وہ راشن کی تلاش میں نکوری گیا ہوا تھا۔اوبری میں اسے کیریناس میں کچھ مچھلیاں،ڈبہ بند گوشت اور گھٹیا امریکی اناج،جسے کھاد نمبر دو کہتے تھے اور جو جانوروں کا چارہ تھا۔مل گیا تھا۔اسے لگتا تھا کہ کیتھولک نہ ہونے کی وجہ سے اسے راشن میں نقصان ہوتا تھا،اس لئے وہ نکوری میں چاول اور بیسن کی تلاش میں اپنے دوست کے پاس آیا تھا!جو ڈبلیوسی سی کا ایک ڈپو چلاتا تھا۔

وہ اوبری سے صبح چھ بجے ہی چل پڑا تھا تاکہ اپنے دوست کو ڈپو میں ہی پکڑ سکے۔جو ہوائی حملے کے ڈر سے ساڑھے آٹھ کے بعد وہاں ٹھہرتا نہیں تھا۔نانکوف کے لئے وہ دن خوش بختی والا تھا۔کچھ دن پہلے کئی جہازوں کے اچانک ایک ساتھ آجانے کے سبب ڈپو میں ایک دن پہلے ہی رسد کا بہت بڑا اسٹاک آیا تھا۔جب اس کا ڈرائیور ٹن تھیلے اور کارٹن اس کی گاڑی میں لاد رہا تھا تو بھوکی بھیڑ نے جو ہمیشہ ریلیف سینٹروں کے ارد گرد جمع رہتی تھی،کئی پھبتیاں کسیں۔مثلاً''وار کین کینٹینو''جس کا مطلب ڈبلیوسی سی سے تھا۔کوئی اور چلایا''ایرے ولو''

اس کے دوست نے جواب دیا'شم'۔'ایرے ولو'۔''شم''

''ایسو ہیلی،'شم'۔ایسو ہیلی،'شم۔ممبا۔

نانکوف کو بڑی خجالت محسوس ہوئی۔چیتھڑوں اور ننگی پسلیوں والی بھیڑ سے نہیں بلکہ ان کے بیمار جسموں سے اور التجا بھری آنکھوں سے۔اسے زیادہ برا محسوس ہوتا اگر وہ کچھ بھی نہ کہہ کر چپ چاپ اس کی گاڑی کے باٹ میں سے،انڈے،دودھ کا پاؤڈر،دلیہ،گوشت اور مچھلی کے ڈبوں کو خاموشی سے لدتا ہوا دیکھتے رہتے۔عمومی طور پر چاروں طرف پھیلی ہوئی مصیبتوں کے درمیان اس طرح کی خوش قسمتی پر شرم آنا لازمی تھا۔لیکن کوئی کیا کر سکتا تھا۔دوراوگبو قصبے میں موجود اس کی بیوی اور چار بچے مکمل طور پر اس کے ذریعے ارسال کئے گئے راحتی سامان پر انحصار کرتے تھے۔وہ انھیں کواشی خور جیسی جان لیوا بیماری کے منہ میں تو نہیں دھکیل سکتا تھا۔وہ صرف اتنا کر سکتا تھا اور کر رہا تھا کہ جب بھی اسے آج کی طرح اچھی رسد مل جاتی تھی تو وہ اس کا کچھ حصہ اپنے ڈرائیور جانسن کو دے دیتا تھا۔جس کی بیوی اور چھ بچے تھے یا سات اور جس کی تنخواہ دس پاؤنڈ ماہانہ تھی۔بازار میں 'گاری' کی قیمت ایک پاؤنڈ کی

سگریٹ تک پہنچ گئی تھی۔ ایسی حالت میں وہ بھیڑ کے لئے کچھ بھی نہیں کرسکتا تھا۔ زیادہ سے زیادہ وہ اپنے پڑوسی کے لئے کچھ کرسکتا تھا۔ بس یہی کچھ۔

اومیری سے لوٹتے وقت سڑک کے کنارے کھڑی ایک خوبصورت لڑکی نے لفٹ مانگی۔ اس نے ڈرائیور کو رکنے کا اشارہ کیا۔ چاروں طرف بیسیوں پیدل چلنے والے۔ دھول سے سنے اور تھکے ماندے۔ جن میں کچھ فوجی تھے اور کچھ پیوپلس۔ گاڑی کی طرف دوڑے۔

''نہیں، نہیں، نہیں، مانکوف نے سختی سے کہا۔ ''میں تو اس دوشیزہ کے لئے رکا ہوں۔ میری گاڑی کا ٹائر خراب ہے اور میں صرف ایک ہی مسافر کو لے جاسکتا ہوں۔ سوری۔''

''بیٹے پلیز۔'' ہینڈل پکڑتے ہوئے ایک مایوس بڑھیا نے کہا۔

''بڑھیا تو مرنا چاہتی ہے؟'' ڈرائیور نے اسے دھکیلتے ہوئے کہا اور گاڑی آگے بڑھا دی۔ مانکوف نے اب تک کتاب کھول لی تھی اور نظریں ان میں گڑا دی تھیں۔ تقریباً ایک میل تک اس نے لڑکی کی طرف دیکھا ہی نہیں۔ آخر لڑکی کو خاموشی گراں گذری، اس نے خاموشی توڑی۔ ''آپ نے مجھے بچالیا۔ شکریہ۔''

''اس میں شکریے کی کیا بات ہے! کہاں جارہی ہو؟''

''اومیری۔ آپ نے مجھے پہچانا نہیں؟''

''اوہ! ہاں ضرور...... میں بھی کتنا بھلکڑ ہوں۔ تم؟''

''گلیڈس۔''

''ہاں، ہاں...... فوجی لڑکی۔ گلیڈس تم بالکل بدل گئی ہو۔ خوبصورت تو تم پہلے سے ہی تھیں لیکن اب تو تم روپ کی رانی لگتی ہو۔ کیا کرتی ہو آج کل؟''

''میں آج کل فویل ڈائریکٹریٹ میں ہوں۔''

''بہت اچھی بات ہے۔''

''اچھی بات تو ہے، اس نے سوچا، لیکن تکلیف دہ بھی ہے۔ وہ ایک گہرے رنگ کا وگ پہنے ہوئے تھی۔ قیمتی اسکرٹ اور لوکٹ کا بلاؤز۔ اس کے جوتے ضرور گیبن سے آئے ہوں گے اور کافی قیمتی ہوں گے۔ کل ملا کرنانکوف نے سوچا۔ اسے کسی امیر آدمی کی داشتہ ہونا چاہئے۔ ایسا آدمی جو جنگ سے پیسوں کے پہاڑ بنا رہا ہوگا۔

''میں نے آج تمھیں لفٹ دے کر اپنا ایک اصول توڑا ہے۔ آج کل میں لفٹ بالکل نہیں دیتا۔

''کیوں؟''

''آخر میں کتنے لوگوں کو لے جاسکتا ہوں؟ بہتر ہے کہ کوشش ہی مت کرو۔ اس بڑھیا کو ہی لو۔''

''میں سوچ رہی تھی کہ آپ اس بڑھیا کو بٹھالیں گے۔''

یہ سن کر اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموشی کے طویل وقفے کے بعد گلیڈس کو محسوس ہوا کہ وہ برا مان گیا ہے۔ اسی لیے اس نے پھر خاموشی توڑی۔

''میرے لیے اپنا اصول توڑنے کا شکریہ۔'' وہ اس کے مڑے ہوئے چہرے کو پڑھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ یہ سن کر وہ مسکرایا۔ اپنا چہرہ اس کی جانب کیا، اس کی گود میں ہلکی سی چٹکی لی اور پوچھا۔

''اومیری میں تم کیا کرنے جا رہی ہو؟''

''میں اپنی سہیلی سے ملنے جا رہی ہوں۔''

''سہیلی؟ یقیناً؟''

''کیوں نہیں...... اگر آپ مجھے اس کے گھر تک چھوڑ دیں تو اس سے مل بھی سکتے ہیں۔ بس ایک ہی ڈر ہے کہ وہ کہیں ویک اینڈ پر نہ نکل گئی ہو۔ تب تو گڑ بڑ ہو جائے گی۔''

''کیوں؟''

''کیونکہ اگر وہ گھر پر نہ ہوئی تو سڑک پر سونا پڑے گا۔''

''میں تو دعا کر رہا تھا کہ وہ گھر پر نہ ہو۔''

''کیوں؟''

''کیوں کہ اگر وہ گھر پر نہ ہوئی تو میں تمہیں شب گزاری اور ناشتے کی دعوت دے سکوں۔''

''کیا ہوا؟ اس نے ڈرائیور سے پوچھا، جس نے اچانک گاڑی روک دی تھی۔ جواب کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ سامنے کھڑی بھیڑ اوپر دیکھ رہی تھی۔ تینوں گاڑی سے نکلتے ہی جھاڑیوں کی طرف بھاگے۔ گردنیں آسمان کی جانب تنی ہوئی تھیں۔ لیکن الارم غلط تھا۔ آسمان صاف اور بے آواز تھا، صرف دو گدھ اونچی اڑان بھر رہے تھے۔ بھیڑ میں سے ایک مسخرے نے ان کو فائٹر اور بمبار کا نام دے دیا۔ یہ دیکھ کر سب کے چہروں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ تینوں پھر گاڑی میں سوار ہوئے اور سفر جاری ہو گیا۔

''ابھی ریڈرس کے لیے جلدی ہے۔'' اس نے گلیڈس سے کہا جواب بھی اپنے دونوں ہاتھ سینے پر رکھے ہوئے تھی، جیسے دل کی دھک دھک سن رہی ہو۔ ''وہ دس بجے سے قبل نہیں آتے ہیں۔'' لیکن گلیڈس مارے خوف کے بول نہیں پا رہی تھی۔ نانکوف کو ایک موقع دکھائی دیا اور اس نے اس موقع کا فائدہ اٹھالیا۔

''تمہاری سہیلی کہاں رہتی ہے؟''

''250 ڈگلس روڈ پر۔''

''اوہ! وہ تو شہر کے درمیان میں ہے، بہت ہی واہیات جگہ ہے۔ نہ خندق نہ کچھ اور۔ میں تمہیں وہاں شام چھ بجے سے پہلے جانے کا مشورہ نہیں دوں گا۔ وہ جگہ محفوظ نہیں ہے۔ اگر تمہیں برا نہ لگے تو تمہیں میں اپنے یہاں لے چلتا ہوں۔ جیسے ہی چھ بجیں گے۔ میں تمہیں تمہارے سہیلی کے یہاں چھوڑ آؤں گا۔'' ''ٹھیک ہے؟''

''ٹھیک ہے۔'' اس نے بے جان سی آواز میں کہا۔ ''مجھے اس سے بہت ڈر لگتا ہے۔ اس لیے میں نے اومیری میں کام کرنے سے بھی انکار کر دیا تھا۔ جانے کس نے مجھے آج یہاں آنے کا مشورہ دیا تھا۔''

''کوئی بات نہیں۔ ہمیں تو عادت ہو گئی ہے۔''

''لیکن آپ کے ساتھ آپ کے افرادِ خانہ تو نہیں ہیں نا؟''

''نہیں''اس نے کہا۔کسی کے بھی خاندان کے افراد اس کے ساتھ نہیں ہیں۔ہم کہتے ہیں کہ اس کا سبب ایکرریڈس، ہیں،لیکن حقیقت کچھ اور ہے۔اومیری موج مستی کا شہر ہے اور ہم لوگ گھوڑوں کی طرح رہتے ہیں۔''

''میں نے بھی کچھ ایسا ہی سنا ہے۔''

''سنا ہی نہیں،تم آج دیکھوگی بھی۔میں تمھیں آج ایک بہت ہی موج مستی بھری پارٹی میں لے جاؤں گا۔میرے ایک دوست کی آج سالگرہ ہے۔وہ لیفٹنٹ کرنل ہے۔اسی نے پارٹی کا انعقاد کیا ہے۔انھوں نے ساؤنڈ اسمیز رس بینڈ کرایے پر حاصل کیا ہے۔مجھے پورا یقین ہے کہ تمھیں خوب مزہ آئے گا۔لیکن اسے اس بات پر شرم آئی،اسے پارٹیوں سے بہت چڑ تھی۔جبکہ اس کے دوست خوب رنگ رلیاں مناتے تھے۔اور نانکوف یہ سب بات اس لیے کررہا تھا کہ وہ گلیڈس کو اپنے گھر لے جانا چاہتا تھا۔اور لڑکی بھی یعنی گلیڈس بھی،جس کا ایک وقت تھا جنگ میں پورا یقین تھا اور جسے کسی نے دھوکا دیا تھا۔دکھ بھرے انداز میں گلیڈس نے سر ہلا لیا۔

''کیا ہوا! گلیڈس نے پوچھا۔

''کچھ نہیں۔یوں ہی کچھ سوچنے لگا تھا۔باقی سفر خاموشی میں طے ہوتا رہا۔

گلیڈس بھی اس کے گھر میں اس قدر تیزی سے گھل مل گئی جیسا کہ وہ اس کی گرل فرینڈ ہو۔اس نے گھریلو لباس زیب تن کیا اور اپنا بھڑک دار وگ اتار دیا۔

''تمہارے بالوں کی سجاوٹ بہت اچھی ہے۔تم انھیں وگ میں کیوں چھپائے رکھتی ہو؟''

''شکریہ۔''اس نے کچھ دیر تک اس کے سوال کا جواب دیا ہی نہیں۔پھر کہا۔'' آدمی لوگ بھی مسخرے ہوتے ہیں۔

''کیوں؟''

''تم روپ کی رانی لگتی ہو۔''گلیڈس نے نانکوف کی نقل اتاری۔

''اوہ'' وہ بات۔میں تو اسے صد فیصد سچ جانتا ہوں۔'' نانکوف نے یہ کہتے ہوئے اسے اپنی جانب کھینچا اور اس کا بوسہ لے لیا۔گلیڈس نے نہ تو اعتراض کیا اور نہ ہی پوری طرح اپنے آپ کو اس کے سپرد کر دیا۔شروعات کے لیے نانکوف کو یہ انداز اچھا لگا۔ان دنوں بہت سی لڑکیاں آسانی سے خود سپردگی کر دیتی ہیں۔کچھ لوگوں نے اسے ''بیماریٔ جنگ'' کا نام دے دیا تھا۔

کچھ دیر وہ اپنے دفتر حاضری لگانے گیا اور وہ باورچی خانہ میں لنچ کے لیے نوکر کی مدد کرنے لگی۔اس نے صرف حاضری ہی لگائی ہوگی،کیونکہ وہ آدھے گھنٹے میں ہی لوٹ آیا۔ہاتھ ملتے ہوئے بولا کہ وہ اپنی گلیڈس سے زیادہ دیر تک دور نہیں رہ سکتا۔

جب وہ لنچ کر رہے تھے تو وہ بولی۔''تمھارے فریج میں تو کچھ بھی نہیں ہے!''

''مثلاً!''اس نے برا مانتے ہوئے پوچھا۔
''مثلاً گوشت''اس نے بلا جھجھک جواب دیا۔
''تم اب بھی گوشت کھاتی ہو!''اس نے سوال کیا۔
میں بھلا کون ہوتی ہوں۔لیکن آپ جیسے بڑے لوگ کھاتے ہیں۔
''مجھے پتہ نہیں تم کتنے بڑے لوگوں کی بات کر رہی ہو۔لیکن وہ میرے جیسے نہیں ہیں۔ میں نہ تو دشمن سے کاروبار کر کے پیسہ بناتا ہوں اور نہ یہی راحت کا سامان بیچ کر یا.....''
''آگسٹا کا بوائے فرینڈ یہ سب نہیں کرتا،اسے صرف بیرونی کرنسی ملتی ہے۔''
''کیسے ملتی ہے؟ وہ سرکار کو دھوکا دیتا ہے۔ایسی ملتی ہے بیرونی کرنسی۔''
''چاہے وہ کوئی بھی ہو۔ ویسے یہ آگسٹا کون ہے؟''
''میری سہیلی۔''
''اوہ!''
''پچھلی بار اس نے مجھے تین ڈالر دیے تھے۔جن کو میں نے پاؤنڈ میں بدل لیا۔اس آدمی نے آگسٹا کو پچاس ڈالر دیے تھے۔
خیر میری پیاری، میں بیرونی کرنسی کی بھی دلالی نہیں کرتا اور میرے فریج میں گوشت بھی نہیں ہے۔ہم ایک جنگ لڑ رہے ہیں، اور مجھے صرف یہ معلوم ہے کہ فرنٹ پر ہمارے کچھ نوجوان تین تین دن میں ایک بار جَو کا پانی پی کر لڑ رہے ہیں۔''
''یہ تو ٹھیک ہے۔اندھا پیئے، کتا کھائے۔''
''بات یہ بھی نہیں ہے،اس سے بھی بری ہے۔''اس نے کہا۔غصے سے اس کی زبان لڑکھڑانے لگی تھی۔
''لوگ ہر روز مارے جا رہے ہیں۔اس وقت جب ہم تم بات کر رہے ہیں،اس وقت بھی کوئی مارا جا رہا ہے۔
''یہ تو ٹھیک ہے۔''اس نے کہا۔
''ہوائی جہاز!''''لڑکا باورچی خانے سے چلایا۔
''اوہ ماں۔'' گلیڈس چلائی۔جیسے ہی وہ پام کے پتوں اور لال مٹی سے بنی خندق کی اور سر پر ہاتھ رکھ کر، بدن جھکائے ہوئے دوڑی، آسمان جیٹ طیاروں اور طیاروں کو نشانہ بناتی ہوئی ملکی توپوں کی گرج سے پھٹ پڑا۔
خندق میں، طیاروں کے چلے جانے کے بعد اور دیر سے شروع ہوئی توپوں کی گھن گرج ختم ہو جانے کے بعد بھی وہ اس سے چپکی رہی۔وہ جہاز تو صرف اوپر سے گزر رہا تھا۔نانکوف نے کہا۔
وہ اب بھی کانپ سی رہی تھی۔اس نے کچھ بھی نہیں گرایا۔اس کی سمت سے لگ رہا تھا کہ لڑائی کے مورچے پر جا رہا ہے۔شاید ہمارے فوجی ان پر دباؤ ڈال رہے ہیں۔اس لیے وہ ایسا کرتے ہیں۔جب بھی ہمارے فوجی دباؤ ڈالتے ہیں وہ روسیوں کو ہوائی جہازوں کے لیے ایس او ایس بھیج دیتے ہیں۔اس نے لمبی سانس لی۔

اس نے کچھ بھی نہیں کہا۔صرف اس سے چپکی رہی۔وہ ہنستے رہے۔ان کا نوکر ساتھ والے گھر کے نوکر کو بتلا رہا تھا کہ وہ دو تھے۔ایک نے یوں ڈائی ماری اور دوسرے نے یوں۔

''ہم بھی اچھی طرح دیکھ رہے ہیں'' دوسرے نے اتنے ہی پر جوش انداز میں کہا۔کہنا تو نہیں چاہئے لیکن ان مشینوں سے لوگوں کا مرنا دیکھنے میں اچھا لگتا ہے نا!'خدا کی قسم'

''سوچو!'' آخر کار گلیڈس نے زبان کا استعمال کرتے ہوئے کہا۔نانکوف نے سوچا وہ چند لفظوں میں ہی یا صرف ایک ہی لفظ سے معنی کی کئی پرتوں کو اتار سکتی تھی۔اس ایک لفظ میں 'سوچو' حیرت، تنقید، اور شاید ان لوگوں کے لیے ایک طرح کی حوصلہ افزائی بھی پوشیدہ تھی جو موت کے ہرکاروں کے بارے میں بھی مذاق کر سکتے تھے۔

''ڈرومت۔''اس نے کہا۔وہ اس کے مزید قریب آ گئی اور وہ اس کے بوسے لینے لگا۔وہ دھیرے دھیرے کھلنے لگی اور پھر پوری طرح کھل گئی۔خندق میں اندھیرا تھا۔وہاں جھاڑو بھی نہیں لگی تھی اور اس میں کیڑے پتنگے ہو سکتے تھے۔اس نے گھر میں سے چٹائی لانے کے بارے میں سوچا۔پھر خیال چھوڑ دیا۔اور کوئی ہوائی جہاز آ سکتا تھا۔پڑوسی یا کوئی اور راہ گیر ان کے اوپر گر سکتا تھا۔یہ تو تقریباً ویسی ہی حالت ہوگئی جس میں لوگوں نے ہوائی حملے کے وقت دن دھاڑے ایک آدمی کو ننگ دھڑنگ اپنے بیڈروم سے نکل کر دوڑتے ہوئے دیکھا تھا اور اس کے پیچھے پیچھے اسی حالت میں ایک عورت بھی تھی۔

جیسا کہ گلیڈس کو ڈر تھا، اس کی سہیلی گھر پر نہیں تھی۔لگتا تھا کہ اس کے با اثر دوست نے لبرول میں خریداری کے لیے اس کے پیچھے ہوائی جہاز میں ایک سیٹ حاصل کر لی تھی۔کم از کم پڑوسیوں کا یہی اندازہ تھا۔

''کمال ہے'' نانکوف نے واپسی پر کہا۔''وہ لڑاکا طیارے سے جوتوں، وگوں، پینٹوں، برا، کاسمیٹک اور ایسی ہی دیگر چیزوں سے لدی پھندی لوٹے گی۔جنھیں پھر وہ ہزاروں پاؤنڈ کی قیمت پر فروخت کر دے گی۔تم لڑکیاں سچ مچ جنگ پر ہو! یا نہیں!!''

وہ کچھ نہیں بولی اور اسے لگا کہ آخر کار وہ اسے جھنجھوڑنے میں کامیاب ہو گیا ہے لیکن اچانک وہ بولی۔

''تم مرد تو چاہتے ہو کہ ہم سب یہی کچھ کریں۔''

''خیر''اس نے کہا۔''میں ایک ایسا مرد ہوں جو نہیں چاہتا کہ تم یہ سب کرو۔تمھیں خاکی جنس میں وہ لڑکی یاد ہے جس نے بے رحمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے چیک پوائنٹ پر میری تلاشی لی تھی؟''

یہ سن کر وہ ہنسنے لگی۔

''میں چاہتا ہوں کہ تم پھر سے وہی لڑکی بن جاؤ۔تمھیں یاد ہے!'' کوئی وگ نہیں اور جہاں تک مجھے یاد ہے کوئی ایئر رنگ کانوں میں نہیں......''

''دیکھو' جھوٹ نہیں......میں نے ایئر رنگ پہن رکھے تھے۔''

''چلو ٹھیک ہے۔لیکن میری بات سمجھ میں آئی کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔

''وہ وقت ہوا ہوا۔اب تو سب بچنا چاہتے ہیں۔اسے کہتے ہیں نمبر چھ۔تم اپنا نمبر ہی نکالو میں اپنا نمبر چھ نکالتی ہوں۔سب کچھ ٹھیک ٹھاک۔

لیفٹننٹ کرنل کی پارٹی میں ایک عجیب سی بات ہو گئی۔لیکن اس کے ہونے سے پہلے سب کچھ ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا۔بکرے کا گوشت، مرغ اور چاول اور ڈھیر ساری دیشی شراب، جس میں سے ایک کا نام انھوں نے ٹریسر رکھ چھوڑا تھا، کیوں کہ وہ حلق کو جلاتی ہوئی نیچے اترتی تھی۔ مذاق کی بات تو یہ تھی کہ بوتل میں دیکھنے پر وہ نارنگی کے رنگ جیسی سیدھی سادی لگتی تھی۔ لیکن سب سے زیادہ جس چیز نے ہنگامہ کھڑا کیا وہ۔ تھی ڈبل روٹی۔اصلی۔ بینڈ بھی اچھا اور لڑکیاں بھی بہت سی تھیں۔ ماحول کو اور بھی بہتر بنانے کے لئے دو گورے آ نکلے جو ریڈ کراس میں تھے۔ساتھ میں لائے وہ ایک بوتل کوریز روکی اور ایک اسکاچ کی۔ پارٹی میں موجود افراد نے پہلے تو ان کا کھڑے ہو کر خیر مقدم کیا اور پھر سبھی دوڑے ایک ایک گھونٹ پانے کے لئے۔ کچھ دیر بعد ایک گورے کے برتاؤ سے لگا کہ اس نے پہلے سے ہی کافی پی رکھی تھی۔جس کا سبب شاید یہ تھا کہ گزشتہ رات ایک پائلٹ جسے وہ اچھی طرح جانتا تھا۔خراب موسم میں راحت کا سامان لاتے وقت ائیر پورٹ پر ہوائی حادثہ کا شکار ہو گیا تھا۔

پارٹی میں اس وقت تک کم لوگوں نے ہی اس حادثہ کے بارے میں سنا تھا۔اس بے ماحول پر فوراً مردنی سی چھا گئی۔ رقص کرتے ہوئے کچھ جوڑے واپس اپنی اپنی سیٹوں پر چلے گئے اور بینڈ بجنا بند ہو گیا۔تب اچانک ہی ریڈ کراس والا آدمی گرج اٹھا۔ایک آدمی نے ''شریف آدمی نے'' کیوں اپنی جان دے دی۔ بے کار میں۔ چارلی کو مارنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔اس بے کار جگہ کے لیے تو بالکل نہیں۔ یہاں ہر چیز سے تعفن اٹھتا ہے۔یہ لڑکیاں بھی جو بن سنور کر، مسکراتی ہوئی یہاں آئی ہیں۔کسی کام کی نہیں ہیں۔مچھلی کا ایک ٹکڑا یا ایک امریکی ڈالر......بس اور یہ ہم بستری کے لئے راضی ہو جاتی ہیں۔''

ابال کے بعد پھیلی ہوئی خاموشی میں ایک نوجوان افسر اس کے پاس گیا اور اسے تین طمانچے جڑ دیے۔

دائیں بائیں......اسے سیٹ سے اٹھا لیا (اس کی آنکھوں میں آنسوؤں جیسا کچھ تھا) اور باہر دھکیل دیا۔ اس کا دوست بھی جس نے اسے خاموش کرانے کی کوشش کی تھی۔ پیچھے پیچھے باہر چلا گیا۔ساکت پارٹی میں ان کی کار کے جانے کی آواز صاف طور پر سنائی دی۔افسر جس نے طمانچے جڑے تھے۔ہاتھ جھاڑتا ہوا اپنی سیٹ پر واپس آ گیا۔

''سالا بے وقوف!'' اس نے رعب دار آواز میں کہا۔سبھی لڑکیوں نے اپنی نظروں سے اسے احساس کرا دیا کہ وہ اسے مرد اور ہیرو سمجھتی ہیں۔

''آپ اسے جانتے ہیں!'' گلیڈس نے نانکوف سے پوچھا۔

اس نے جواب نہیں دیا۔ بلکہ ساری پارٹی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ''وہ نشے میں تھا۔''

''مجھے اس بات کی پرواہ نہیں۔'' افسر نے کہا۔ جب آدمی نشے میں ہوتا ہے تبھی وہ کہتا ہے جو اس کے دل میں ہوتا ہے۔''

''تو تم نے اسے اس بات کے لیے پیٹا جو اس کے من میں تھی۔'' میزبان نے کہا۔
''ایسے ہی احساسات ہونے چاہئیں۔'جو'......''
''شکریہ جناب۔ جو نے سیلوٹ کرتے ہوئے کہا۔
''تو اس کا نام 'جو' ہے۔'' گلیڈس اور اس کی بائیں طرف بیٹھی لڑکی نے ایک دوسرے کی جانب مڑتے ہوئے ایک ساتھ کہا۔

اس وقت نانکوف اور دوسری جانب بیٹھا ایک دوست ایک دوسرے سے دبی زبان میں، بہت ہی دبی زبان میں کہہ رہے تھے کہ حالانکہ وہ آدمی بددماغ اور بےہودہ تھا، لیکن لڑکیوں کے بارے میں اس نے جو کچھ بھی کہا تھا وہ بدقسمتی سے کڑوا سچ تھا۔ صرف کہنے والا آدمی غلط تھا۔

جب ڈانس دوبارہ شروع ہوا تو 'کیپٹن جو' گلیڈس کے پاس آیا اور ڈانس کے لیے کہا۔ اس کے منھ سے الفاظ نکلنے سے قبل ہی وہ کود کر کھڑی ہوگئی۔ تب اسے اچانک یاد آیا، وہ مڑی اور اس نے نانکوف سے اجازت مانگی۔ ساتھ ہی کیپٹن نے بھی مڑ کر کہا۔ ''معاف کیجیے۔''

''جائیے، جائیے'' نانکوف نے دونوں کے درمیان کہیں دیکھتے ہوئے کہا۔

ڈانس دیر تک چلا اور وہ بنا بتائے انھیں دیکھتا رہا۔ کبھی کبھی اوپر سے رسد کا ہوائی جہاز گزرتا تو کوئی یہ کہہ کر بتی گل کر دیتا کہ کہیں دشمن کا جہاز نہ ہو۔ لیکن اصل میں تو یہ اندھیرے میں رقص کرنے کا اور لڑکیوں کو گدگدانے کا بہانہ تھا کیونکہ دشمن کے ہوائی جہازوں کی آواز تو خوب جانی پہچانی تھی۔

گلیڈس جب واپس آئی تو بہت خوف زدہ تھی اور اس نے نانکوف کو اپنے ساتھ رقص کرنے کی درخواست کی۔ لیکن اس نے منع کر دیا۔ ''میری پرواہ مت کرو۔'' میں تو یہاں بیٹھ کر تم لوگوں کو رقص کرتا دیکھ کر مزے لے رہا ہوں۔''
''تو پھر چلئے۔'' گلیڈس نے کہا۔ ''اگر آپ رقص نہیں کریں گے۔''
''لیکن میں تو کبھی رقص نہیں کرتا۔ یقین کرو۔ جاؤ مزے کرو۔''

اس نے اگلا رقص لیفٹننٹ کرنل کے ساتھ کیا اور پھر کیپٹن جو کے ساتھ۔ اس کے بعد نانکوف اسے گھر لے چلنے کے لیے تیار ہو گیا۔ ''مجھے افسوس ہے کہ رقص نہیں کرتا۔'' اس نے کار میں بیٹھتے وقت کہا۔ لیکن میں نے قسم کھائی ہے کہ جب تک یہ جنگ جاری رہے گی میں رقص نہیں کروں گا۔''

گلیڈس نے کچھ نہیں کہا۔

''میں اس پائلٹ جیسے آدمی کے بارے میں سوچ رہا ہوں جو کل رات مارا گیا۔ اس کا تو اس لڑائی سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہ تو ہمارے لیے رسد......''
''مجھے امید ہے کہ اس کا دوست اس جیسا نہیں ہوگا۔'' گلیڈس نے کہا۔

وہ تو اپنے دوست کے سبب اکھڑا ہوا تھا۔ لیکن میں تو یہ کہنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ جب اس جیسے لوگ

مارے جا رہے ہوں ۔ جب مورچے پر ہمارے نو جوان مارے جا رہے ہوں ۔تو ہم لوگوں کو چپ چاپ بیٹھے رہنا اور پارٹیاں کرنا یا رقص کرنا کتنا معقول ہے۔

''لیکن آپ ہی تو مجھے وہاں لے گئے تھے۔'' آخر میں گلیڈس نے اس کی بات سے اختلاف کرتے ہوئے کہا__ ''وہ تو آپ ہی کے دوست ہیں۔ میں تو انھیں جانتی بھی نہیں تھی۔''

دیکھو، میری پیاری گلیڈس ۔ میں تمھیں موردالزام نہیں ٹھہرا رہا ہوں ۔ میں تو تمھیں صرف یہ بتلا رہا ہوں کہ میں رقص کیوں نہیں کرتا۔ خیر چھوڑو! کچھ اور بات کریں......تم اب بھی کل ہی واپس جانے پر آمادہ ہو! میرا ڈرائیور تمھیں پیر کی صبح کام پر، وقت پر پہنچا سکتا ہے۔نہیں؟ چلو، جیسی تمہاری مرضی۔تم خود کی مالک ہو۔''

جس آسانی سے وہ اس کے بستر پر چلی آئی اور جس زبان کا اس نے استعمال کیا وہ سن کر حیرت زدہ تھا۔

''بمباری کرنا چاہتے ہو!'' اس نے پوچھا۔اور جواب کا انتظار کیے بنا بولی'' شروع کرو'' لیکن اپنے سپاہی اندر مت چھوڑنا۔''

ایک بات تو بالکل صاف تھی ۔ وہ کسی فوجی افسر کی داشتہ تھی ۔ دو برس میں کتنا فرق آ گیا تھا۔یہی کیا کم کمال تھا کہ اسے ابھی تک اپنی پہلی زندگی یاد تھی ،اپنا نام یاد تھا؟ اگر مشنری ریڈ کراس والا قصہ دوبارہ ہوا۔اس نے سوچا تو وہ اس کے ساتھ کھڑا ہوگا۔ساری پارٹی کو بتلا دے گا کہ وہ آدمی کتنا سچا ہے۔ساری کی ساری پیڑھی کو ہو کیا گیا ہے؟ کیا یہی ہیں کل کی مائیں؟

لیکن صبح ہوتے ہوئے وہ بہتر محسوس کر رہا تھا اور اس کی رائے میں بھی تازگی آ گئی تھی۔اس نے سوچا کہ گلیڈس تو اس سماج کا ایک چھوٹا سا عکس ہے، جو پوری طرح سڑ گل چکا ہے اور اس میں کیڑے رینگ رہے ہیں۔ لیکن آئین سالم ہے صرف تھوڑی سی گرد جم گئی ہے۔ضرورت ہے تو ایک صاف شفاف کپڑے کی۔'' گلیڈس کے لیے بھی میرا کچھ فرض بنتا ہے۔''اس نے خود سے کہا۔'' وہ چھوٹی سی لڑکی ،جس نے ایک دن مجھے آنے والے خطرات کا احساس کرایا تھا،اب بذات خود خطرے میں ہے۔خطرناک اثر پڑ رہا ہے اس پر۔''

وہ اس خطرناک اثر کی جڑ تک جانا چاہتا تھا۔وہ اثر صرف اس کی اچھے دنوں کی دوست آگسٹا...... یا جو کچھ بھی اس کا نام رہا ہو، کا نہیں تھا اس کی تہہ میں ضرور کوئی آدمی ہوگا۔شاید ان بے رحم بیوپاریوں میں سے ایک جو بیرونی کرنسی کی چوری کرتے ہیں اور نوجوانوں کی زندگیوں کو خطروں میں ڈال کر انھیں دشمنوں کی سرحد کے پار بھیجتے ہیں تا کہ اسمگلنگ کی چیزوں کو سگریٹوں میں بدل کر کروڑوں کمائیں۔ یا پھر ان ٹھیکیداروں میں سے ہوگا جو فوج کو بھیجی جانے والے رسد کی چوری کر کے پیسوں کا پہاڑ بنا رہے ہیں ۔ یا شاید کوئی بزدل فوجی افسر جو بیرکوں کے گندے فقرے اور بہادری کے جھوٹے قصوں سے بھرا ہوا ہوگا۔اس نے گلیڈس کو ڈرائیور کے ساتھ اکیلے ہی بھیجنے کا فیصلہ کیا تھا۔لیکن نہیں، وہ خود جائے گا اور دیکھے گا کہ وہ کہاں رہتی ہے، کچھ نہ کچھ ضرور سامنے آئے گا۔اسی پر وہ گلیڈس کو بچانے کا منصوبہ بنائے گا۔ جیسے جیسے وہ اس ٹرپ کی تیاری کرنے لگا، ہر پل گلیڈس کے متعلق بہتر انداز

میں سوچنے لگا۔ اس نے ایک دن پہلے ریلیف سنیٹر سے ملے راشن کارڈ کا آدھا حصہ اس کے لیے الگ کر دیا۔ حالانکہ حالات خراب تھے، لیکن اس نے سوچا تھا کہ جس لڑکی کے پاس کھانے کے لیے کچھ ہوگا وہ کم للچائے گی۔ وہ ڈبلیوسی سی میں اپنے دوست سے ہر ہفتے اس کے لیے کچھ نہ کچھ دینے کی بات کرے گا۔

تحفے دیکھ کر گلیڈس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ نانکوف کے پاس پیسے زیادہ نہیں تھے، لیکن اس نے جوڑ کر بیس پاؤنڈ بھی اسے تھما دیے۔

''میرے پاس بیرونی کرنسی تو نہیں ہے اور میں جانتا ہوں کہ یہ زیادہ دنوں تک نہیں چل سکتے، لیکن......''

وہ دوڑ کر آئی اور اس سے لپٹ کر رونے لگی۔ اس نے اس کے لبوں پر بوسہ لیا اور آنکھوں کو چوم لیا اور مصیبت زدہ لوگوں کے بارے میں کچھ بدبدایا، جسے وہ سمجھ نہ پائی۔ نانکوف نے سوچا کہ میرے سبب ہی اس نے اپنا وگ اتار کر بیگ میں رکھ لیا ہے۔

''میں چاہتا ہوں کہ تم مجھ سے ایک وعدہ کرو'' اس نے کہا۔

''کیا؟''

''بمباری والے الفاظ اب تم کبھی استعمال نہیں کرو گی۔''

بھیگی آنکھوں سے وہ مسکرائی۔ ''تمھیں پسند نہیں ہے نا۔'' لیکن سبھی لڑکیاں ایسے ہی کہتی ہیں۔''

''خیر تم دوسری لڑکیوں سے الگ ہو۔ وعدہ کرو گی نا!''

''اچھا!''

انھیں نکلنے میں دیر ہو گئی تھی۔ جب وہ گاڑی میں بیٹھے تو گاڑی نے اسٹارٹ ہونے سے انکار کر دیا۔ انجن میں ادھر ادھر ہاتھ مارنے کے بعد ڈرائیور نے کہا کہ بیٹری ڈاؤن ہو گئی ہے۔ نانکوف حیران ہو گیا۔ اسی ہفتے اس نے دو سیل بدلنے کے لیے تیس پاؤنڈ خرچ کیے تھے اور بیٹری بدلنے والے مکینک نے کہا تھا کہ یہ چھ ماہ تک چلے گی۔ نئی بیٹری خریدنے کا تو سوال ہی نہیں اٹھتا تھا، کیونکہ اس کی قیمت دو سو پچاس پاؤنڈ تک جا پہنچی تھی۔ ضرور ڈرائیور نے کوئی لاپرواہی دکھائی ہوگی، اس نے سوچا۔

''یہ کل رات ہوا ہوگا۔'' ڈرائیور نے کہا۔

''کل رات کیا ہوا تھا؟'' نانکوف نے غصے سے پوچھا، یہ سوچتے ہوئے کہ یہ بدتمیزی کی حد ہو گئی ہے، لیکن ڈرائیور کا ایسا کوئی مقصد نہیں تھا۔

''کیونکہ ہم ہیڈ لائیٹس استعمال رہے تھے۔

''تو کیا ہم سے امید کی جاتی ہے کہ ہم لائٹس نہ جلائیں؟ جاؤ، دھکا لگوانے کے لیے کچھ آدمی لے آؤ''

وہ گلیڈس کے ساتھ نکل کر گھر میں واپس چلا آیا اور ڈرائیور پڑوس کے گھروں کے دوسرے نوکروں کو مدد کے لیے ڈھونڈنے نکلا۔ سڑک پر آدھا گھنٹہ آگے پیچھے کرنے کے بعد یا دھکا لگانے والوں کے زور وشور سے چلانے کے بعد گاڑی میں جان واپس آئی اور ایگزاسٹ سے دھویں کے کالے بادل نکلنے لگے ___

جب وہ چلے تو اس کی گھڑی میں ساڑھے آٹھ بجے تھے۔ کچھ میل دور ایک اپاہج سپاہی نے لفٹ کے لیے ہاتھ کا اشارہ کیا۔

''روکو!'' نانکوف چلایا۔ ڈرائیور نے بریک پر اپنا پورا زور لگا دیا اور پھر حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

''تم نے اس سپاہی کو ہاتھ ہلاتے ہوئے نہیں دیکھا؟ واپس چلو اور اسے بٹھاؤ۔''

''معاف کیجیے سر۔'' ڈرائیور نے کہا۔ مجھے پتہ نہیں تھا کہ صاحب لفٹ دینے والے ہیں۔''

''اگر معلوم نہیں تھا تو پوچھ لیتے۔ گاڑی واپس لو۔''

سپاہی، جو کہ نوجوان تھا، پسینے سے شرابور، چکٹ سی خاکی وردی پہنے تھا اور گھٹنے سے نیچے اس کی ٹانگ غائب تھی۔ یہ جان کر کہ کار اس کے لیے رکی تھی وہ صرف احسان مند ہی نہیں بلکہ حیرت زدہ بھی تھا۔ اس نے پہلے لڑکی کو اپنی گھٹیا سی بیساکھیاں پکڑائیں، جنھیں ڈرائیور نے آگے دونوں سیٹوں کے بیچ ٹکا دیا، پھر وہ خود اندر بیٹھ گیا۔

''شکریہ سر!، اس نے گردن پیچھے گھماتے ہوئے کہا۔ اس کی سانس بری طرح پھول رہی تھی۔ میں آپ کا بے حد شکر گزار ہوں میڈم!''

''خوشی تو ہمیں ہے۔'' نانکوف نے کہا۔ ''یہ گھاؤ کہاں لگا۔؟''

''اجومنی پر، سر! دس جنوری کو۔''

کوئی بات نہیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ہمیں بے حد فخر ہے تم نوجوانوں پر۔ سب ختم ہو جانے پر تم لوگوں کو مناسب میڈل ملیں گے۔ یہ ہم یقین دلاتے ہیں۔''

''میں خدا سے آپ کے لیے دعا کروں گا سر!''

اگلے گھنٹے تک وہ خاموش رہے جیسے ہی گاڑی ایک پل کی طرف ڈھلوان سے اتری، کوئی چلایا، شاید ڈرائیور یا سپاہی، ''وہ آ گئے!۔'' بریک کی آواز چیخوں اور آسمان پھٹنے کی آواز میں گھل گئی۔ گاڑی کے رکنے سے پہلے ہی دروازے کھل گئے اور وہ اندھا دھند جھاڑیوں کی جانب دوڑنے لگے۔ گلیڈس نانکوف سے آگے تھی۔ تب اس شور شرابے میں انھوں نے سپاہی کے چیخنے کی آواز سنی۔ ''یہاں آ کر میرے لیے دروازہ کھولو!'' اسے گلیڈس کے رکنے کا احساس ہوا اور پھر وہ اس سے آگے نکل گیا۔ اس نے گلیڈس کو دوڑتے رہنے کا مشورہ دیا۔ تبھی اس ماحول میں ایک اونچی سیٹی کی آواز برچھی کی طرح نیچے گری، زور کی ہلچل کے ساتھ ایک زوردار دھماکہ ہوا اور سب کچھ تتر بتر ہو گیا۔ جس پیڑ سے وہ لگا کھڑا تھا، وہ دور جھاڑیوں میں جا گرا۔ پھر مزید ایک بھیانک سیٹی کی آواز اور آس پاس وہی توڑ پھوڑ، ایک اور......اور اس کے بعد نانکوف کو کچھ سنائی نہیں دیا۔

وہ اٹھا تو چاروں طرف رونے چلانے، چیخنے کی آوازیں تھیں، دھواں تھا، بدبو اور چراند کا ماحول تھا۔ اس نے خود کو گھسیٹا اور ان آوازوں کی طرف چل پڑا۔

دور سے اس نے آنسوؤں اور خون سے لت پت ڈرائیور کو اپنی جانب آتے ہوئے دیکھا۔ پھر اس کی نظر اپنی گاڑی کے پرخچوں اور لڑکی اور سپاہی کی گڈمڈ لاشوں کی اور گئی......اور وہ چلاّ کر ڈھیر ہو گیا۔☆☆☆

دیوانگی

'میڈم'، اس طرف' بڑا ساوگ پہنے چاق و چوبند سیلز گرل نے شہد بھری آواز میں کہا۔ جو کہ سپر مارکیٹ میں کیش مشینوں کی قطار میں سے ایک کو سنبھالے ہوئے تھی۔

مسز ایمنکے نے اپنی بھری ہوئی ٹرالی آہستہ سے اس کی جانب موڑ دی۔''میڈم!'' آپ تو میری طرف آ رہی تھیں۔'' دوسری مشین پر موجود لڑکی نے شکایت کی۔ اسے لگا کہ اس کے ساتھ دھوکہ ہوا ہے۔

''اوہ، ساری، مائی ڈیئر، اگلی بار!''

''گڈ آفٹرنون میڈم!'' لڑکی نے اس کی خریدی ہوئی چیزوں کو کاونٹر پر رکھتے ہوئے شہد بھری آواز میں کہا۔

''کیش یا اکاؤنٹ میڈم!''

''کیش''

اس نے چابکدستی کا مظاہرہ کرتے ہوئے قیمتوں کے مطابق بٹن دبا کر فوراً فیصلہ سنا دیا۔ نو پاؤنڈ، پندرہ اور چھ، مسز ایمنکے نے اپنا پرس کھولا، اس میں سے چھوٹا پرس نکالا، زپ کھولی اور دو نئے کڑکڑاتے ہوئے پانچ پاؤنڈ کے نوٹ نکالے۔ لڑکی نے پھر بٹن دبائے اور مشین سے ایک کیش ٹرے باہر نکلی۔ لڑکی نے میڈم کے نوٹ رکھ لیے اور انھیں چینج اور ایک فٹ لمبی رسید تھما دی۔ مسز ایمنکے نے کاغذ کے لمبے پرچے کے نچلے حصے پر نظر ڈالی، جہاں پر مشین نے ان کی قیمت خرید کے کل میزان کے ساتھ ''شکریہ'' ''دوبارہ تشریف لائیے'' جیسے الفاظ چھاپ دیے تھے۔ انھوں نے سر ہلایا۔

اس موقع پر پہلی مشکل پیش آئی۔ میڈم کی خریدی ہوئی چیزوں کو کارٹن میں رکھ کر باہر کھڑی ان کی گاڑی تک لے جانے کے لیے کوئی بھی نہیں تھا۔

''یہ لڑکے کہاں ہیں؟'' لڑکی نے کہا۔

معاف کیجیئے میڈم، ہمارے بہت سے سامان ڈھونے والے لڑکے چلے گئے ہیں۔ اس مفت پرائمری،

’’جان......‘‘ جیسے ہی اس کی نظر باقی ماندہ لڑکوں میں سے ایک پر پڑی۔ وہ زور سے چلائی ’’یہاں آؤ اور میڈم کا سامان پیک کرو۔‘‘

جان تقریباً چالیس برس کا تھا جو لنگڑا کر چل رہا تھا اور اسے سپر مارکیٹ کے ائیر کنڈیشنڈ ہال میں بھی پسینہ آرہا تھا۔ چیزیں خالی کارٹن میں ڈالتے ہوئے وہ زور زور سے شکایت کرنے لگا۔ ’’میں منیجر سے کہوں گا کہ ایسا گھٹیا کام کرنے کے لیے کوئی دوسرا آدمی رکھ لیں۔‘‘

’’تم یہ تو نہیں کہہ رہے ہو کہ مفت پرائمری میں مت جاؤ۔‘‘ وگ والی لڑکی نے مذاقاً کہا۔

’’ٹھیک ہے، لیکن مفت پرائمری کے لیے میں مرا بھی تو نہیں جا رہا ہوں۔‘‘

باہر کار پارک میں اس نے مسز ایمنکے کی سلیٹی رنگ کی مرسیڈیز میں کارٹن رکھ دیا۔ سیدھے کھڑے ہو کر انتظار کیا۔ انھوں نے اپنا پرس کھولا، پھر چھوٹا پرس، ایک انگلی سے بہت سے سکوں کو ادھر ادھر کیا دو انگلیوں میں پکڑ کر انھیں باہر نکالا اور سامان ڈھونے والے کی ہتھیلی پر گرا دیا۔ وہ کچھ دیر تک سکے کو دیکھتا رہا پھر بنا کچھ کہے لنگڑاتا ہوا چل دیا۔

مسز ایمنکے نے چھوٹے لڑکوں کی جگہ کام کرنے والے ان بوڑھوں کی کبھی پرواہ نہیں کی۔ چاہے انھیں آپ کچھ بھی دے دیں۔ یہ کبھی خوش نہیں ہوتے۔ اس شکایت کرنے والے لڑکے کو ہی دیکھو۔ ایک چھوٹے سے کارٹن کو کچھ گز اٹھا کر لانے کے لیے اسے کیا چاہیے؟ یہی تو کیا ہے مفت پرائمری تعلیم نے۔ گھروں کے کام کرنے کے لیے تو حالات اس سے بدتر ہو گئے تھے۔ جس میں اس کی بے بی نرس بھی تھی۔ بے بی نرس کا مسئلہ سب سے کٹھن تھا۔ ایک نوکری پیشہ خاتون اپنے سات ماہ کے بچے کا کیا کرے؟

لیکن یہ مسئلہ زیادہ دنوں تک نہیں رہا۔ دیوالیہ ہو جانے کے خوف سے سرکار نے ایک ہی میقات کے بعد اسکیم کو واپس لے لیا۔ شاید ماہرین کے مشورے پر شروعات میں آٹھ نو سو بچوں کے لیے یہ منصوبہ بنایا گیا تھا۔ لیکن اسکول میں پہلے ہی دن پندرہ سو بچے حاضر ہو گئے۔ باقی کہاں سے آئے؟ کیا ماہرین نے سرکار کو گمراہ کیا تھا؟ ریڈیو پر ایک انٹرویو کے دوران بڑے عہدے پر فائز ایک تحسیب کار نے غلط حساب کے الزام کو بکواس بتلایا۔ اصل گڑبڑ یہ ہوئی تھی کہ کچھ بے ایمان لوگوں نے آس پاس کی ریاستوں سے ہزاروں کی تعداد میں بچے لا کر انھیں غیر قانونی طریقوں سے داخل کروا دیا تھا، جو واضح طور پر سبوتاژ کا کیس تھا۔

سبب جو بھی رہا ہو، سرکار نے اسکیم منسوخ کر دی۔ ’’نیوا ایج‘‘ نے اپنے اداریے میں وزیر اعظم کی سوجھ بوجھ اور حوصلے کی تعریف کی، لیکن ساتھ ہی کہا کہ اگر سرکار نے پہلے ہی کچھ جانکار اور ذمہ دار لوگوں کی بات مان لی ہوتی تو اس شرمناک واقعہ سے دامن بچایا جا سکتا تھا۔ یہ سچ بھی تھا کیونکہ ’’نیوا ایج‘‘ کے صفحات پر ماہرین نے مفت تعلیم کے بارے میں اپنے شکوک وشبہات کا اظہار کیا تھا۔ اپنے صفحات میں واضح طور پر اس اخبار نے کہا تھا کہ ملک کے حق میں یہ بات کہی جا رہی ہے۔ اخبار نے چیلنج کیا تھا کہ اس سے بہتر وطن پرستی کی ایک بھی مثال ہو تو

بتائیں ۔لیکن اس کے کسی بھی ناقد نے اس چیلنج کو قبول نہیں کیا تھا۔ ہاں ''نیو ایج'' کی تجویز کو لوگوں نے پر جوش انداز میں قبول کیا تھا اور دس روز کے اندر ہی بلا ناغہ دو یا تین مضامین کے حساب سے بہت سے لوگوں نے اس اسکیم کے خلاف مضامین قلمبند کئے تھے۔ان میں وکیل ،ڈاکٹر ،تاجر،انجینئر،سلیس مین ،انشورنس دلال، یونیورسٹی کے پروفیسر وغیرہ سبھی تھے۔انھوں نے کہا تھا کہ بچوں کی تعلیم کے خلاف کوئی بھی نہیں ہے۔لیکن مفت تعلیم کا ابھی وقت نہیں آیا ہے۔کسی نے دلیل دی کہ اپنی ساری دولت اور طاقت کے باوجود امریکہ نے ابھی تک اس طرح کے منصوبے پر عمل نہیں کیا۔ ہماری بساط ہی کیا ہے؟

مسز ایمنکے نے پر جوش انداز میں ان مضامین کا مطالبہ کیا۔ کاش سرکاری افسر بھی اخبارات میں لکھنے کے لیے آزاد ہوتے۔انھوں نے کم از کم تین چار مرتبہ اپنی بیوی سے یہ جملہ کہا۔

یہ خیال برا تو نہیں ہے،لیکن اخبار کو بتانا چاہئے تھا کہ اس ملک نے آزادی کے بعد تعلیم کے میدان میں کافی ترقی کی ہے۔آج والدین تعلیم کی اہمیت سے واقف ہیں اور اپنے بچوں کی اسکولی فیس حاصل کرنے کے لیے وہ ہر طرح کی قربانی دینے کو تیار ہیں۔ یہ ملک اولیور تو سٹو کا ملک نہیں ہے۔''

لیکن ان حالات میں ان کی بیوی اس بحث کے لیے تیار نہیں تھی۔سبھی کچھ تو ابھی وقتی تھا۔مفت تعلیم سے متعلق اس کے من میں کچھ غیر واضح مبہم اور ذاتی شکوک موجود تھے۔ بات اتنی ہی تھی۔

''تم نے اخبار دیکھا ہے؟ ماٹک نے اس موضوع پر لکھا ہے۔اس کے شوہر نے ایک موقع پر کہا۔

''ماٹک کون ہے؟''

''ماٹک،اوگاڈ''

''اچھا کیا کہتا ہے وہ!''

میں نے ابھی پڑھا نہیں ،ہاں، سچ کو سچ کہنے کی جرأت صرف ماٹک میں ہے۔ دیکھو،کس طرح شروعات کی ہے۔

''مفت تعلیم کا مطلب ہے ننگا کمیونزم۔ بات سچ نہ بھی ہو تو ماٹک کا خاص اسلوب مضمون پر حاوی ہوتا ہے۔اس کا خیال ہے کہ کہیں سرکار اس کی جہاز کمپنی کو بھی نہ ہتھیا لے۔ وہ بھی کمیونزم سے خوف زدہ ہے

''لیکن یہاں کمیونزم چاہتا کون ہے؟''

''کوئی نہیں ،ابھی میں نے اس روز کلب میں کہا تھا۔لیکن وہ تو بے حد خوف زدہ ہے۔ایک بات جانتی ہو!'' زیادہ دولت ہونا بھی بری بات ہے۔'' ایمنکے خاندان میں یہ بحث اس روز ذہنی سطح تک ہی رہی۔ایک دن ان کے چھوٹے چھوکرے نے جو خانساماں کی مدد کرتا تھا اور ایسٹورڈ سے سیکھ رہا تھا،اعلان نہیں کر دیا کہ اسے اپنے بیمار باپ کو دیکھنے کے لیے جانا ہے۔

''تمھیں کیسے معلوم ہوا کہ تمہارا باپ بیمار ہے؟'' میڈم نے پوچھا۔

''میرے بھائی نے یہاں آکر مجھے بتایا۔''
''تمہارا بھائی کب آیا تھا یہاں؟''
''کل شام کے وقت''
''تم اسے مجھ سے ملوانے کیوں نہیں لائے!''
''مجھے کیا پتہ تھا کہ آپ اس سے ملنا چاہتی ہیں۔''
''تم نے کل کیوں نہیں بتایا؟'' مسز ایمنکے نے پھر اخبار سے سر ڈھاتے ہوئے کہا۔
پہلے میں نے سوچا کہ گھر نہیں جاؤں گا۔لیکن آج دل مجبور کر رہا ہے کہ تم اسے دیکھنے جاؤ۔شاید وہ زیادہ بیمار ہے......، جاؤ۔لیکن کل دوپہر تک واپس آجانا، ورنہ......
''میں کل تک ضرور لوٹ آؤں گا۔''
مگر وہ لوٹ کر نہیں آیا۔مسز ایمنکے بہت ناراض ہوئیں۔خاص طور پر جھوٹ سے۔انھیں کوئی نوکر بے وقوف بنائے یہ قطعی پسند نہیں تھا۔خود کو چالاک سمجھنے والے اس چھوٹے سے چوہے کو ہی دیکھو نا' اس کے گزشتہ ہاؤبھاؤ سے ہی انھیں علم ہو جانا چاہیے تھا۔اب وہ غائب ہو گیا ایک ماہ کی تنخواہ لے کر۔جسے نوٹس کے بدلے چھوڑ دینا چاہیے تھا۔اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ ان لوگوں پر رحم کرنا بے سود ہے۔
ایک ہفتے کے بعد مالی نے بھی نوٹس دے دیا۔اس نے کوئی بات پوشیدہ رکھنے کی کوشش نہیں کی۔اس کے بڑے بھائی نے اسے پیغام بھیجا تھا کہ گاؤں لوٹ آؤ اور مفت تعلیم کے لیے خود کو رجسٹر کروالو۔مسز ایمنکے نے اسے گاؤں والوں کی لاعلمی اور بے وقوفی کے بارے میں سمجھانے کی کوشش کی۔''مفت پرائمری تعلیم بچوں کے لیے ہے۔تم جیسے بوڑھوں کو کون اسکول میں داخل کرے گا۔تمہاری عمر کتنی ہے؟''
''مسز میں پندرہ سال کا ہوں۔''
''تم تو صرف تین سال کے ہو۔'' مسز ایمنکے نے مذاق اڑایا۔''ابھی تم دودھ پیتے بچے ہو۔''
''تم پندرہ سال کے نہیں ہو۔تم کم از کم بیس سال کے ہو اور کوئی ہیڈ ماسٹر تمہیں پرائمری اسکول میں بھرتی نہیں کرے گا۔اگر تم کوشش ہی کرنا چاہتے ہو تو ضرور کرو۔لیکن ایک بار چلے جاؤ تب ناکام ہونے کے بعد واپس مت آنا۔''
''سر، میں ناکام نہیں ہوسکتا۔'' مالی نے کہا۔ہمارے گاؤں میں ایک بوڑھا میرے باپ سے بھی بڑا ہے وہ رجسٹر ہو گیا ہے۔وہ مجسٹریٹ کے پاس گیا اور اس نے پانچ شیلنگ دیے۔کورٹ نے اس سے قسم لی، جیسے قتل کرنے کے جرم میں قسم لی جاتی ہے۔وہ تو چوہے کو بھی نہیں مار سکتا۔''
''خیر، تمہاری مرضی۔تمہارا کام تو اچھا رہا ہے، لیکن......''
''مارک، یہ طویل بحث کس لیے۔وہ جانا چاہتا ہے تو اسے جانے دو۔''
''میڈم، میں جانا تو نہیں چاہتا مگر میرے بڑے بھائی نے......''

''ہم یہ سب سن چکے ہیں۔تم اب جا سکتے ہو۔''
''لیکن میں آج نہیں جاؤں گا۔میں ایک ہفتے کا نوٹس دیتا ہوں،اور میں میڈم کو دوسرا مالی ڈھونڈ کر لاتا ہوں۔''
''نوٹس یا دوسرے مالی کی تم فکر مت کرو۔بس چلے جاؤ۔''
''مجھے تنخواہ ابھی دیں گے یا دوپہر کے وقت آؤں۔''
''کون سی تنخواہ؟''
''میڈم،اس مہینے کے دس دن کام کیا ہوں۔''
''مجھے مزید غصہ مت دلاؤ۔بس چلے جاؤ۔''

لیکن مسز ایمنکے کے لیے اصل سر درد آنا ابھی باقی تھا۔دو دن کے بعد جب وہ تیار ہو رہی تھی،ابیکیل ،بے بی نرس آئی، بچے کو ان کی گود میں پٹکا اور چلی گئی...... یہ ابیکیل بھی! اتنا سب کچھ اس کے لیے کیا مگر اس کے باوجود! ابیکیل جسے کچھ بھی نہیں آتا تھا۔جو سینیٹری ٹاویل کی جگہ پرانے کپڑے استعمال کرتی تھی جو کہ اتنی بے وقوف تھی کہ ایک دن بچے کو چپ کرانے کے لیے اس نے ایک پورا کٹورا پانی پلا دیا تھا اور اس میں تھوڑا نمک بھی جھونک دیا تھا۔وہی ابیکیل اب لیڈی بن گئی ہے۔وہ سلائی کر سکتی ہے۔بیک کر سکتی ہے۔برا اور صاف پینٹی پہنتی ہے ،پاؤڈر اور سنیٹ لگاتی ہے اور اپنے بال سیدھے کر سکتی ہے،اور اب وہ جانے کے لیے تیار ہے۔

اس دن سے ہی مسز ایمنکے کو'مفت پرائمری تعلیم' سے ہی نفرت ہو گئی۔الفاظ جو روزمرہ کی زبان کا حصہ بن گئے تھے۔بطور خاص گاؤں میں'جہاں انھیں' 'مفت پرائمدؤ' کہا جاتا تھا۔انھیں غصہ خاص طور پر اس وقت آتا تھا جب لوگ اس بات کا مذاق اڑاتے تھے۔ان کا جی چاہتا تھا کی جذبات اور احساسات کی کمی کے لیے ان لوگوں کا سر توڑ دینا چاہیے۔اور انھیں امریکیوں اور سفارت خانوں سے نفرت تھی۔کیوں کہ وہ اپنے سرمایے کے بل پر بچے ہوئے افریقی نوکروں کو جھانسہ دے رہے تھے۔یہ تب شروع ہوا جب پتہ چلا کہ ان کا مالی اسکول نہیں گیا، بلکہ فورڈ فاؤنڈیشن کے ایک آدمی کے یہاں چلا گیا،جس نے سات پاؤنڈ کے علاوہ اسے ایک سائیکل خرید کر دی ہے اور اس کی بیوی کے لیے ایک سلائی مشین۔

''ایسا کیوں کرتے ہیں یہ لوگ؟''انھوں نے پوچھا۔انھیں کسی جواب کی امید یا ضرورت نہیں تھی، لیکن پھر بھی ان کے شوہر نے جواب دیا۔''کیوں کہ وہ لوگ امریکہ میں نوکر نہیں رکھ پاتے ہیں اور جب وہ یہاں آتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ نوکر کتنے سستے ہیں تو وہ پاگل ہو جاتے ہیں۔اس لیے۔''

تین ماہ بعد مفت پرائمری تعلیم ختم کر دی گئی اور اسکولوں میں فیس لوٹ آئی۔تب تک سرکار کی سمجھ میں یہ بات آئی تھی کہ اس کا بے وقوفی بھرا سماج واد......(یہ نام اسے نیوا ایج نے دیا تھا) افریقی حالات میں کام نہیں کر سکتا تھا۔یہ وزیر تعلیم پر چھینٹا کشی تھی جو اشترا کیت کے لیے اپنے دل میں نرم گوشہ رکھنے کے معاملے میں بدنام تھے

اور بااثر وزیر مالیات کے ساتھ ہمیشہ رسہ کشی میں جٹے رہتے تھے۔

''اگر ہم نئے ٹیکس لگانے کو تیار نہیں ہیں تو اس اسکیم کو لاگو نہیں کر سکتے۔'' وزیر مالیات نے کیبنٹ کی میٹنگ میں کہا۔

''تو ٹھیک ہے لگاؤ ٹیکس'' وزیر تعلیم نے کہا۔ یہ سن کر اس کے ساتھیوں نے مذاق اڑایا۔ سکریٹریوں نے بھی ان کا ساتھ دیا، حالاں کہ پروٹوکول کے مطابق انھیں بحث یا مذاق میں حصہ نہیں لینا چاہیے۔

''ٹیکس نہیں لگا سکتے۔'' وزیر تعلیم نے ہنسی کو دباتے ہوئے پیار سے کہا ''میں جانتا ہوں کہ میرے محترم دوست کو کوئی فرق نہیں پڑتا کہ یہ سرکار اپنی مدت پوری کر سکے یا نہیں، لیکن ہم میں سے کچھ لوگوں کو اس کی پروا ہے۔ میں بذات خود اس وقت تک یہاں رہنا چاہوں گا جب تک کہ اپنے انتخابی اخراجات کی بھرپائی نہ ہو جائے۔''

اس بات پر زوردار قہقہے گونجے اور ہیئر ...... ہیئر کی آوازوں سے اس کا خیر مقدم کیا گیا۔ بحث کرنے میں وزیر تعلیم وزیر مالیات کا قطعی مقابلہ نہیں کر پاتے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ ساری کابینہ میں وزیر اعظم کے علاوہ کوئی بھی مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔

''ہمیں اس بارے میں کوئی غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے'' اس نے اپنے چہرے اور آواز کو سنجیدہ بناتے ہوئے کہا کہ اگر کوئی ہماری مصیبت کی ماری عوام پر نئے ٹیکس تھوپنے کی بے وقوفی کرے گا......

''میرا تو خیال تھا کہ افریقہ میں عوام بستے ہی نہیں ہیں۔'' وزیر تعلیم نے طنزیہ کہا، جس کی وجہ سے ہلکی سی ہنسی کی آواز ہوئی ایک دو نے اسے مذاق کے طور پر لیا۔

مجھے اپنے محترم دوست کے شعبے میں دخل در معقولات کا ملال ہے۔ کمیونسٹ نعرے ہوتے ہی ہیں متاثر کرنے والے۔ لیکن جیسا کہ میں عرض کر رہا تھا کہ ہمیں نئے ٹیکس کے بارے میں اس قدر لاپرواہی سے بات نہیں کرنی چاہیے۔ ہاں، اگر ہم فوج کے ذریعے فسادات کو روکنے کے لیے تیار ہیں تو بات دوسری ہے۔ زندگی کا ایک عام سچ تو ہم نے کافی تکلیف اور بے دلی سے سیکھا ہے اور مجھے یقین ہے کہ ہم سبھی نے اسے سیکھ لیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ لوگ ٹیکس کے مخالف نہیں ہیں۔ سبب واضح ہے۔ ہر ایک، یہاں تک کہ کار پارک کا دلال بھی جانتا ہے کہ اسکول کی فیس کس لیے ہوتی ہے؟ وہ صبح اپنے بچوں کو اسکول جاتے ہوئے اور دوپہر بعد لوٹتے ہوئے دیکھ سکتا ہے لیکن آپ اسے عام سے ٹیکس کے بارے میں سمجھائیے تو سوچنے لگتا ہے سرکار اس کا پیسہ چرا رہی ہے۔ ایک بات اور۔ اگر کوئی اسکول کی فیس ادا نہیں کرنا چاہتا تو اس پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ آخر ہمارے ملک میں جمہوریت ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ اس کا بچہ گھر پر رہے گا۔ اس حالت پر اسے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ لیکن ٹیکس کی بات الگ ہے۔ کوئی چاہے یا نہ چاہے، ٹیکس اسے ادا کرنا ہی ہے۔ فرق ایک دم واضح ہے۔ اسی لیے اس کے خلاف بھیڑ فسادات کرواتی ہے۔'' کچھ لوگوں نے ہیئر ...... ہیئر کہا۔ کچھ نے راحت کی سانس لی۔ مسٹر ایمنکے جو پالتو گدھے کی طرح سر ہلا رہے تھے، زور زور سے ہیئر ہیئر چلا اٹھے۔ اس حرکت کی وجہ سے وزیر اعظم نے انھیں غصے سے دیکھا

پھر مزید کچھ بوریت پیدا کرنے والی تقاریر ہوئیں اور سرکار نے فیصلہ کرلیا کہ مفت تعلیم کو ختم نہ کیا جائے۔ لیکن جب تک سبھی اسباب و علل کی جانچ نہ کر لی جائے تب تک کے لیے اس منصوبے پر عمل آوری نہ کی جائے۔

دس برس کی ویرونیا کا دل ہی ٹوٹ گیا۔ اسے اسکول سے لگاؤ پیدا ہو گیا تھا۔ کیونکہ اسی سبب وہ گھر کی بوریت اور کاموں سے بھاگ سکتی تھی۔ اس کی ماں بیوہ اور بے سہارا تھی اور سارا دن کھیت میں رہتی تھی یا ہاٹ کے دن ہاٹ میں رہتی تھی۔ چھوٹے بچوں کی دیکھ ریکھ کی ذمہ داری اس نے ویرونیا پر ہی ڈال رکھی تھی۔ درحقیقت دیکھ ریکھ کی ضرورت سب سے چھوٹے بچے کو ہی تھی۔ جس کی عمر ایک سال تھی۔ باقی دو جن کی عمریں سات اور چار برس کی تھیں وہ اپنی دیکھ بھال خود کر سکتے تھے۔ پام کی گیریاں اور کھانے کے لیے ٹڈّیاں پکڑنے کے عمل میں مصروف وہ ویرینیا کے لیے دردِ سر نہیں تھے لیکن میری کی بات اور تھی۔ وہ دوپہر میں کھانے کے باوجود روتی رہتی۔ میری ابھی پام کی گیریاں اپنے آپ چبا نہیں سکتی تھی اس لیے ویرونیا انھیں آدھا چبا کر اسے دے دیتی تھی۔ لیکن ان سب کے باوجود وہ مطمئن نہیں ہوتی۔ حالاں کہ اس کا پیٹ ڈھول کی طرح موٹا اور سخت ہو جاتا اور آئینے جیسا چمکتا رہتا۔

اس کی ماں مارتھا بدقسمت تھی۔ کئی برس پہلے اس نے سینٹ مونیکا اسکول میں ابتدائی تعلیم کی اچھی شروعات کی تھی۔ اسکول سفید فام مشنری خواتین کے ذریعے افریقی ایونجلسٹوں کی ہونے والی بیویوں کی ٹریننگ کے لیے کھولا گیا تھا۔ انھیں اس کی کلاس کی زیادہ تر طالبات نے اپنے اساتذہ سے بیاہ رچا لیا تھا۔ اور آج وہ پادریوں کی بیویاں تھیں، ایک دو تو بشپ کی بیویاں تھیں، لیکن اپنی ٹیچر مس رابنسن کے کہنے پر اس نے ایک نوجوان بڑھئی سے شادی کر لی تھی، جس نے گورے مشنریوں کے ہاتھوں ٹریننگ حاصل کی تھی۔ اس ٹریننگ اسکول کو اس امید کے ساتھ شروع کیا گیا تھا کہ اگر سیاہ فاموں کو باقی رکھنا ہے تو انھیں دست کاری کے ساتھ بائبل کا علم بھی ہونا چاہیے۔ (مس رابنسن اس انڈسٹریل مشن کے بارے میں کافی پرجوش تھیں اور بعد میں انھوں نے اس کے پرنسپل سے شادی بھی کر لی) لیکن ان دنوں کے ایونجلیکل جوش کے باوجود بڑھئی گیری کو فروغ حاصل نہ ہو سکا جتنا فروغ پادریوں اور اساتذہ کے کاروبار میں ہوا۔ اس لیے جب مارتھا کے شوہر کی موت ہوئی (جیسا کہ ان مشنری دست کاروں کا کہنا تھا، جب اسے اس خدا کے ذریعے جو بذاتِ خود زمین پر بڑھئی بنا تھا، جنت میں خدمات کے لیے بلا لیا گیا) تو وہ اسے پوری طرح بربادی کی حالت میں چھوڑ گیا۔ یہ شادی تو پہلے ہی ناکام تھی۔ شادی کے بعد مارتھا کو پورے بیس سال تک انتظار کرنا پڑا تھا پہلے بچے کا منھ دیکھنے کے لیے۔ اسی سبب اب وہ تقریباً بوڑھی ہو چکی تھی اور ابھی اسکے بچے چھوٹے چھوٹے ہی تھے۔ اس میں ان کی پرورش کی طاقت باقی نہیں تھی۔ لیکن اسے اس بات کا شکوہ نہیں تھا وہ یہ کہ مرنے سے قبل پانچ برس تک بیماری کے سبب اس کے شوہر کے دائیں ہاتھ کو لقوہ مار گیا تھا۔ یہ امتحان بے حد سخت اور مشکل امر تھا۔

ویرونیا کے اسکول چھوڑ دینے کے کچھ دنوں کے بعد ہی مسٹر مارک ایمنکے جو کہ ان کے اپنے گاؤں کے رہنے والے تھے۔ مگر اعلیٰ عہدے دار کی حیثیت سے راجدھانی میں رہتے تھے۔ مارتھا سے ملنے آئے۔ ان کی مرسیڈیز 220 مین روڈ کے کنارے آ کر رکی اور تنگ راستے پر، جس سے موٹر کار نہیں گزر سکتی تھی، پانچ سو گز پیدل

چل کر وہ بیوہ مارتھا کی جھونپڑی تک پہنچے۔ اتنے بڑے آدمی کے گھر آنے کی وجہ مارتھا کی سمجھ میں نہیں آئی۔ اور سپاری ڈھونڈنے کے لیے گھر بھر میں دوڑ دھوپ کرتی ہوئی وہ اس بات پر تعجب کرتی رہی۔ لیکن اس بڑے آدمی نے موجودہ دور کے بڑے لوگوں کی طرح یہ گتھی فوراً ہی سلجھا دی۔ ''ہم اپنے چھوٹے بچے کی دیکھ بھال کے لیے ایک لڑکی کی تلاش میں ہیں اور آج مجھے کسی نے تمہاری لڑکی کے بارے میں جانکاری لینے کے لیے کہا ہے......

پہلے تو مارتھا تیار نہیں ہوئی۔ لیکن جب اس بڑے آدمی نے پہلے سال کی خدمات کے لیے لڑکی کو پانچ پاؤنڈ ساتھ ہی کھانا، کپڑے اور دیگر چیزوں کی پیش کش کی تو وہ پسیج گئی۔

''مجھے پیسوں کی پرواہ نہیں، اس نے کہا، لیکن میری لڑکی کا خیال اچھی طرح رکھا جائے گا نا!۔''

اس کی تم بالکل فکر مت کرو۔ ماں' اس کی دیکھ بھال ہمارے اپنے بچوں کی طرح ہی ہوگی۔ میری بیوی ایک سوشیل ویلفیئر آفیسر ہے اور اس وجہ سے اچھی طرح جانتی ہے کہ بچوں کی دیکھ بھال کس طرح کی جاتی ہے۔ تمہاری لڑکی ہمارے گھر میں خوش رہے گی۔ جب میری بیوی دفتر میں ہوگی اور بڑے بچے اسکول میں، تو اس کا کام ہوگا صرف چھوٹے بچے کو اٹھا کر اسے دودھ دینا۔''

''ویرونیا اور جوائے بھی پچھلے ٹرم اسکول میں تھے۔'' مارتھا نے کہا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس نے ایسا کیوں کہا؟ ہاں، میں جانتا ہوں۔ یہ جوسرکار نے کیا برا کیا۔ بہت ہی برا۔ لیکن مجھے بھروسہ ہے کہ جس بچے کو کچھ بننا ہی ہے تو وہ بنے گا ہی، چاہے وہ اسکول جائے یا نہ جائے۔ یہ سب لکھا ہے اس ہتھیلی پر۔''

مارتھا فرش پر دیکھتی رہی، پھر آنکھیں اوپر اٹھائے بنا بولی ''جب میں نے بیاہ کیا تھا تو اپنے آپ سے کہا تھا کہ میری بچیاں مجھ سے زیادہ پڑھی لکھی ہوں گی۔ میں نے ان دنوں تیسرے درجے تک پڑھائی کی تھی اور سوچا کہ یہ سب تو کالج جائیں گی۔ لیکن اب وہ اتنی تعلیم بھی حاصل نہیں کر پائیں گی جتنی میں نے تیس برس قبل حاصل کی تھی۔ یہ سب سوچ کر میری چھاتی پھٹنے لگتی ہے۔''

''ماں، اس کی زیادہ فکر مت کرو۔ جیسا کہ میں نے ابھی کہا، جسے جو بننا ہے وہ یہاں لکھا ہوا ہے۔ چاہے کیسی مشکلات کیوں نہ آئیں۔''

''ایسا ہی ہو......اور جہاں تک اس لڑکی کا سوال ہے، یہ اگر ہمارے گھر میں ایمان داری اور اچھے طریقے سے رہی تو بچے بڑے ہو جانے پر میری بیوی اور میں اسے اسکول بھیجنے کی ذمہ داری لیتے ہیں۔ یہ تو ابھی بچی ہے۔ کیا عمر ہے اس کی؟''

''یہی، دس سال کی ہے۔''

''دیکھا، یہ تو ابھی بچی ہی ہے۔ اس کے اسکول جانے میں تو ابھی کافی وقت ہے۔'' وہ جانتے تھے کہ اسے اسکول بھیجنے کا جملہ صرف کہنے کی حد تک ہی ہے۔ مارتھا بھی جانتی تھی، لیکن ویرونیا جو قریب کے کمرے میں ایک اندھیرے کونے سے سب کچھ سن رہی تھی وہ نہیں جانتی تھی۔ اس نے فوراً اپنے دماغ میں بچے کے بڑے

ہونے کے وقت کا حساب لگایا۔تو وہ کافی وقت تھا۔اس لیے وہ بڑے آدمی کے گھر راجدھانی میں رہنے کے لیے خوشی خوشی چلی گئی اور اس بچے کی دیکھ بھال کرنے لگی جو جلد ہی بڑا ہوکر اپنے سارے کام خود کرنے کے قابل ہو جائے گا اور تب اسے اسکول جانے کا موقع ملے گا۔

ایک اچھا نوکر نہ ملنے کی وجہ سے مسز ایمنکے کافی دکھی ہوچکی تھیں، مگر اب مفت پرائمری تعلیم کی ناکامی پر قہقہہ لگا سکتی تھیں۔انھوں نے اپنے دوستوں سے کہنا شروع کیا کہ وہ اب کہیں بھی آجا سکتی تھیں۔وہ ویرونیا کے کام اور برتاؤ سے اس قدر خوش تھیں کہ انھوں نے اسے چھوٹی میڈم کا نام دے دیا تھا۔ ابیگیل کے چلے جانے کا برا خواب اب ختم ہوگیا تھا۔انھوں نے دوسری بے بی نرس تلاش کرنے میں زمین آسمان چھان مارا تھا،لیکن کوئی نہیں ملی۔ایک پختہ عمر کی عورت نے خود کو پیش کر کے سات پاؤنڈ ماہانہ تنخواہ کی مانگ کی تھی۔لیکن اس کے ہاؤ بھاؤ ایمپلائمنٹ ایکسچینج والیوں کی طرح تھے، جو لیبر کورٹ کے تحت اپنے ہر حق کو جانتی ہیں، جس میں شاید سرونٹ کوارٹر میں اسقاط حمل کرانے کا اور آپ کے شوہر کو ہتھیانے کی کوشش کرنے کا حق بھی شامل ہوتا ہے۔اس لیے نہیں کہ مارک اس قسم کا شوہر ہے لیکن وہ عورت ہی ٹھیک نہیں تھی۔اس کے بعد سے اب تک کوئی نہیں آیا تھا۔

ہر روز صبح ایمنکے خاندان کے بڑے بچے، تین لڑکیاں اور ایک لڑکا۔اپنے والد کی مرسیڈیز میں یا اپنے والدہ کی چھوٹی سی شور مچانے والی فیئٹ کار میں جانے لگے تو ویرونیا چھوٹے بچے کو بائے بائے کرانے کے لیے سیڑھیوں پر لے آئی۔اسے ان کے بہترین کپڑے اور جوتے پسند تھے۔اس نے اپنی زندگی میں کبھی جوتے نہیں پہنے تھے لیکن اسے جو چیز سب سے زیادہ پسند تھی وہ ان کا روز جانا، گھر سے باہر جانا، روزمرہ کی چیزوں اور کاموں سے پرے چلے جانا۔ پہلے مہینے میں تو یہ چبھن کم کم تھی۔وہ اس کے گاؤں سے دور چلے آنے کی خوشی کے نیچے دبی ہوئی تھی۔ خوشی جو ماں کی جھونپڑی، پام گیریوں اور بنا مچھلی کے کڑوی پتیوں کے سوپ، جس کے پینے سے دوپہر تک آنتیں اینٹھنے لگتی تھیں۔ان سب سے نجات پانے پر خوشی حاصل ہوئی تھی۔وہاں سے چلے آنا تو بہت بڑی بات تھی۔لیکن جیسے جیسے مہینے گزرتے گیے، اچھے کپڑے اور اچھے جوتے پہن کر، خوبصورت چھوٹے اسکول بیگ میں صاف ستھرے نیپکن میں لپٹے بسکٹ اور سینڈوچ لے کر روز روز چلے جانے کی بھوک بڑھنے لگی۔ایک دن جب فیئٹ کار بچوں کو لے گئی اور اس کی پیٹھ پر سوار چھوٹا ''گوڈی'' رونے لگا تو اسے خاموش کرانے کے لیے ویرونیا کو ایک گیت سوجھا:

چھوٹی شور مچاتی گاڑی
جارہی ہے گر اسکول
لے چل مجھے بھی ساتھ
پی پی پی، پوں پوں پوں......

کافی دیر تک وہ چھوٹا سا گیت گاتی رہی اور خوش ہوتی رہی۔ایک بجے جب مسٹر ایمنکے بڑے بچوں کو گھر چھوڑ کر چلے گئے تو ویرونیا نے اپنا گیت انھیں سکھایا۔گیت بچوں کو بے حد پسند آیا۔اور کئی دنوں تک اسکول سے

آنے والوں، بابا بلیک شیپ، اور 'سمپل سائمن' جیسے گیتوں کی جگہ اسی گیت نے لے لی۔

''یہ لڑکی تو جینئس ہے۔'' مسٹر ایمنکے نے کہا۔ گیت آخر کار ان تک پہنچ گیا تھا۔ ان کی بیوی کا تو ہنستے ہنستے برا حال تھا۔ انھوں نے ویرونیا کو بلا کر کہا ''اچھا'' تو تم میری گاڑی کا مذاق اڑاتی ہو 'شیطان کہیں کی' ویرونیا خوش ہوئی، کیوں کہ اسے ان کی آنکھوں میں غصے کی جگہ ہنسی دکھائی دی تھی۔

''یہ لڑکی جینئیس ہے'' اس کے شوہر نے کہا ''اور یہ اسکول بھی نہیں گئی ہے۔''

''ساتھ ہی یہ بھی تو جانتی ہے کہ تم مجھے ایک نئی گاڑی خرید کر دینے والے ہو۔''

''بات یہ ہے ڈیئر! صرف ایک سال اور پھر تم اسپورٹ کار لے سکتی ہو۔''

''ہٹو جانے دو۔''

''بھروسا نہیں ہے مجھ پر؟ ذرا صبر کرو۔ پھر دیکھنا۔''

اور ہفتے اور مہینے گزر گئے۔ چھوٹا 'گوڈی اب کچھ کچھ بولنے بھی لگا تھا' لیکن پھر بھی کسی کو ویرونیا کے اسکول جانے کی بات کا خیال ہی نہیں آیا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ قصور یہ چھوٹے گوڈی کا ہی ہے کیونکہ وہ تیزی سے بڑا نہیں ہو رہا ہے اور اسے اب ویرونیا کی پیٹھ پر سواری کرنے میں کچھ زیادہ ہی لطف آنے لگا تھا۔ حالانکہ وہ اچھی طرح چل پھر سکتا تھا۔ سچ تو یہ ہے اس کا تکیہ کلام تھا، ''مجھے اٹھاؤ'' ویرونیا نے تکیہ کلام پر بھی ایک گیت بنا ڈالا تھا۔ اس میں اس کی بڑھتی ہوئی ذہنی انتشاری بھی جھلک رہی تھی۔

تمہیں اٹھاؤں، تمہیں اٹھاؤں

ہر بار میں ہی تمہیں اٹھاؤں...... تمہیں نہیں بڑھنا ہے اگر...... چھوڑ تمہیں میں اسکول جاؤں

کیوں کہ ویرونیا گئی ہے تھک......

وہ صبح دیر تک یہی گیت گاتی رہی۔ جب دوسرے بچے اسکول سے لوٹے تو وہ چپ ہوگئی۔ وہ اس گیت کو تبھی گاتی تھی جب وہ گوڈی کے ساتھ اکیلی ہوتی۔

ایک دوپہر مسز ایمنکے جب دفتر سے جب لوٹیں تو انھوں نے دیکھا کہ ویرونیا کے ہونٹوں پر لالی لگی ہوئی ہے۔

''یہاں آؤ۔'' انھوں نے اپنی قیمتی لپ اسٹک کے بارے میں سوچتے ہوئے کہا۔ ''یہ کیا ہے؟''

لیکن وہ ان کی لپ اسٹک نہیں تھی، ان کے شوہر کی سرخ روشنائی نکلی، تب وہ اپنی مسکراہٹ نہیں روک پائیں۔

''اور اس کے ناخن کو دیکھو۔ اور انگوٹھے بھی۔ جب ہم باہر جاتے ہیں اور تمھیں بچے کی دیکھ بھال کے لیے چھوڑ جاتے ہیں تو یہ چھوٹی میم صاحب اسے کہیں بھی پٹک کر اپنی لیپا پوتی کرنے میں لگی رہتی ہوگی۔ پھر سے مجھے اس طرح دکھائی نہیں دینا چاہیے۔ سنا تم نے؟'' انھیں لگا کہ اپنی مسکراہٹ کے اثرات کو دھوڈالنے کے لیے اس طرح دھمکی دینا ضروری تھا۔

''تمھیں پتہ ہے کہ سرخ روشنائی زہریلی ہوتی ہے تم خود کو مارنا چاہتی ہو؟ تو چھوٹی میڈم! اس کے لیے تمھیں انتظار کرنا ہوگا۔ جب تم میرا گھر چھوڑ کر اپنی ماں کے گھر چلی جاؤ تو دوسری بات ہے۔

''اب بنی نہ بات۔'' انھوں نے خود پر خوش ہوتے ہوئے سوچا۔ انھوں نے دیکھا کہ ویرونیا بے حد ڈر گئی ہے اور ساری دوپہر وہ ایک سایے کی طرح ادھر ادھر گھومتی رہی۔

جب مسٹر ایمنکے گھر آئے تو کھانے کے وقت انھوں نے یہ کہانی انھیں سنائی۔ ساتھ ہی ویرونیا کو بلا کر دکھلا بھی دیا۔

''انھیں اپنے ناخن دکھلاؤ ذرا۔'' انھوں نے کہا۔ ''ہاں اپنے انگوٹھے بھی سامنے کرنا چھوٹی میڈم۔''

''ٹھیک ہے۔'' مسٹر ایمنکے نے ویرونیا کو چلے جانے کے لیے کہا۔ ''ساری باتیں بہت جلد سیکھ رہی ہے یہ۔'' تم نے کہاوت تو سنی ہوگی کہ جب گائے گھاس کھا رہی ہوتی ہے تو بچھڑے اس کے منھ کو دھیان سے دیکھتے رہتے ہیں۔''

''گائے کون ہے؟ گینڈے۔''

''مائی ڈیئر، یہ تو صرف ایک کہاوت ہے۔''

ایک آدھ ہفتے بعد مسز ایمنکے جب دفتر سے لوٹی تو دیکھا کہ جن کپڑوں میں وہ بچے کو چھوڑ کر گئی تھی۔ انھیں بدل کر کچھ اور پہنا دیا گیا ہے، جو کافی گرم ہے۔

''جو کپڑے میں نے پہنائے تھے وہ کیا ہوئے؟''

''وہ گر گیا تھا۔ سارے کپڑے خراب ہو گئے تھے۔ اس لیے میں نے تبدیل کر دیے۔'' ویرونیا نے کہا۔ لیکن اس کے برتاؤ کچھ عجیب سا تھا۔ مسز ایمنکے کو پہلے یہی خیال آیا کہ ضرور بچہ بری طرح گرا ہوگا۔

''کہاں گرا تھا؟'' انھوں نے گھبرا کر پوچھا۔ زمین پر کہاں ٹکرایا؟ میرے پاس لاؤ اسے۔ یہ سب کیا ہے؟ خون نہیں؟ یہ کیا ہے؟ اے خدا میں مر گئی۔ جاؤ اس کے کپڑے لاؤ فوراً۔''

''میں نے وہ دھوپ۔'' ویرونیا نے کہا اور پھر رونے لگی۔ یہ اس نے پہلے کبھی نہیں کیا تھا۔ مسز ایمنکے فوراً باہر دوڑیں اور رسی سے نیلے کپڑے اور سفید بنیان اتار لیے۔ ان پر گہرے لال داغ پڑے ہوئے تھے۔

انھوں نے ویرونیا کو پکڑا اور دونوں ہاتھوں سے وحشت ناک انداز میں پیٹنا شروع کر دیا۔ پھر ایک چابک اٹھایا اور تب تک اس پر برساتی رہیں جب تک کہ اس کا چہرہ اور بانہیں خون سے لت پت نہیں ہو گئے۔ تب کہیں جا کر ویرونیا نے قبول کیا کہ اس نے بچے کو سرخ روشنائی کی بوتل پلانے کی کوشش کی تھی۔ یہ سنتے ہی مسز ایمنکے کرسی پر ڈھہ گئیں اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

مسز ایمنکے نے کھانے کا بھی انتظار نہیں کیا۔ ویرونیا کو انھوں نے مرسیڈیز میں ڈالا اور چالیس میل دور گاؤں میں اس کی ماں کے گھر جا پہنچے۔ وہ تو اکیلے ہی جانا چاہتے تھے۔ لیکن ان کی بیوی نے بھی خود ساتھ چلنے اور بچے کو بھی ساتھ لے جانے پر زور دیا۔ ہمیشہ کی طرح انھوں نے کار کو مین روڈ پر ہی روکا۔ مگر لڑکی کے ساتھ اندر نہیں گئے۔ انھوں نے صرف کار کا دروازہ کھولا۔ اسے کھینچ کر باہر نکالا اور بیوی نے پیچھے سے اس کے کپڑوں کی گٹھری

نکال کر باہر پھینک دی۔ پھر وہ گاڑی اسٹارٹ کر کے وہاں سے چلے گئے۔

تھکی ماندی، دھول مٹی سے سنی مارتھا فارم سے گھر لوٹی۔ اس کے بچے دوڑ کر باہر آئے۔ انھوں نے بتلایا کہ ویرونیا لوٹ آئی ہے اور اندر کے کمرے میں مسلسل روئے جا رہی ہے۔ مارتھا نے ٹوکری پھینکی اور اسے دیکھنے کے لیے دوڑ پڑی لیکن ویرونیا نے جو کہانی سنائی اس کے گلے نہیں اتری۔

''تم نے بچے کو لال روشنائی پلائی؟ کیوں؟ تا کہ تم اسکول جا سکو؟ چلو، ان کے گھر چلو۔ ہو سکتا ہے وہ لوگ رات کو یہیں قیام کریں۔ یا انھوں نے اس بارے میں کسی اور کو بھی بتایا ہو کہ اصل ماجرا کیا ہے؟ مجھے بتاؤ تمھاری کہانی سمجھ میں نہیں آئی۔ شاید تم نے کچھ چرا لیا ہو۔ ہے نا؟''

''ممی، پلیز، مجھے وہاں مت لے جاؤ۔ وہ لوگ مجھے مار ڈالیں گے۔''

''چلنا پڑے گا تمھیں، کیونکہ تم تو مجھے بتا ہی نہیں رہی ہو کہ تم نے کیا کیا ہے؟'' اس نے ویرونیا کا بازو پکڑ لیا اور اسے باہر گھسیٹ لائی۔ باہر روشنی میں اس کے سر، گردن اور بازوؤں پر چابک کے نشانات اور خون کے سوکھے دھبے دکھائی دیئے۔ اسے تھوک نگلنا مشکل ہو گیا۔

''یہ کس نے کیا؟''

''میری میڈم نے۔''

''اور تم کہتی ہو کہ جو بتا رہی ہو وہی کیا ہے تم نے؟'' مجھے سچ سچ بتانا پڑے گا۔''

''میں نے بچے کو لال روشنائی پلائی تھی۔''

''ٹھیک ہے چلو۔''

ویرونیا زور زور سے چیخنے چلانے لگی۔ مارتھا نے پھر اس کی کلائی پکڑی اور دونوں چل پڑے۔ اس نے اپنے کام والے کپڑے تبدیل کیے نہ ہی ہاتھ منھ دھویا۔ جو بھی عورت یا اکا دکا آدمی راستے میں ملا، اس نے ویرونیا کے بدن پر چابک کے نشانات دیکھے تو چیخ اٹھا۔ ہر کوئی جاننا چاہتا تھا کہ ایسا سلوک کیوں کیا گیا۔ سبھی کو مارتھا نے ایک ہی جواب دیا۔ ''مجھے ابھی معلوم نہیں ہے۔ وہی تو معلوم کرنے جا رہی ہوں۔''

خوش قسمتی سے مسٹر ایمنکے کی گاڑی کھڑی دکھائی دی۔ وہ راجدھانی واپس نہیں گئے تھے۔ اس نے باہری دروازے پر دستک دی اور وہ اندر داخل ہو گئے۔ مسز ایمنکے پارلر میں بیٹھی بچے کو بوتل سے دودھ پلا رہی تھیں۔ انھوں نے آنے والوں سے کچھ کہنا تو دور، ان کی جانب دیکھا تک نہیں۔ کچھ دیر بعد سیڑھیوں سے نیچے اترے ان کے شوہر نے مکمل روداد سنائی۔ جیسے ہی سارا واقعہ مارتھا کو سمجھ میں آیا، کہ بچے کو لال روشنائی اس لیے پلائی گئی کہ اسے مار دیا جائے، وہ دونوں کانوں میں انگلیاں ڈال کر چیخ پڑی۔ اب وہ اور کچھ سننا نہیں چاہتی تھی۔ وہ جھٹکے سے باہر بھاگی، پھولوں کی جھاڑی سے ایک شاخ توڑی اور ایک ہی جھٹکے سے اس کی پتیاں توڑ کر پھینک دی۔ اس چھڑی کو لے کر وہ دوبارہ گھر میں داخل ہوئی اور چلائی ''میں نے بہت ہی گھناؤنی بات سنی ہے'' ویرونیا اب چیختے چلاتے کمرے میں چاروں طرف بھاگ رہی تھی۔

''اسے میرے گھر میں پیٹنے کی ضرورت نہیں۔'' مسز ایمنکے نے مارتھا کو پہلی بار دیکھتے ہوئے کرخت انداز میں

کہا۔ ''اسے یہاں سے فوراً لے جاؤ۔ مجھے یہ احساس دلانا چاہتی ہو کہ یہ سب سن کر تمھیں بے حد حیرانی ہوئی ہے، ٹھیک ہے، لیکن میں یہ سب دیکھنا نہیں چاہتی۔ اپنا غصہ اپنے گھر میں دکھاؤ۔ تمہاری لڑکی نے قتل کرنا میرے گھر میں نہیں سیکھا۔''

اس طنزیہ جملے نے مارتھا کے تن بدن میں آگ بھر دی، اس کے پاؤں ایک ہی جگہ پر ساکت ہو گئے۔ ڈھیلی ہو کر اس کی چھڑی ہاتھ میں ہی جھول گئی۔ ''بیٹی، اس نے مسز ایمنکے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا'' تم دیکھ رہی ہو، میں مفلوک الحال ضرور ہوں لیکن میں قاتل نہیں ہوں۔ اگر میری ویرونیا قاتل ہے تو خدا کی قسم یہ اس نے مجھ سے نہیں سیکھا ہے۔''

''یعنی مجھ سے سیکھا ہے؟'' مسز ایمنکے نے مصنوعی ہنسی ہنستے ہوئے کہا، یا پھر ہوا سے سیکھا ہوگا۔

ہاں، یہی ٹھیک ہے اس نے ہوا سے سیکھا ہوگا۔ اے عورت' سنو! اپنی لڑکی کو گھر لے جاؤ اور مجھے بخش دو۔''

''ویرونیا۔ چلو آؤ، آؤ چلو۔''

''ہاں، ہاں پلیز جاؤ۔''

مسٹر ایمنکے ایسے ہی موقع کی تلاش میں تھے جہاں کسی مرد کا دخل ہو سکے، اب بول اٹھے۔ ''یہ تو شیطان کی کارستانی ہے۔'' انھوں نے کہا۔ ''مجھے ہمیشہ سے لگتا ہے کہ اس ملک میں تعلیم کی حصولیابی کا پاگل پن سب کو لے ڈوبے گا۔ اب تو اسکول جانے کے لیے بچے قتل کرنے تک پاگل ہو گئے ہیں۔''

مسٹر ایمنکے کی سب کو مطمئن کرنے والی اس بھونڈی کوشش سے مارتھا بھڑک اٹھی۔ اس نے ویرونیا کو گھر چلنے کے لیے زور سے دھکا دیا اور دوسرے ہاتھ میں بنا استعمال کی ہوئی چھڑی کو سنبھال لیا۔ پہلے تو اس نے لڑکی پر گالیوں کی بوچھار کی، اسے شیطان کی آنت کہا جو دھوکے سے اس کی کوکھ میں آ گئی۔

''اے خدا، میں نے کیا قصور کیا ہے؟'' اس کے آنسو بہہ رہے تھے۔ اگر دوسروں کی طرح میرے بچے بھی وقت پر پیدا ہوتے تو اس عورت کی عمر میری لڑکی جتنی ہوتی۔ اور آج یہ مجھے قاتل کہہ رہی ہے، مجھ پر الزام لگا رہی ہے۔ تو نے ہی میری بے عزتی کروائی ہے۔'' اس نے ویرونیا کے سر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا اور اسے زور سے ایک اور دھکا دیا۔

''میں آج تجھے مار ڈالوں گی۔ گھر تو چل پہلے۔'' لیکن تبھی اس کے اندر ایک غیر واضح بغاوت کا طوفان کروٹیں لینے لگا۔ اس بغاوت کی کوئی سمت نہیں تھی۔'' اور وہ لونڈا، جو خود کو مرد کہتا ہے، مجھے تعلیم کے پاگل پن کے بارے میں سمجھا رہا تھا۔ اس کے اپنے سارے بچے تو اسکول جاتے ہیں، یہاں تک کہ دو سال کی عمر کا چوہا بھی پڑھتا ہے۔ مگر یہ ان کے لیے پاگل پن نہیں ہے۔ امیروں کا کوئی پاگل پن نہیں ہوتا۔ مگر مجھ جیسی غریب بیوہ کے بچے اوروں کے ساتھ اسکول جانا چاہتے ہیں تو یہ ہو گیا پاگل پن! واہ، کیا زندگی ہے! خدا کی قسم، یہ کیا ہے؟ اور آج میری بچی یہاں تک سوچتی ہے کہ اگر اسکول جانے کا موقع حاصل کرنا ہے تو اس بچے کا قتل کرنا پڑے گا، جس کی دیکھ بھال کا ذمہ اسے دیا گیا ہے۔ کس نے بھری ہے یہ وحشت اس کے دل میں؟ اے خدا! تو تو جانتا ہے کہ میں نے ایسا نہیں کیا'' اس نے چھڑی ایک طرف اچھال دی اور خالی ہاتھ سے اپنے آنسو پونچھنے لگی۔

☆☆☆

پانی

احمد مشتاق

اجلا ترا برتن ہے اور صاف ترا پانی
اک عمر کا پیاسا ہوں مجھ کو بھی پلا پانی

ہے اک خطِ نادیدہ دریائے محبت میں
ہوتا ہے جہاں آکر پانی سے جدا پانی

دونوں ہی تو سچے تھے الزام کسے دیتے
کانوں نے کہا صحرا آنکھوں نے سنا پانی

کیا کیا نہ ملی مٹی کیا کیا نہ دھواں پھیلا
کالا نہ ہوا سبزہ میلا نہ ہوا پانی

جب شام اترتی ہے کیا دل پہ گذرتی ہے
ساحل نے بہت پوچھا خاموش رہا پانی

پھر دیکھ کہ یہ دنیا کیسی نظر آتی ہے
مشتاق مئے غم میں تھوڑا سا ملا پانی

☆☆☆

مونسانٹو کمپنی نے اپنی سالانہ رپورٹ میں یہ جملے درج کیے ہیں: ''ہمیں یقین ہے کہ مستقبل قریب میں بطور خاص پانی اہم ذریعہ بن کر ابھرے گا۔ وہ جس قدر کم میسر ہوگا اس کی قیمت میں اتنا ہی اضافہ ہوگا۔ اسے کاروباری نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو بے حد منافع بخش ہوگا۔ قدرتی چیزوں کا توازن بگڑتا جارہا ہے۔ اس لیے ہم نے زمین اور پانی پر پوری توجہ مرکوز کر رکھی ہے۔'' ________ دتّا دیسائی

راجندر سنگھ

مترجم: قاسم ندیم

نجکاری، جمہوریت کا نیا روپ ہے

پربھاکر شروتری: ایک شاعر کا کہنا ہے کہ پل پار کرنے سے پل پار ہوتا ہے، ندی پار نہیں ہوتی۔ ہم یہاں 'گاندھی شانتی پرتشٹھان' میں بیٹھے ہیں اور گاندھی کے نزدیک باتیں کرنے سے زیادہ عمل کی اہمیت تھی۔ آپ کے بارے میں تقریباً سبھی لوگ جانتے ہیں کہ آپ بھی عمل پر یقین رکھتے ہیں۔ آپ کو ابتدا میں کیسے احساس ہوا کہ پانی کا کام زمینی سطح پر کرنا چاہئے، کیوں کہ بڑے پیمانے پر تو منصوبے بن ہی رہے ہیں۔

راجندر سنگھ: دیکھئے میری پیدائش تو پانی کے درمیان ہوئی تھی لیکن جوانی وہاں سے شروع ہوئی جہاں پانی نہیں تھا۔ 1980 میں پہلی بار جے پور بھارت سرکار کی نوکری کے سلسلے میں گیا اور وہاں محکمہ تعلیم میں کام کرنے لگا۔ لیکن دو تین سال کام کرتے کرتے دل میں یہ خیال آیا کہ اس علاقے میں پانی کیوں نہیں ہے؟ اس علاقے سے خدا کیوں ناراض ہے! سوال یوں ہی ذہن میں آیا اور اس پر میں نے زیادہ غور نہیں کیا۔ اس عمر میں ایسے ہی سوالات ذہن میں آتے ہیں اور جلد ہی اپنا ارادہ کھو دیتے ہیں۔ پھر سرکاری نوکری کرتے ہوئے یہ بھی سوال پیدا ہوا کہ اتنی بڑی مشین میں ہم خود کل پرزے کی طرح کیوں گھس رہے ہیں! تبھی اچانک یہ لگا کہ گاؤں میں جا کر کام کرنا چاہئے تھا۔ تب یہ نقطۂ نظر نہیں تھا کہ پانی کا ہی کام کرنا ہے۔ اس وقت تک تو میرے ذہن پر باپو، ونوبا یا جے پرکاش چھائے ہوئے تھے اور انقلاب یا ناانصافی سے نبرد آزما ہونے کا خواب تھا۔ اس عمر کی جو خاص چیزیں ہوتی ہیں وہی سب میرے دماغ میں تھیں۔ پانی والی بات تو کہیں تھی ہی نہیں۔ سوچ بھی ایک قوت ہے۔ میں نے سوچا کہ سرکار کو چھوڑ کر اب وہی سب جا کر کریں گے۔ تھانہ رائی علاقہ ڈارک زون تھا۔ سرکاری رجسٹر میں ڈارک زون کا مطلب ہوتا ہے کہ زمین کے درون میں اور بیرون میں کہیں بھی پانی نہیں ہے۔ وہاں کے جوان بھوکوں مرنے کی حالت میں گاؤں چھوڑ کر چلے جاتے تھے۔

ہم پانچ لوگ، ستیندر، نریندر، کیدار اور ہنومان جے پور کے گیٹ بس اڈے سے ایسے ہی چل پڑے اور یوں ہی نکل گئے۔ ٹکٹ لیتے وقت بھی یہ پتہ نہیں تھا کہ کس گاؤں کا ٹکٹ لیں۔ ہم نے کہا کہ جہاں تک تمہاری بس جاتی ہے وہاں کا ٹکٹ دے دو۔ بس والے نے ہماری طرف دیکھا اور کشوری گاؤں کے پانچ ٹکٹ دے

دیئے۔ ہم جا کر کشوری گاؤں کے گوپال پورہ میں اترے۔

پربھاکر شروتری: یہ چار لوگ کہاں مل گئے آپ کو؟

راجندر سنگھ: راجستھان میں ہی۔ کیوں کہ ہمارے جیسے پاگل لوگ اکیلے نہیں رہتے۔ وہ تنظیم بناتے ہیں۔ بس ہم شروع ہو گئے۔ جب ہم گئے تھے تو لوگوں نے کہا تھا کہ جو تمہارے من میں ہے کرو۔ لیکن چھ ماہ بعد کچھ سوال و جواب بھی شروع ہو گئے۔ ان کے دلوں میں بہت زیادہ غصہ بھرا تھا۔ مانگو بھائی نے کہا 'تو بھی پڑھا لکھا ہے اور گاؤں کے لوگ بھی پڑھ لکھ جائیں گے۔ جس دن سے اس دیس کے لوگ تعلیم یافتہ ہو گئے اس دیس کا ستیا ناس ہو گیا' میں نے کہا 'آپ کے من میں کیا ہے؟'

انھوں نے کہا جب تو چھ مہینے پہلے آیا تھا تب تیرے اوپر یقین نہیں تھا لیکن یہ یقین ہے کہ تو اچھا کام کر سکتا ہے۔ اب تو بے کار کے کام میں لگا ہے۔ اسکول چلانے سے کیا ہوگا؟ جسے پڑھنا ہوگا وہ پڑھ لے گا۔ تو تو پانی کا کام کر۔ تو تو پڑھا لکھا ہے۔ پانچ چھ مہینے ہو گئے اس گاؤں میں آئے ہوئے، کبھی سوچا کہ یہ گاؤں کیوں اجڑا ہے؟ سارے گاؤں کے لڑکے باہر کیوں چلے گئے؟ مجھے جواب دے۔ مجھ سے وہ سوال در سوال کرنے لگے۔ تب مجھے لگا کہ مانگو بھائی تو کچھ گہری گتھی سلجھا رہے ہیں۔ میں نے سوچنا شروع کیا۔ سوال تو پہلے ہی دن سے میرے دماغ میں تھا، لیکن میں نے اس پر غور کرنا شروع کیا۔

انھوں نے کہا کہ راجندر، 30۔40 سال پہلے تک اس گاؤں میں خوب پانی تھا۔ سب کنوؤں میں پانی تھا۔ اچھی کھیتی ہوتی تھی۔ سب لوگوں کے کھیتوں میں پانی ملتا تھا۔ نال پھٹ گیا۔ سب پانی بہہ کر چلا جاتا ہے تو کنوؤں کو زندہ کرنے کا کام کر۔

میں نے کہا کہ میں انجینئر نہیں ہوں۔ مجھے تو یہ کام آتا نہیں ہے۔ انھوں نے کہا، وہ تو میں سکھا دوں گا۔ ''آپ خود کیوں نہیں کرتے؟ جو جانتا ہے وہ تو خود ہی کر سکتا ہے۔'' یہ سن کر ان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ تب مجھے لگا کہ مانگو بھائی کچھ اور گہری بات کہہ رہے ہیں۔ کہنے لگے۔ 'راجندر بیٹے تو ابھی جوان ہے۔ تو ابھی نہیں سمجھے گا۔ سارا گاؤں ایک تھا، مل جل کر سبھی کام کرتے تھے۔ اب گاؤں میں جب سے ووٹ چلا اس نے تفرقہ پیدا کر دیا۔ اور تب سے گاؤں نے کام کرنا چھوڑ دیا۔ اب وہ سوچتے ہیں جس کو ووٹ دیا ہے وہ کام کرے گا۔ اب تو اس گاؤں میں رہے نا تو تو پانی کا کام کر نہیں تو تیری ٹانگ توڑ دوں گا۔'' ایک دن وہ مجھے گاؤں کی شمالی سمت لے گئے اور بتایا کہ جب اوپر کا پانی یہاں آ کر رکتا تھا تو یہاں سے کنوؤں میں جاتا تھا۔ مجھے بھی لگا کہ یہ تو ہو سکتا ہے۔ لیکن جب لوٹ کر یہ بات اپنے ساتھیوں کو بتائی کہ میں تو اب پانی پر کام کروں گا تو ہم پانچوں میں تفرقہ پڑ گیا۔ ان کا کہنا تھا کہ یہاں تو بارش ہی بہت کم ہے۔ اس کام کی انجام دہی کے لئے کافی خرچ آئے گا۔ راجستھان میں پانی کا کام کرنا ناممکن ہے۔ اس سے کچھ بھلا نہیں ہونے والا۔ لیکن میں نے کہا کہ مانگو بھائی کی عمر ستر سال سے اوپر ہے اور وہ جس دل سے بات کر رہے ہیں مجھے بھی ان کی دلیلیں سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں لیکن مجھے ان پر اعتماد ہونے لگا تھا۔ جس انداز سے وہ اس موضوع پر بتا رہے ہیں تو اس سے کچھ نہ

کچھ ہوگا ہی۔ پھر میں نے پانی کا کام اور ردعمل کے بارے میں سوالات کیے۔ سب سے پہلے پانی جہاں سے دوڑتا ہے۔ وہاں اسے چلنا سکھایا۔ جہاں پانی چلنے لگا وہاں اسے رینگنا سکھایا۔ جہاں پانی رینگنے لگا وہاں اسے پکڑ کر دھرتی پر بٹھایا!

پربھاکر شروتری: اس کام میں مدد کس نے کی؟ ایک شخص کا تو یہ کام نہیں ہے؟

راجندر سنگھ : ہاں، یہ کام میں نے اکیلے نہیں کیا۔ میں تو لگا رہا، سماج نے دیکھا تو اسے یقین آیا، تب وہ بھی اس کام میں جٹ گیا۔

پربھاکر شروتری: پہلے کتنے لوگوں نے کام کیا؟

راجندر سنگھ : دو چار لوگ تھے۔ مانگو بھائی، بدری وغیرہ۔ ہاتھ سے ہی کام ہوتا تھا۔ پیسہ نہیں تھا۔ پروجیکٹ والا کام نہیں تھا۔ کدال، پھاوڑا، گینتی، پرات۔ یہ سب لے کر جاتے تھے۔ پہلا کام چار برس میں گوپال پور میں مکمل ہوا۔

پربھاکر شروتری: اس وقت پانی کی حالت کیا تھی؟

راجندر سنگھ : اس وقت تو پانی ہم کندھے پر رکھ چار پانچ کلومیٹر سے لے کر آتے تھے پینے کے لیے۔ اس میں پانی ڈالنے کی ضرورت نہیں تھی۔ پہلے تو بارش ہوتی تھی۔ وہ پانی بہہ کر چلا جاتا تا تھا۔

پربھاکر شروتری: آپ نے یہ کام بارش سے پہلے کیا؟

راجندر سنگھ : ہاں، بارش سے پہلے۔ بارش کا پانی اس میں رک گیا۔ جیسے ہی پانی رکا ویسے ہی اس کے نیچے کے کنوئیں ریچارج ہو گئے۔ کہیں دوسری جگہ سے پانی نہیں لانا پڑا۔ اور تین مہینے کے اندر کنوؤں میں پانی دکھائی دینے لگا۔

پربھاکر شروتری: اس کے بعد؟

راجندر سنگھ : راجستھان کے گاؤں کی بڑی عجیب کہانی ہے۔ یہاں کے گاؤں میں بارش کے دنوں میں رونق آتی ہے۔ اجڑے گاؤں چمن بن جاتے ہیں۔ سارے لوگ جو گاؤں چھوڑ کر شہر گئے تھے وہ گاؤں لوٹ آتے ہیں۔ جب وہ لوٹ کر آتے ہیں تو کسی تہوار کا سماں ہوتا ہے۔ یہاں بھی نوجوان لوٹ کر آئے اور کنوؤں میں پانی دیکھا تو کہا کہ بھائی دعوت کرنی ۔ وہاں گوٹھ کہتے ہیں۔ بزرگوں سے اجازت لینے کے لیے وہ لوگ گئے۔ انھوں نے کہا کہ گوٹھ ضرور ہونا چاہیئے کیونکہ جو اچھا کام ہم نے کیا وہ رشتہ داروں کو بھی کرنا چاہیئے۔ تو ان سب کو بلاؤ۔ اس گاؤں کی ۴۵ گاؤں میں رشتہ داری تھی۔ سبھی رشتہ دار آئے۔ بیٹھک ہوئی۔ ہمارے سماج میں پانچ قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ (راجندر سنگھ پنجہ دکھاتے ہیں، پھر ایک انگلی ایک قسم کے لوگوں کے لیے موڑتے ہیں) اس بیٹھک میں بھی پانچ قسم کے لوگ آئے۔ ایک کو میں دُرجن شکتی کہتا ہوں۔ اس کا ایک کردار ہوتا ہے کہ کہیں بھی اچھا کام ہو اس میں ٹانگ اڑانا۔ تھوڑے سے لوگ ہوتے ہیں۔ دوسری قسم موقع پرستوں کی ہوتی ہے۔ آج ادھر کل ادھر، تیسری قسم سمجھدار لوگوں کی ہوتی ہے وہ کبھی کسی کا برا نہیں کرتے۔ اور اچھا کسی کا ہوگا نہیں۔ بولیں گے ہی نہیں کچھ۔ گاندھی جی کی بات یہ زیادہ سنتے ہیں۔ چوتھی قسم کے لوگ انگلی اٹھا کر راستہ بتانے والے ہوتے ہیں کہ دیکھو بھائی اس طرف جانا ہی ٹھیک رہے گا۔ ایسے جاؤ گے تو یہ مشکل در پیش آئے گی۔ اس قسم کے لوگ حوصلہ بڑھاتے ہیں۔ رئیل موٹی ویٹو فورس کہتا

ہوں اسے میں۔ پانچویں قسم کے لوگ ان چاروں اقسام کے لوگوں سے دور رہتے ہیں۔ وہ ان کے ساتھ نہیں بیٹھتے۔ ایک زمانے میں اس قسم کے لوگوں کا کام تھا کہ وہ چاروں اقسام کے لوگوں کو سیدھے راستے پر چلائے۔ ہر گاؤں میں ایک آدھ آدمی اس قسم کا ہوتا تھا جسے گرام گرو کہتے تھے۔ یہ رواج ہزاروں سال سے گاؤں میں چلتی رہی تھی۔ اس کی وجہ سے دُرجن قسم کے لوگ زیادہ تیور نہیں دکھا پاتے تھے۔ مگر آج کیا ہوگیا؟

آج یہ ہورہا ہے کہ دُرجن بولتا بہت ہے اس کے ساتھ موقع پرست ہو لیتا ہے۔ اب تیسرا بھی یہاں آ کر شامل ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ جہاں یہ مل گیے وہاں کچھ بھی اچھا کا نہیں ہوتا۔

اس روز میری زندگی کی پہلی میٹنگ تھی۔ گوپال پورہ میں پہلی قسم کے لوگ وہاں تھے۔ انھوں نے کہا اور سمجھا کہ پانی کے کام میں جس طرح گوپال پورہ کے لوگوں نے کیا ہے، ہم سب کو محنت کرنا پڑے گی۔ گوپال پورہ کے لوگوں نے تو مسلسل چار سال جی توڑ محنت کر کے جوہڑ بنانے کا کام کیا ہے وہی کرنا پڑے گا۔ تو آج کی میٹنگ کو کسی طرح نا کام کرو۔ آج یہ فیصلہ نہیں ہونا چاہئے کہ پانی کا کام کرنا ہے۔ جیسے ہی پہلے نے بات شروع کی دوسرا اس کا ہم نوا بن گیا اور کہا کہ یہ پانی کا کام تو ایم ایل اے کا ہے، سرپنچ کا ہے، اس کو ووٹ دیا تھا، ہم نہیں کریں گے، وہ دونوں بحث کر رہے تھے اور میں ٹہلتے ہوئے ان کے پاس سے گزرا۔ میں تقریر تو نہیں کرتا تھا، میں تو کام ہی کر رہا تھا۔ ان کی باتیں سن کر میں گھبرا گیا کہ چار سال پوری لگن سے جو کام کیا گیا اس پر اب عمل نہیں ہوگا۔ اب آگے کام ہوگا ہی نہیں۔ میں ان کی بات سن کر تیسرے کے پاس گیا کہ آج تو یہ میٹنگ نا کام ہو جائے گی۔ تو اس نے کہا کہ فکر نہ کیجئے سب ہو جائے گا۔ اگر آج میٹنگ نا کام ہوگئی تو کیا ہوگا؟ اس نے بات نہیں سنی تو میں چوتھے کے پاس گیا۔ یہ تو موٹی ویٹیڈ ہے نا، فوراً حرکت میں آجاتا ہے، گھر بار چھوڑ کر چل دیتا ہے، چلو___ ہم دونوں اس کے پاس آئے۔ ہم دونوں جب ملے تو پھر پانچویں کو تیار کیا کھڑے ہو کر بولنے کے لیے۔ اس نے کہا کہ دیکھو بھائی، ''ہم نے تو رشتہ داری کا دھرم نبھانے کے لیے بلایا ہے تمھیں۔ ہم نے تو پانی کا کام کر لیا اور تمہیں بھی چاہئے تو تم بھی کام کرو۔ اگر یہ کام نہیں چاہئے تو روٹی کھاؤ اور گھر جاؤ'' پھکڑ کی زبان بولتا ہے ایسا آدمی۔ اس کا لہجہ شیریں نہیں ہوتا۔ دوسرے نے بھی کہا' کہ دیکھو چار سال میں ہمارے گاؤں میں راجندر بھائی نے کام کیا تو ہمارا گاؤں آب دار بن گیا۔ ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ تمہارا گاؤں بھی اس سے محروم نہ رہے۔ اس کے بولنے کے بعد تیسرا آدمی ایکٹویٹ ہوتا ہے۔ یہ خاموش طبع لوگوں کی قوت۔ ان کی تعداد سب سے زیادہ ہوتی ہے۔ بس یہ طاقت جڑتی چلی گئی۔ اب تین طاقتیں جڑ جاتی ہیں تو دوسری طاقت موقع پرستوں کی ہے، وہ شامل ہو ہی جاتی ہے۔ پہلی قسم کے لوگ کبھی آتے نہیں ہیں، اکیلے رہتے ہیں۔ میں نے اس بات پر اپنی قوت کبھی صرف نہیں کی۔ یہ لوگ ساری زندگی حملہ آور ہوتے رہتے ہیں۔ مجھے یاد ہے پہلے دن سے لے کر آج تک۔ لیکن انھوں نے کام کو کبھی روکا نہیں۔ بس کام شروع ہوگیا۔ اگلے سال 45 گاؤں میں جوہڑ ہوگئے۔ پھر آئندہ برس 210 گاؤں میں کام ہوا۔ پھر تو......

پربھاکر شروتری: اب تک کل کتنے گاؤں ہوں گے ایسے؟

راجندر سنگھ: 7600، میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ 1058 گاؤں میں گزشتہ پانچ سال کے قحط کے باوجود

پانی کی کمی نہیں رہی۔ ہندوستان جب آزاد ہوا تھا صرف 232 گاؤں ایسے تھے جو پانی سے محروم تھے۔ آج ان کی تعداد ایک لاکھ 57 ہزار ہے۔ میں کہتا ہوں کہ آزادی کے بعد ہزاروں کروڑ روپے اس کام میں خرچ ہوئے۔ آخر کہاں گیا وہ روپیہ؟

پربھاکر شروتری : راجستھان میں تو کئی نہریں بنی ہیں۔ پہلے گنگا نہر بنی۔ پانچ سال بعد پتہ چلا کہ غلط طریقے سے کام ہوا ہے۔ اس کام کو درست کرنا چاہئے۔ اس منصوبے میں بربادی بھی بہت ہوئی۔

راجندر سنگھ : بہت سارے مسائل پیدا ہو گئے۔ زمین رسنے کا مسئلہ بڑا خطرناک تھا۔ اس سے بہت ساری زمین بے کار ہو گئی لیکن ہم جس کو کہتے ہیں ناقحط سے نجات کا کام، تو ایسا کام کرنے کے لیے سماج کو آگے آنا پڑے گا۔ ایک کمیونٹی ڈریوین ڈی سینٹرلائنز منیجمنٹ، پانی کے لیے کرنا پڑتا ہے۔ باپو جس بات کو کہتے تھے نا کہ لامرکزی نظام معاشیات، یہ اس کا سوال نہیں ہے۔ یہاں منصوبوں پر عمل درآمد کا معاملہ ہے وہ بھی نچلی سطح سے ہو۔ ہمارے علاقے کا چہرہ تبدیل ہوا۔ جس کا نام سرکاری فائل میں ڈارک زون تھا اب وہ وہائٹ زون ہو گیا۔ سرکار کو اپنے ریکارڈ بدلنے پڑے۔ تھانا گاچھی، راج گڑھ الور کا تھوڑا سا حصہ۔ ایرین، دوسا کی سینتھل، جے پور، رام گڑھ کا دوسا اور وراٹ نگر یہ چار ضلع اس میں شامل ہیں۔

پربھاکر شروتری : پانی کے موضوع پر دنیا بھر میں جو اتنی تحقیق ہو رہی ہے، اس کے دو پہلو ہیں، اول سائنسی دوم تکنیکی، اس بارے میں آپ اپنے کام کی قدر پیمائی کس طرح کرتے ہیں؟

راجندر سنگھ : سب سے پہلے میں لفظ 'سائنسی' کے بارے میں کچھ کہنا چاہوں گا۔ اس لفظ سے سب اتفاق نہیں کرتے۔ 'سائنس داں' تو گوپال پورہ کے مانگو بھائی ہیں۔ سائنس کے ذریعے زندگی کا ارتقا ہوتا ہے۔ آگے بڑھنے کا راستہ ملتا ہے جس نظام قدرت نے ہمیں بنایا ہے اسے قائم رکھتے ہوئے ہم اپنے مستقبل کو محفوظ کر سکتے ہیں۔ سائنس کا مطلب یہ بھی ہوتا ہے کہ ہم اپنے حال اور مستقبل کو جوڑ کر نہ صرف سکھ حاصل کریں بلکہ امن و آشتی کے لیے فضا ہموار کریں۔

پربھاکر شروتری : راجندر سنگھ جی، وراہ مہیر نے زمین کے نیچے پانی ہونے کے جو ثبوت فراہم کیے ہیں، جو پہچان بتائی ہے، کیا اس کا ہم لوگوں نے تجربہ کیا ہے؟ ہم نے پانی کی کھوج میں اس جانکاری سے استفادہ کیا ہے؟ یا کبھی اس کا تجزیہ کیا ہے؟

راجندر سنگھ : ہمارے اپنے علاقے میں تو جتنے انجینئر ہیں جنھیں آپ انجینئر کہتے ہیں، وہ بس اس کا علم رکھتے ہیں۔ ان کو ہم 'گجدھر' کہتے ہیں یہ لوگ کہاں کہاں پانی ملے گا اس بارے میں تو جانتے ہی ہیں بلکہ تجربات بھی کر رہے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ جہاں پانی نہیں ملے گا وہاں پر پانی جمع کرنے لیے دھرتی کا پیٹ خالی ہے، اسے جوہڑ بنانے سے بھر سکتے ہیں۔ یہ بھی علم ہے، سائنس ہے۔ جنھیں ہم ان پڑھ کہتے ہیں ان کسانوں کو ان کی جانکاری ہے اور ان کی معلومات کے سہارے ہی ہم نے سارے جوہڑ اور بند بنائے ہیں۔ اس وجہ سے ہمارے علاقے کی دھرتی سیراب ہو گئی ہے۔ ہمارے پاس پانی ہے اور کھیتی باڑی ہو رہی ہے۔ اگر یہ علم ہمارے پاس نہیں ہوتا جسے آپ نظرانداز کر رہے ہیں تو یہ ممکن نہیں تھا۔ ہم جو کام کر رہے ہیں اس کی صدیوں پرانی روایت رہی ہے۔

پربھاکر شروتری : آپ اس خیال سے کہاں تک متفق ہیں کہ بند ہماری تہذیب کی قبر گاہ ہے۔ یوں بند کو تو کبھی نہ کبھی ختم ہونا ہی ہے کیونکہ بند کی وجہ سے انسان اور تہذیب ہجرت کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ مگر بند اپنی مقررہ معیاد سے بہت کم قائم رہتے ہیں۔ چمبل، بھاکڑہ ننگل وغیرہ اس کی مثالیں ہیں۔ منصوبہ بند طریقے سے ندیوں کو موڑنے کی بنا پر ندیاں متاثر ہوتی ہیں......اس بارے میں آپ کیا کہیں گے؟

راجندر سنگھ : دیکھئے، یہ ایک فکر انگیز سوال ہے اور ہمارے ملک کے نامساعد حالات سے پیدا ہونے والا سوال ہے۔ ابھی تک ہمارا جو تجربہ ہے، ملک کا سب سے پرانا بند اڑیسہ کا ہیرا کنڈ بند ہے۔ ابھی میں وہاں گیا تھا۔ باندھ کے آگے لکھا ہے 35 ہیکٹر زمین کی سینچائی کرے گا۔ پانچ ہزار مربع کلومیٹر کا جو کٹک ڈیلٹا ہے اس کی باڑھ کو قابو میں رکھے گا۔ اعداد و شمار پڑھ کر اچھا لگتا ہے۔ لیکن اس نے کتنے گاؤں اجاڑے، کتنے لوگوں کو بے گھر کیا۔ اس کا شمار نہیں کیا گیا۔ اور پچھلے سال جس طرح کٹک ڈیلٹا میں باڑھ آئی اس کا ثبوت آپ کے سامنے ہے۔

پربھاکر شروتری: آپ نے جو جوہڑ بنائے وہ ایک طرح سے پانی کا انجذاب (کیچ منٹ) ہی کا علاقہ ہے۔

راجندر سنگھ : دیکھئے، جوہڑ اور بند میں بڑا فرق ہے۔ بند دو گھاٹوں یا پہاڑیوں کو جوڑنے والا ہوتا ہے۔ جس کے بڑے علاقے میں مٹی آ کر جمع ہو جاتی ہے۔ اس سے سماج بند اور ندیوں سے کٹتا جاتا ہے۔ لیکن جب جوہڑ بناتے ہیں تو سماج ندیوں کے ساتھ جڑ جاتا ہے۔ جڑتا اس طرح سے ہے کہ وہ چھوٹے چھوٹے جوہڑ بناتا ہے اور گرمی کے دنوں میں جب اس میں پانی نہیں ہوتا تو مٹی نکال کر کھیتوں میں ڈالتا ہے۔ یہ فطری عمل ہے۔ جہاں سے مٹی آئی تھی وہیں واپس چلی گئی۔ بڑے بند میں یہ ممکن نہیں ہے۔ دھرتی سے پانی نکالنا اور دھرتی میں پانی ڈالنا آبی چکر کا حصہ ہے۔ بند اس عمل سے مختلف ہے۔ بند کی وجہ سے ہے ندیوں کا اپنا بہاؤ رک جاتا ہے، بدل جاتا ہے۔ جہاں ندیاں بہہ رہی تھیں وہاں مٹی کی تہہ آ کر جمع ہو جاتی ہے۔ اس طرح بند سماج کو، ندی کو، جنگل کو متاثر کرتا ہے۔ لیکن جوہڑ انھیں جوڑتا ہے۔

پربھاکر شروتری : جو ادارے یا سرکار بند بناتی ہے۔ ان تک آپ کی یہ بات پہنچی یا نہیں؟ آپ کی باتوں سے کچھ تبدل ہوا یا نہیں؟

راجندر سنگھ : قابل احترام کے آر نارائنن صاحب جو صدر جمہوریہ تھے، 28 مارچ 2000 میں وہ بذات خود ندی کا ہوائی معائنہ کر کے آئے تھے۔ ہم نے ندی دوبارہ زندہ کی۔ وجیا چودھری، سوم پال شاستری جو کہ وزارت آب رسانی کے وزیر تھے سبھی لوگ آئے تھے، معائنہ کیا تھا۔ لیکن یہ جوہڑ لیڈروں، افسروں اور بیوپاریوں کی جیب نہیں بھرتے۔ ان کی سمجھ میں تو آتا ہے، کیونکہ اسی سال 'گلوبل واٹر فورم' کے 'واٹر فیسٹول' میں ہمارے کیبنٹ منسٹر ارجن چرن سیٹھی نے جو تقریر کی تھی وہ لفظ بہ لفظ وہی باتیں تھیں جو ہمارا سماج کہتا ہے۔ اسٹاک ہوم میں جا کر سرکار نے اپنی رائے کا اظہار تو کر دیا مگر وہ سرکار یہاں کیا کر رہی ہے۔ ان کا محکمہ کیا کر رہا ہے۔ اس پر وہ غور کیوں نہیں کرتے؟

پربھاکر شروتری: لیکن جو قوت ان سوالوں کو باقاعدگی سے اٹھاتی ہے وہ اپنا ردعمل کیوں ظاہر نہیں کرتی؟

راجندر سنگھ : ردعمل تو 1977 سے ہی کئی بار کیا گیا ہے۔ بعد میں چیزیں بدلتی چلی گئیں۔ اب بھی جگہ جگہ ردعمل کا اظہار کیا جاتا ہے۔ 19 ریاستوں کی 'پد یاترا' ابھی شروع کی ہے ہم نے۔ فی الحال میں یاترا کے درمیان ہی ہوں۔ سماج بھی حالات سے واقف ہے اور ناانصافی کے خلاف صدائے احتجاج بھی بلند بھی ہو رہی ہے۔ مگر اس

کے اثرات مرتب نہ ہونے کے اسباب میں نے بتائے ہیں۔

پربھاکر شروتری : دیکھئے راجندر سنگھ جی، ہم نے پڑھا ہے کہ کئی علاقوں میں جو بھی تجربات کیے گیے ہیں وہ بیرون ممالک کا چربہ ہیں۔ تو کیا آپ کو نہیں لگتا کہ ہمارے وطن کے سائنس دانوں کو اپنے وطن کے حالات و آب و ہوا کے مطابق تجربات کرنے چاہئیں!

راجندر سنگھ : دیکھئے میں آپ کی اس بات سے پوری طرح متفق ہوں کہ دنیا کی جو بھی بڑی طاقتیں ہیں، ان کے جو بھی مفادات ہیں، سوچ ہے، تعلیم ہے، اس میں اعلیٰ مرتبہ سائنسدانوں کو حاصل ہے۔ ہم بھی وہی کر رہے ہیں۔ اس لیے ان سب باتوں سے ابھرنے کے لیے میں جو پچھلے بیس پچیس سالوں سے مسلسل کام کر رہا ہوں کہ دھرتی کے ساتھ بیٹھ کر کچھ کر لو دھرتی کے لیے۔ وہ چاہے پانی کا سوال ہو یا کھیتی باڑی کا، چاہے زندگی کو آگے بڑھانے والے ذرائع کا۔ اس میں جو غریب طبقے ہیں ان کی زندگی سے متعلق بھی تحقیقی کام ہونا چاہئے تاکہ وہ غربت وافلاس سے اوپر اٹھ سکیں۔

پربھاکر شروتری : کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ یہ سارے لوگ تعلیم حاصل کر کے شہر میں آجاتے ہیں اور ان کا تعلق اپنی مٹی سے ٹوٹ جاتا ہے؟

راجندر سنگھ : پہلے شہر میں آتے ہیں پھر بڑے شہروں میں آتے ہیں، وہاں سے پھر باہر پرواز کر جاتے ہیں۔ اسی کو علم کی ہجرت کہتے ہیں۔ انھیں اپنے مفاد کی خاطر بیرون ملک مختلف کمپنیوں میں، بین الاقوامی صنعتوں میں جدید علوم، اطلاعات ونشریات لے جا رہی ہیں، اور یہ بین الاقوامی صنعتیں چاہتی ہیں کہ ساری دنیا ایک جیسی ہو جائے، ایک عالمی گاؤں بن جائے۔ وہ جو گھڑی، ٹیپ ریکارڈر، کمپیوٹر بناتے ہیں وہ پوری دنیا میں چل سکے۔ گلوبلائزیشن اور پرائیویٹائزیشن کا پورا مسئلہ یہی ہے۔ ان کی کمپنی ہی سرکار ہے۔ نجکاری، جمہوریت کا نیا روپ ہے۔ جمہوریت میں عوام سب سے بڑی طاقت ہوتے ہیں۔ ایک دو جو بڑی کمپنیاں ہیں وہ پوری دنیا کی مالک کیسے بن سکیں، یہی معاملہ ہے اور اس میں پانی سب سے زیادہ خطرناک مسئلہ ہے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کو ہمیں غلام بنانے میں کافی وقت لگا تھا۔ لیکن یہ جو پانی والی کمپنیاں ہیں، جو ہمارا نیا منصوبہ آب 2002 بنا ہے۔ اگر پانی کا نجی کرن کر دیا گیا اور مالکانہ حقوق کمپنیوں کو دے دیے گیے تو دیکھنا کہ ہم پندرہ سال سے بھی کم عرصے میں غلام بن جائیں گے۔ پوری دنیا میں ایسا ہی کیا جا رہا ہے۔ ہم گنگا کو اپنی ماں کہتے ہیں نا، مگر جس روز 'لنکیج آف دریوز' معاہدہ ہوگا، اس روز لنک آف ڈیولوشن اور 'لنک آف ڈکرپشن' بھی ہوگا اور یہ سب کسی بیرونی کمپنی کے اختیار میں ہوگا۔ وہ کمپنی کہے گی کہ یہ ندی میری ہے۔ آپ کو گنگا میں نہانا ہو تو پانچ سو روپے ٹیکس ادا کرنا ہے۔ جے پور روڈ پر ساٹھ روپے ٹول ٹیکس لگایا جاتا ہے۔ یہاں تک تو ٹھیک ہے۔ مگر ندی کے لیے ایسا کرنا جس کے ساتھ ہمارا سماج صدیوں سے جڑا ہوا ہے، کس قدر غلط ہوگا۔

پربھاکر شروتری : آپ ندیوں کو جوڑنے کے خلاف ہیں۔ لیکن کیا یہ ضروری نہیں ہے، کیونکہ کہیں سیلاب تو کہیں سوکھا کا مسئلہ قایم رہتا ہے۔ اس مسئلے کو کس طرح حل کریں گے؟

راجندر سنگھ : دیکھئے جس طرح سے ندیوں کو جوڑنے کی بات کی جا رہی ہے اس سے تو ہندوستانی سماج ٹوٹے گا اور ندیاں تو ٹوٹ ہی جائیں گی۔ آج اشد ضروری یہ ہے کہ ہندوستانی سماج ندیوں کے جڑے جس طرح سے اروری ندی مری ہوئی اور سوکھی ہوئی تھی۔ اسے بیس برس تک محنت کر کے لوگوں نے جلایا ہے۔ تھوڑا بہت پیدا

کیا پانی۔ وہ دوبارہ سوکھ جاتی اگر سماج اصولوں پر کاربند نہیں رہتا۔ ہم نے اروری ریور پارلیمنٹ بنائی اور اس میں یہ کہا کہ اس علاقہ میں کوئی گنا اور چاول نہیں بو سکتا۔ کیونکہ ان کی فصل کی تیاری میں زیادہ پانی درکار ہوتا ہے اس بات کو لوگوں نے مانا اور دوبارہ یہ غلطی نہیں دہرائی۔ تو وہاں کا سماج ندی کے ساتھ جڑ گیا۔ اس لیے ندی زندہ رہی اور جہاں پانی نہیں تھا وہاں پانی رہنے لگا۔ میں کہتا ہوں کہ اسی طرح سے پورے ملک میں جگہ جگہ اس طرح سماج کے جڑنے کی ضرورت ہے جس سے کئی مردہ ندیوں میں جان ڈالی جا سکتی ہے۔ جہاں باڑھ ہے وہاں باڑھ سے نجات مل سکتی ہے اور جہاں سوکھا ہے اس پر بھی قابو پایا جا سکتا ہے۔

پربھاکر شروتری: یعنی ان کو جوڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اپنی اپنی ندی کا جو نظام ہے۔ اسے ہی پختہ کیا جانا چاہیئے؟ آلودگی کے بارے میں کیا کہنا ہے؟ شہروں میں توسیع ہو رہی ہے، صنعتیں بڑھتی جا رہی ہیں......

راجندر سنگھ: بھارت سرکار نے نئے منصوبے بنائے ہیں اور بڑے زور و شور سے اس کی تشہیر ہو رہی ہے کہ ہم نے پولیوشن 'پے' کا قانون بنا دیا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ آلودگی میں اضافہ کرو مگر پیسہ دے دو۔ میں یہ کہتا ہوں کہ جو آلودگی پھیل رہی ہے اسے ٹریٹ کر سکتے ہیں۔ اسے کم کر سکتے ہیں۔ میرے خیال سے ایسا قانون بنانا چاہیے کہ جو انڈسٹری، نیچر سے جس روپ میں جتنا پانی لیتی ہے، اسی روپ میں اس کو لوٹائے۔ یہ ممکن ہے۔

پربھاکر شروتری: کیا آپ نے کوئی تنظیم بنائی ہے جو ملک گیر پیمانے پر کام کرے!

راجندر سنگھ: 'راشٹریہ جل برادری' نام سے ایک تنظیم بنائی ہے جس کا مقصد ہے پانی سے بھرپور سماج کی تشکیل کرنا۔

پربھاکر شروتری: کیا آپ نے یہ کبھی سوچا ہے کہ اس تنظیم سے جڑے ہوئے جو نوجوان ہیں ان کی عمر اسی میں بیت گئی تو ان کی زندگی کا، ان کی ترقی کا اور انفرادی طور سے ان کی توقعات کا کیا ہوگا؟

راجندر سنگھ: اس بات کو دھیان میں رکھ کر ہم نے ایک ٹرسٹ بنایا ہے۔ 'ترون بھارت سنگھ' جوان کی مدد کرتا ہے۔ ہم نے اس بات کا خیال رکھا ہے کہ زندگی کام سے جڑ سکے اور دن بہ دن ترقی کرتی رہے۔ سب ساتھیوں نے پانی سے جڑے سوال پر کام کرتے ہوئے بھی پانی کو جوڑ کر جنگل، حیوانات، نباتات،، ایروزن، سلٹنگ جیسے سوالوں پر سائنسی نقطۂ نظر کو اپنا کر کام کیا ہے۔

پربھاکر شروتری: نئی نسل کے کتنے لوگ آپ کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں؟

راجندر سنگھ: ہمارے ساتھ تین طرح کے لوگ ہیں۔ 7000 افراد تو ایسے ہیں جو تاعمر والنٹرس کے روپ میں موجود ہیں۔ یہ نوجوان اپنے گاؤں میں رہتے ہیں اور ضرورت کے مطابق تربیت حاصل کرتے ہیں۔ 230 افراد سرگرم رکن ہیں۔ 42 افراد ایسے ہیں جنھیں پانی کے کام کے علاوہ اور کچھ نہیں کرنا ہے۔

پربھاکر شروتری: مگر کیا سرکار سے آپ اس طرح کے قوانین بنوانے میں کامیاب ہوئے ہیں!

راجندر سنگھ: دیکھئے، میں تو بنیادی طور پر پانی بچانے کا کام کرنے والا ہوں۔ لیکن تین برس قبل میں نے تالاب کے کام سے وقت نکال کر اس کام میں اپنا وقت صرف کیا ہے۔ دو تین برس تک لڑائی لڑنے کے بعد دو باتوں پر بہت زبردست طریقے سے مباحثہ ہوتا رہا کہ پانی کسی کی جاگیر نہ بنے۔ اس کی سبھی کو ضرورت ہے۔ یہ قدرتی طور پر مشترکہ امانت ہے اور اسے اسی روپ میں رہنا چاہیئے۔ پانی کو کسی بھی قیمت پر نجی ہاتھوں میں نہیں دیا

جانا چاہئے۔ اگر سرکار یہ کام نہیں کرسکتی تو نوجوانوں کو پانی کے کام میں تربیت یافتہ بنا کر مختلف تنظیمیں بنائی جائیں۔ اس سے بہت سے نوجوانوں کو روزگار بھی حاصل ہوگا۔

پربھاکر شروتری: بسلیری وغیرہ کے بارے میں کیا خیال ہے آپ کا؟

راجندر سنگھ: بسلیری تو بڑی لوٹ کھسوٹ کا معاملہ ہے۔ باپو جب آزادی کی لڑائی لڑ رہے تھے تو انھیں مانچیسٹر کے کپڑوں میں لوٹ کھسوٹ نظر آئی تھی اور انھوں نے اس استحصال سے بچنے کے لیے چرخے کو ایک علامت کے طور پر استعمال کیا تھا۔ میں سمجھتا ہوں پانی کے ذریعے بڑے پیمانے پر عوام کا استحصال کیا جارہا ہے۔ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ چرخے کی طرح جوہڑ کو فروغ دیا جاسکے۔ جگہ جگہ جوہڑ ہوں تو بسلیری کی بوتل خرید کر پینا نہیں پڑے گا۔

پربھاکر شروتری: کیا آپ کے جوہڑ میں آلودہ پانی نہیں ڈالا جاسکتا؟

راجندر سنگھ: تو اسے خالص بناؤ۔ جو پانی پیتا ہے وہ یہ کام شروع کرے۔ اس کے لیے لڑے۔ اس کو روکے۔ دیکھئے سماج کو جب پانی کے مالکانہ حقوق کا اندازہ ہوگا اس روز ایسی باتوں سے وہ خود نبرد آزما ہوجائے گا۔ آلودگی اور بگڑے ہوئے نظام کو دوبارہ درست کرے گا۔ لیکن فی الوقت وہ ان باتوں سے ناآشنا ہے۔ آج نوجوانوں میں سب سے بڑی ضرورت اچھے احساسات کو جگانے کی ہے۔ اس اعتماد کو جگانے کی ضرورت ہے کہ یہ سب سے بڑا چیلنج ہے۔ اگر ہم دیکھیں کہ ہندوستان میں ہمارا سب سے زیادہ نقصان کیا ہوا ہے؟ ہم نے اپنے نوجوانوں کے احساسات اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم کردیا ہے۔ اس صلاحیت کو کس طرح فروغ دیا جائے یہ بھی ایک چیلنج ہے۔ میں ایک سال سے لگا ہوا ہوں۔

پربھاکر شروتری: اس کے لیے اجتماعی طور پر کام کرنے کی ضرورت ہے۔ اس بارے میں آپ اپنی جانب سے کیا کہنا چاہیں گے؟

راجندر سنگھ: دیکھئے اس وقت پانی کا جو مسئلہ ہے وہ یہ کہہ کر خوف زدہ کرنے کا نہیں ہے کہ پانی کے لیے جنگ ہوگی۔ بلکہ اس معاملے میں سب سے اہم بات احساس جگانے والی یہ ہے کہ پانی کے بنا لوگ پیاسے مر رہے ہیں، خودکشی کر رہے ہیں۔ جنگ سے زیادہ بھیانک یہ حالات ہیں۔ ہم کل کی بات کیوں کر رہے ہیں کہ جنگ ہوگی؟ ایسی جگہوں پر لوگ مر رہے ہیں۔ جہاں بارش اچھی ہوتی ہے۔ آندھرا پردیش، کرناٹک میں۔

پربھاکر شروتری: اب ایک آخری سوال، آپ کے میگسے انعام کے بارے میں۔ آج کل بین الاقوامی سطح پر انعامات کا جو سلسلہ ہے، جس طرح سے بھارت کی دوشیزاؤں کو ایشیاء اور بین الاقوامی سطح پر انعامات تفویض کیے گیے ہیں، یا یہ کہ ہندوستان کے انگریزی ادیبوں کو ابھارا جارہا ہے اسے آپ اعزاز بخشنا کہیں گے یا کہ استعمال کرنا؟

راجندر سنگھ: جہاں تک میگسے کا سوال ہے وہ گاندھی کی طرح رہنما تھے۔ لوگوں کے حقوق کے لیے انھوں نے جدوجہد کی۔ یہ تنظیم بھی وہاں کے غریبوں کے درمیان فعال ہے۔ اس میں اس طرح کا معاملہ میرے خیال سے نہیں ہے۔ ویسے آپ کا تجسس جائز ہے۔ ہمیں تو یہ دیکھنا ہی ہوگا کہ کون سا ملک ہے اور وہ ہمارا کس طرح استعمال کرسکتا ہے؟ یہ اعزاز دے کر انھوں نے بھارت کا ہی نہیں بلکہ پوری دنیا کی توجہ اس مسئلے کی جانب کی ہے جو آج سارے عالم کا سب سے اہم ترین مسئلہ ہے۔ ☆☆☆

عرفان حبیب

ترجمہ: قاسم ندیم

جہاں ندی نہیں وہاں تہذیب نہیں

پریم کمار: ساحلِ سمندر پر فروغ پانے والی تہذیب کو آپ کس نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں؟

عرفان حبیب: سمندر کی ہمارے یہاں اس لحاظ سے اب کوئی خاص اہمیت نہیں ہے۔ ابتدا میں ندیوں کی قربت اور دوری سے تہذیب پر اثرات مرتب ہوتے تھے لیکن اب رسل ورسائل کے اس قدر ذرائع ہو گئے ہیں کہ اب یہ کہنا زیادہ مناسب نہیں ہوگا۔ آج کل تہذیبی افکار کی تشہیر وترسیل میں ندی کا وہ پہلے والا کردار نہیں رہا۔ جب تہذیب و تمدن میں ندیوں کا کردار ہوا کرتا تھا تب بھی یہ ضروری تھا کہ ندی کس علاقے میں ہے؟ کیسی ہے؟ اس سے بڑا فرق پڑتا تھا۔ مثلاً آپ اگر ریگستانی علاقے کی بات کریں تو وہاں، ان کی تہذیب میں ندی کی وہ اہمیت نہیں ہوگی۔ سعودی عرب میں کوئی ندی نہیں ہے۔ وہاں بارش کے بعد جو سیلاب آجاتا ہے، اس علاقے کو وادی کہا جاتا ہے۔ وہ سال بھر ندی کی شکل میں موجود نہیں رہتا۔ صرف سیلاب ہیں۔ عراق میں دیکھیں! عراق کی تہذیب بہت پرانی ہے۔ وہاں دجلہ وفُرات کی بڑی اہمیت ہے۔ انھوں نے کنوئیں، نہریں طرح طرح کے ذرائع بنائے، کھیتی باڑی کی۔ کیرل میں جیسے ہوا۔ دلدلی علاقے کو 'ڈرین' کہا گیا۔ تین چار ہزار برس قبل جہاں دلدل تھا وہاں اب کھیتی باڑی ہونے لگی۔ افغانستان میں پہاڑوں پر برف پڑتی ہے۔ وہاں پہاڑوں سے نکلنے والی ندیاں سال بھر بہتی ہیں۔ اُن ندیوں کے پانی سے کھیتی ہوتی ہے۔ وہاں ندیوں کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایئے کہ وہاں علاقوں کے نام بھی پرانے زمانے سے ندیوں کے نام پر ہیں۔ یہ نام سنسکرت سے نکلتے جلتے ہیں۔ وہاں ایک ندی ہے 'ہلمن' اس نام کو اویستا کے 'ہیت منذ'، سنسکرت کے 'سیت بندھ' سے ملا کر دیکھئے۔ وہاں ایک پورے علاقے کا نام تھا اس ندی کے نام پر۔ جسے اب 'سیستان' کہتے ہیں۔ قندھار کے علاقے کی 'حرفوتی'، سنسکرت لفظ 'سرسوتی' ہی ہے جو فارسی میں 'حرفوتی' ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ایک اور ندی ہے ''ہرویا'۔ آج کل یہ 'ہری رُو' کہلاتی ہے۔ اسے سنسکرت لفظ 'سریوٗ' سے ملا کر دیکھئے۔ وہاں ایک تاریخی شہر ہے 'ہرات' جس کا نام 'ہریوٗ' سے اخذ کیا گیا ہے۔ پرانے زمانے میں پورے علاقے کو 'ہریوٗ' کہتے تھے۔ آج کل وہاں ایک ضلع ہے 'ہریوٗ'۔ اب 'ہریوٗ' اور 'سریوٗ' کو ایک ساتھ رکھ کر دیکھئے۔ یہاں، اس لیے ندیوں کی اہمیت

بڑھ جاتی ہے۔ پرانے زمانے میں جیسا 'رگ وید' میں آپ دیکھتے ہیں افغانستان کے لوگ بھی گلہ بانی کرتے تھے، کھیتی باڑی کرتے تھے۔انھوں نے کھیتی باڑی کے سبب ہی علاقوں کے نام ندیوں کے نام پر رکھے۔

پریم کمار: کھیتی باڑی کے سبب یا مہذب ہو جانے کے سبب؟

عــرفان حبیب: 'رگ وید' میں آریہ آتے ہیں تب دیکھئے شہر لفظ نہیں ہے۔شہر کا نام نہیں ہے۔ 'ہو پیا' یا 'ہڑپا' کو بھی بہت سے سنسکرت عالم ندی کا نام بتاتے ہیں۔ وہاں پر ندیوں کے نام بہت ہیں۔ جہاں سندھ، گنگا، جمنا وغیرہ اور پنجاب و افغانستان کی ندیوں کے نام آتے ہیں وہ علاقہ تو ندیوں کے نام سے مشہور ہے۔ 'رگ وید' میں علاقوں کے نام کم ہیں مگر ندیوں کے نام زیادہ ہیں۔ ان کے نام ہیں جنھیں ادیباسی یا قبائیلی کہتے ہیں مگر علاقوں کے نام ندارد ہیں۔سوائے 'سپت سندھو' کے۔ وہ بھی ندیوں کے نما پر ہے۔ یہی اَویستا میں ہُفت ہند' ہے۔اس سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ تب دونوں تہذیبیں موجود تھیں۔ ساتھ رہنا بھی تھا اوران میں تہذیبی اور فکری لین دین بھی تھا۔

آپ اس طرح بھی دیکھئے کہ جب تہذیب زیادہ ترقی کرتی ہے تو ندیوں میں دلچسپی کم ہو جاتی ہے۔ افغانستان، ایران تک میں شہروں سے قبل، ندیوں سے' علاقوں کی شناخت ہوتی تھی۔انھی پر اُن کے نام بھی تھے۔ جب مختلف قبائل وجود میں آئے تب مختلف قبائل کے نام پر علاقوں کے نام رکھے گئے۔ مثلاً کورو، پانچال، مگدھ، کوشل وغیرہ۔ پھر شہروں اور ریاستوں کے نام پڑتے گئے۔

پریم کمار: پہلے اور آج کے شہروں کے ندی کنارے بسے ہونے میں آپ کیا فرق محسوس کرتے ہیں؟

عرفان حبیب: پہلے کھیتی باڑی ندیوں کے آس پاس ہوا کرتی تھی۔ بعد میں ندیوں سے کھیتی کی دوری بڑھی۔سب سے پہلے زمین سے پانی نکالنے کے لیے پُر جرس کا استعمال ہوا۔پُر جرس جیسے طریقوں کا اشارہ 'رگ وید' میں بھی ہے۔اس طرح ندی سے سیدھے ربط میں فرق آیا۔آگے چل کر کھیتی وہاں بھی ہونے لگی جہاں زمین کے نیچے سے نکلے پانی پر ہی انحصار کیا جاتا تھا۔ایک ہزار قبل مسیح میں لوہا آ گیا اور جنگلات تیزی سے کٹنے لگے۔ جنگلات ایسی جگہ تھے جہاں بارش زیادہ ہوتی تھی۔ جب جنگلات صاف ہوئے تو وہاں کھیتی کا کام بارش سے ہونے لگا۔اب ندی سے دوری میں مزید اضافہ ہوا۔اس کے بعد نئے نئے طریقے اپنائے جانے لگے۔گنگا کی وادی میں ہی دیکھئے تو پہلے ندی سے، بارش سے پھر پُر جرس، رہٹ وغیرہ سے کھیتی کو پانی ملتا رہا۔اوراس طرح ندی سے آزادی حاصل ہوتی گئی۔

پریم کمار: زراعت کا ندی سے واسطہ نہ رہنے سے کیا تہذیب سے بھی واسطہ نہیں رہتا؟

عــرفان حبیب: میں سمجھتا ہوں کہ ندی کی اہمیت تہذیب سے زیادہ معاشی دکھائی دیتی ہے۔آپ دیکھئے، 'رگ وید' میں گنگا کا دو جگہ ذکر ہے۔ جبکہ سرسوتی، سندھ وغیرہ کا ذکر زیادہ ہے اور ان کی توصیف بھی زیادہ کی گئی ہے۔ سرسوتی کو دیوی کے نام پر ہونے کے سبب زیادہ احترام حاصل ہوسکتا ہے۔ وہاں گنگا کا ذکر اتنے احترام سے نہیں کیا گیا ہے۔ بڑی ندی کو گنگا کا نام دیئے جانے کی بھی ذہنیت رہی ہے۔ بودھوں کے یہاں سریو کو بھی گنگا کہا گیا ہے۔ دکن میں گوداوری کو گنگا کہا جانے لگا۔ سندھ اور سرسوتی نام ایک سے زائد ندیوں کے ہیں۔ ہریانہ میں ایک

ندی ہے جو ستلج سے آ کے ملتی ہے، اسے سروتی کہا جاتا رہا۔ سِرسا ہوتی، اس کے نام میں سرسوتی کی ہلکی سی جھلک ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ندیوں کے نام اس طرح دیئے جاتے رہے ہیں۔ ایک بڑی ندی کا جنھوں نے نظارہ کر لیا پھر وہ مسافر یا سیاح جہاں جہاں پہنچے یا بستے گئے، وہاں انھوں نے بڑی ندی کا وہ نام دے دیا۔

گنگا کو بعد میں اتنی اہمیت کیوں حاصل ہوئی یہ سوچنے والی بات ہے۔ میرا خیال ہے کہ تجارت کے لیے تب گنگا ایک بڑا ذریعہ تھی۔ ساتھ ہی کھیتی باڑی کے نقطۂ نظر سے بھی یہ ندی اہمیت کی حامل تھی۔ تب ندیوں سے سفر کرنا آسان بھی تھا اور کفایتی بھی۔ پورے گنگا بیسن پر مگدھ کی حکومت اس لیے قائم ہوسکی کہ وہ ندیوں کے نیٹ ورک سے ہر جگہ پہنچ سکتے تھے۔ بہت سی دیگر آسانیاں اور سہولیات تھیں وہاں۔ اس کے اثرات زبان پر بھی پڑے۔ آپ اشوک کے ستون دیکھیں تو سمجھ میں آئے گا کہ یہاں گنگا ندی نہ ہوتی تو اتنے وزنی اور بڑے پتھر ایک جگہ سے دوسری جگہ کس طرح جاسکتے تھے۔ فیروز شاہ تغلق نے اس کام کے لیے جمنا کا استعمال کیا۔ آج بھلے ہی اس نقطۂ نظر سے ان ندیوں کی اہمیت کو قبول نہ کریں مگر تب وہ تجارت کا، آمد و رفت کا، آدان پردان کا، پانی کا، ملنے جلنے کا سب سے آسان اور کفایتی ذریعہ تھا۔

ندیوں کے ذریعے میل جول سے زبان پر بھی اثر پڑتا ہے۔ گریرسن بیرونی اور متوسط طبقے کی زبان میں فرق محسوس کرتے ہیں۔ جس میں گنگا بیسن کی زبانیں دو حصّوں میں تقسیم ہو جاتی ہیں۔ آج ہندی کا جو بڑا علاقہ ہے اور بنگال میں بھی آپ اشوک کے دورِ حکومت میں ایک ہی زبان دیکھتے ہیں مگدھی پراکرت۔ 'ر' کی بجائے وہاں 'ل' کا استعمال ملے گا۔ پراکرت کا حرف 'س'، 'ش' سے الگ نہیں ہے۔ بنگلہ دیش سے ہریانہ تک 'ل' کا استعمال ملے گا۔ اشوک کے دور کے بہت سارے کتبے موجود ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں گنگا بیسن میں زبان ایک ہے۔ یہاں کی اور دوسری جگہوں کی اشوک دور کی پراکرت میں فرق ہے۔ اشوک کے دورِ حکومت میں تین پراکرت ڈائلکٹس رہیں مگدھی، اجینی اور گندھاری۔ مگدھی پراکرت میں سنسکرت کا دھرم 'دھم' ہے تو گنگا بیسن کے باہر پنجاب میں وہ 'دھمر' ہو جاتا ہے۔ گنگا بیسن اور انڈس بیسن کے درمیان میل جول کم ہونے کے کئی اسباب رہے۔ مگر یہی تہذیب جب دکن پہنچتی ہے تو وہاں کے لوگوں کی خواہش گوداوری کو گنگا کہنے کی ہوتی ہے۔ اس وجہ سے ناسک کی اہمیت بھی بڑھ جاتی ہے۔ تہذیب جب زیادہ فروغ پاتی ہے، رسل و رسائل کے ذرائع زیادہ ہو جاتے ہیں تو لوگوں کا تعلق ایک دوسرے سے خود بخود بڑھ جاتا ہے۔ اونٹ آنے سے، رہٹ آنے سے ندیوں سے دور اور زمین کے کافی نیچے سے پانی نکالا جانے لگا۔ گنگا بیسن میں پُرجرس کا چلن زیادہ رہا۔ ریگستان میں رہٹ کامیاب رہا۔ اس کا فرق آپ مغل دور میں دیکھ لیں۔ مغل دور میں ندیوں پر معاشیات کا انحصار کم ہونے لگتا ہے۔ لمبی نہریں نکالنے پر ان کی کھیتی باڑی شروع ہو جاتی ہے۔

پریم کمار : کیا ندی کنارے کی تہذیبوں اور ندی سے دور دراز علاقوں میں موجود تہذیبوں میں بنیادی فرق دکھائی دیتا ہے؟

عرفان حبیب: ندی کنارے فروغ پانے والی تہذیب اور دیگر تہذیبوں میں جو فرق ہوتا ہے اس کے بارے میں جذباتی طور پر کچھ یوں ہی کہہ دینا مناسب نہیں ہوگا۔ ایسا ہوسکتا ہے کچھ خاص فرق ہو۔ منگول کی بات کریں، وہاں ندی نہیں ہے۔ وہ کھیتی باڑی بھی نہیں کرسکتے تھے۔ ان میں ایک تو یہ کہ ایک مقام سے دوسرے مقام جانے کو تیار رہے، اس قوم میں یہ صلاحیت زیادہ تھی۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ ترک اور منگول جب الگ الگ ادوار میں منگولیا سے

نکلے تو وہاں کوئی بڑی ندی نہیں تھی۔ عربوں کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ ان کے پاس سانڈنی سوار تھے، گھڑسوار بھی بہت کم تھے۔ مگر اتحاد کے سبب ایک بڑی حکومت قائم کر سکے۔ اسی طرح منگول نے اس سے بھی وسیع وعریض حکومت قائم کی۔ ابنِ خلدون نے Settled اور Nomad (خانہ بدوش) میں فرق بتایا ہے کہ جب Nomads نئے مہذب علاقوں میں قدم رکھتے ہیں تو وہاں کی تہذیب میں دراڑیں پڑتی ہیں۔ عربوں سے، منگولوں سے بڑی بڑی تہذیبوں میں دراڑیں پڑیں۔ عربوں نے یونانی، ایرانی، ہندوستانی تہذیبوں کو قریب لایا اور منگول نے چین کی ایجادات پرنٹنگ پریس اور بارود وغیرہ کو دنیا بھر میں پھیلا دیا۔ حالانکہ ان کی اپنی کوئی بڑی تہذیب اور تہذیبی وراثت نہیں تھی۔ ہندوستان میں راجستھان میں ایک بڑا علاقہ ریگستان ہے۔ مگر اس نقطۂ نظر سے یہاں Nomads یا خانہ بدوشوں کی بہت بڑی تعداد نہیں ہے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ راجپوت راجستھان سے نکلے، Nomadian Area سے نکلے۔ وہ خانہ بدوش تھے۔ یہ بات مجھے اپیل نہیں کرتی۔ راجپوت ایک ساتھ کئی علاقوں میں ملتے ہیں۔ وہ گھڑسوار تھے۔ Nomads سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ تاریخ میں ابتدائی دور کے بعد یہ فرق نہیں پائیں گے آپ۔ ندیوں کی قربت یا دوری زیادہ فرق نہیں پیدا کرتی۔ یہ ضرور ہے کہ جو Settled تھے ان کی نسبت Nomads کو باہر جانے میں آسانی ضرور تھی۔ مگر وہ ہمیشہ ہی کامیاب نہیں ہوتے تھے۔ مقامی باشندے ان کی مزاحمت بھی کرتے تھے۔ اور پھر جب چینیوں نے بارود، گولی ایجاد کی تو Nomads کا اس طرح جگہ جگہ جانا بھی کم ہو گیا۔ جہاں ندیاں نہ ہوں وہاں بڑی تہذیب وتمدن کا ہونا ممکن نہیں۔ خانہ بدوش حکومت تشکیل دینے کے بعد مختلف تہذیبوں کو جوڑتے ہیں۔ اس سے بڑی بڑی تہذیبیں فروغ پاتی گئیں۔ یہ تاریخی بات ہے، آج اس کی اہمیت نہیں ہے۔

پریم کمار: ندیوں میں جو بھیانک آلودگی پھیل رہی ہے اس کے بارے میں آپ کیا کہیں گے؟

عرفان حبیب: آلودگی کا مسئلہ بہت بڑا ہے۔ ہم اگر یہ بھول جائیں کہ ندیوں سے ہمیں کیا فائدہ ہے، تب بھی یہ یاد رکھنا چاہئے کہ ان کی اپنی پہچان ہے۔ پہاڑ، جنگل، ندی، حیوانات، نباتات سبھی کا اپنا وجود، اپنی شناخت ہے۔ یہ سوچ کر کسی ندی کو نالہ نہیں بنانا چاہئے۔ اب تک دنیا بھر میں پینے کا پانی ندیوں سے ملتا رہا ہے۔ امریکہ میں یہ ایک بڑا مسئلہ بن گیا ہے کہ ندیاں زیادہ استعمال سے سوکھ گئیں۔ کئی پرانی ندیاں ختم ہو رہی ہیں۔ ہمارے شہر ابھی اتنے بڑے نہیں ہیں، مگر پھر بھی ہمیں انھیں سے پانی ملتا ہے۔ ہمیں ان کے وجود کو سمجھنا چاہئے۔ اس کا خیال رکھنا چاہئے۔ فطرت نے جو ہمیں جیسا عطا کیا اسے ویسا ہی بچا کر رکھنا چاہئے۔ ہمارے مذہب میں اگر کسی ندی کی جگہ نہ بھی ہو تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم اسے آلودہ کریں۔

پریم کمار: ندیوں سے متعلق ہمارے جذبات واحساسات کیا ہیں؟

عرفان حبیب: نظامِ فطرت یا ندیوں کو لے کر گیت، منظومات تو ہر تہذیب میں موجود ہیں۔ مگر جیسے ہمارے یہاں 'پوجا' ہے، 'اعتقاد' ہے وہ اس سے مختلف ہے۔ یہاں ہے، یہ اوروں کو پتہ نہیں۔ پہلے 'نیل' دیوی تھی ندیوں کی، اس کی پوجا ہوتی تھی۔ مگر اب نہیں۔ اب تہذیب کے فروغ کے ساتھ ساتھ فرق آتا جا رہا ہے۔ آپ اور بہت سی جگہ دیکھئے وہاں ندیوں کے نام تبدیل نہیں کیے گئے۔ یورپ میں بے حد پرانے نام چلے آ رہے ہیں۔ بعض دفعہ تو یہ بھی پتہ نہیں چلتا کہ کس زبان کے ہیں۔ مگر ہمارے یہاں زیادہ تر ندیوں کے نام تبدیل کیے گئے۔ ایسا کیوں ہے، پتہ نہیں۔ ☆☆☆

دتّا دیسائی

مترجم: قاسم ندیم

کھلے بازار کا بند پانی

چند برس قبل عالمی بینک کے نائب صدر اسماعیل سراج الدین نے کہا تھا کہ ''تیسری جنگ عظیم اکیسویں صدی میں پانی کے لیے لڑی جائے گی۔'' فی الحال یہ زمانہ ہر چیز کو ''عالمیانے'' کا زمانہ ہے اس لیے یہ جملہ دیکھتے ہی دیکھتے زبان زدِ عام ہو گیا۔ اس کے جواب میں فوراً فرانسیسی صحافی ژاں پال بیسے نے ایک مضمون قلمبند کر دیا۔ جس کا عنوان تھا ''پانی، جنگ یا بازار؟'' اب اس طرح کے سوال کا جواب کیا ہو سکتا ہے؟ ژاں پال بیسے نے اس کا جواب یوں دیا کہ: ''جنگ کو ٹالنے کے لیے بازار اکلوتا علاج ہے۔''

جنگ ہی کیوں؟ پانی کے لیے پریشان حال کسی بھی شخص سے پانی کے مسئلہ پر اظہار کرنے کی دعوت دی جائے تو وہ یہی کہے گا کہ اس مسئلہ کو حل کرنے کے لیے کچھ مختلف عمل کیا جانا چاہیے۔ مگر مختلف عمل یعنی کیا؟

پانی کو یوں ہی ضائع کیا جاتا ہے۔ ہاں یہ بات درست ہے۔ لوگوں کو پانی کی قیمت کا اندازہ نہیں! تو پانی کو ضائع ہونے سے بچانے کے لیے اس کی قیمت لگائیے! عوام میں پینے کا پانی مفت تقسیم کرنا فضول کام ہے!! اس کی نجکاری کیجیے۔ یا پھر کسی کمپنی کے حوالے کر دیجیے۔ پھر یہ کام بہترین عمل کہلائے گا۔ پانی کی آلودگی بڑھ گئی ہے؟ اس لیے بوتل بند شفاف پانی پئیں گے۔ پانی سے متعلق منصوبوں پر عمل پیرا ہونے کے لیے سرکار کے پاس سرمایہ نہیں ہے۔ اس پر عمل کرنے کے لیے ملکی اور غیر ملکی سرمایہ داروں کو دعوت دیجیے۔ پھر دیکھیے، کتنا سرمایہ آجاتا ہے اس مد کے لیے۔ ہمارے ملک میں لال فیتا شاہی اس کے لیے ذمہ دار ہے اور سیاسی رہنما کرپٹ ہیں اس لیے پانی کو بھی بازار میں فروخت ہونے والی چیز بنا دیا جانا چاہیے؟ مختصراً یہ کہ پانی کو آپ بازار میں رکھیے پھر دیکھیے کہ کس طرح مقامی پانی کے استعمال سے لے کر تیسری جنگ عظیم تک سارے مسائل فوراً حل ہو جائیں گے۔

اب پانی اور بازار کا قصّہ سنانا شروع کریں تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ ابتدا کہاں سے ہو؟ پانی سے قبل زمین پر کچھ بھی نہیں تھا۔ نہ انسان نہ جاندار۔ اس زمین پر پانی تقریباً تین سو کروڑ سال برس سے موجود ہے۔ اسی پانی سے ساٹھ ستر لاکھ سال قبل دورِ حیات جاری ہوا۔ انسان نے اپنی فہم کا استعمال کر کے دس سے پندرہ ہزار سال

قبل تہذیب وثقافت کی بنیا د رکھی ۔اس تہذیب وثقافت میں بازار کی عمر زیادہ سے زیادہ پانچ سو سال ہے۔

قدرت نے پانی کا انتظام پہلے ہی سے 'عالمی' بنایا تھا۔اس لیے بلاخوف وتردد یہ کہا جاسکتا ہے کہ 'عالمی بازار' کی عمر پانی کے سا کنے بے حد کم ہے۔

پانی انسانی زندگی کی سب سے اہم ضرورت ہے۔مگر دور جدید میں جو سماجی ڈھانچہ تیار کیا گیا ہے اس میں انسان بازار کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔(فی الوقت یہ گمان کے زمرے میں ہے) میں تاریخ کی بات نہیں کروں گا۔کیا بازار کے تال پر انسان رقص کرنے لگا ہے؟ یہ سوال کیا جاسکتا ہے۔

کل تک پانی کی سیاست کی جاتی تھی مگر آج اسے بین الاقوامی ایجنڈے کا ایک اہم حصّہ بنا دیا گیا ہے۔ ''پانی کو اب بازار کا اہم ترین حصّہ بنا دیا جائے''اس طرح کا خیال ماہرین معاشیات،سیاسیات، ماہرین تجارت، ماہرین آبیات، بین الاقوامی کمپنیاں، عالمی بینک اور ورلڈ واٹر کونسل نیز گلوبل واٹر پارٹنر شپ جیسی تنظیموں نے ظاہر کیا ہے۔

پانی کو بازار کا حصّہ بنا دینے سے کیا ہوگا؟ کیا وہ مہذب ہو جائے گا؟ کیا وہ سچ مچ سائنسی اصولوں کی پابندی کرے گا؟ کیا وہ ماحولیات کو سنبھالا دے گا؟ کیا وہ عام انسان کو سکھ پہنچائے گا؟ یا پھر وہ بازار کی بھول بھلیوں میں گم ہو جائے گا؟ کیا وہ انسانی فلاح و بہبود کا ساتھ چھوڑ کر منافع خوروں کا ہاتھ تھام لے گا؟ اس طرح کے بہت سے سوالات ذہن میں گردش کرتے ہیں۔بجلی،فون،حفظان صحت، تعلیم وغیرہ کو جیسے ہی بازار نے چھوا، فوراً یہ چمک اٹھے۔اب پانی دور نہیں۔بازار کا آکٹوپس پانی کو اپنی جانب کھینچنے کے لیے بے قرار ہے۔ایسے وقت میں شتر مرغ کی طرح ریت میں سر چھپانے کے بجائے کھلی آنکھوں سے اس سازش کی ریا کاریوں کا مشاہدہ کرنا ہوگا۔

زمانہ قدیم سے ہی پانی کسی ایک کی ملکیت نہیں رہا ہے۔قدیم رومن سامراجیت ہو یا پھر ہندوستان میں جو حکومتیں قائم ہوتی رہی ہیں، ان سبھی نے پانی پر اپنا کنٹرول نہیں رکھا۔ دریاؤں کے پانی پر کسی ایک کا حق نہیں تھا، راجاؤں،مہاراجاؤں نے بھی اپنے اپنے دور کے لحاظ سے پانی کا ذخیرہ کرنے کے طریقے اپنائے تھے۔ادیباسیوں سے لے کر قرونِ وسطیٰ تک سبھی نے بحسن وخوبی انتظامات کیے تھے۔ ہندوستان میں انگریزوں کی آمد کے بعد بھی دیہاتوں میں پانی کی دیکھ بھال کی ذمہ داری دیہی انتظامیہ کے لوگ ہی کرتے تھے۔ چھوت چھات اور ذات پات کی لعنت کے باوجود کسی کو پانی سے محروم نہیں کیا گیا۔کھیتی باڑی کے لیے پانی کے جو ذرائع تھے وہ بھی اپنے رواج کے مطابق استعمال ہوتے رہے۔مگر کسی شخص یا گروہ نے پانی کو اپنی ملکیت نہیں سمجھا۔اور نہ ہی اس طرح کا کوئی قاعدہ تھا۔

صنعت کاری،شہروں کی تعداد میں اضافہ اور زرعی پیداوار میں بڑھوار کے لیے پانی کا استعمال بہت بڑھ گیا ہے۔آج بھی دنیا میں ستر فیصد پانی کا استعمال آبپاشی کے لیے کیا جاتا ہے۔بطورِ خاص نقد فصلوں کے لیے پانی زیادہ استعمال کیا جاتا ہے۔اس کے علاوہ صنعتوں اور شہروں میں پانی کی مانگ میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ پانی کا غیر ضروری اور غیر ذمہ دارانہ استعمال ایک عام سی بات ہوگئی ہے۔گھر میں بہتے نل سے لے کر ہزاروں اور لاکھوں ہیکٹر زمین پر پھیلا نہروں کا بے ہنگم جال۔ جہاں پانی ضائع ہوتا رہتا ہے۔ہزار ہا تالاب، لاکھوں نالے اور سیکڑوں ندیاں

آلودگی کا شکار ہونے کے سبب ان کے پانی کا استعمال مسلسل کم ہوتا جا رہا ہے۔ بے شمار پانی کے ذرائع سوکھ گئے ہیں۔ جس طرح 60-1950 کے درمیان امریکہ میں کار عظمت کی علامت سمجھی جانے لگی تھی، اسی طرح ذاتی سوئمنگ پول کو بھی اہمیت حاصل ہوئی۔ آہستہ آہستہ بوتل بند پانی بھی عظمت علامت بنتا چلا گیا۔ فی الوقت امریکی طرز حیات کو عالمی طور پر اپنانے کی ہوڑ سی لگی ہوئی ہے۔ ساری دنیا میں ٹب باتھ، ذاتی سوئمنگ پول اور بوتل بند پانی کو پورے تزک و احتشام کے ساتھ مشتہر کیا جا رہا ہے۔ اس کے علاوہ گولف اور واٹر پارک کا بوجھ بھی بڑھتا ہی چلا جا رہا ہے۔

گذشتہ صدی میں مختلف مقامات پر محولہ بالا قسم کے منصوبے، منصوبوں پر عمل آوری ہو چکی ہے۔ پانی کا بازار اپنی ہیئت بناتا چلا جا رہا ہے۔ 'جس کی لاٹھی اسی کی بھینس' کے مصداق نہروں کے دہانوں پر، ندیوں کے کناروں پر، تالاب پر، زمین پر غاصبانہ قبضہ کرنے والے پانی پر بھی قابض ہو گئے ہیں۔ کنوؤں کو زیادہ گہرائی تک کھودنے کی استطاعت رکھنے والے، زیادہ قوت والے پمپ رکھنے والے زیادہ سے زیادہ زیر زمین پانی کا استعمال کرنے لگے ہیں۔ وہ ضرورت مندوں کو پانی فروخت کرتے ہیں۔ ترقی یافتہ اور پچھڑا ہوا، امیر اور غریب اس طرح کا تضاد بازار میں نظر آنے لگا ہے۔ اتنا ہونے کے باوجود آج بھی نجی کمپنیوں کے قبضے میں صرف پانچ فیصد پانی ہے۔ باقی عوام الناس کے قبضے میں ہے۔

پانی کو اکیسویں صدی میں ایندھن کے طور پر دیکھا جا رہا ہے۔ آنے والے وقت میں معدنی تیل کی جگہ پانی لینے والا ہے۔ گذشتہ صدی میں ایندھن کے طور پر کیمیائی اشیاء، زراعت اور صنعت کا انحصار تیل پر تھا۔ اس صدی میں اناج، توانائی، کیمیائی اشیاء، ادویات اور نئی صنعتوں کا انحصار پانی پر ہوگا۔ دوسری طرف 2025ء تک دنیا کی نصف آبادی یعنی چار ارب لوگ پانی کی کمی کا شکار ہونے والے ہیں۔ اس طرح کا اشارہ ورلڈ واٹر کونسل نے دیا ہے۔

زمین پر موجود میٹھے پانی کا ذخیرہ محدود ہے۔ زمین پر 97.5 فیصد پانی کھارا ہے۔ یعنی صرف 2.5 فیصد پانی میٹھا ہے۔ اس میں سے صرف 0.5 فیصد پانی ہمیں حاصل ہوتا ہے۔ اس پانی کو اگر بازار کے اصولوں پر کسا جائے تو ''جس قدر مانگ اتنی دستیابی'' کے تحت پانی کی قیمت مسلسل بڑھتی جائے گی۔

آنے والے برسوں میں اس زمین پر سب سے بڑا چیلنج پانی کا ہوگا۔ مگر سب سے منافع بخش کاروبار بھی پانی پر مبنی ہوگا۔ یہ بیان ورلڈ واٹر کونسل کی جانب سے جاری کیا گیا ہے۔

مونسانٹو کمپنی نے اپنی سالانہ رپورٹ میں یہ جملے درج کیے ہیں: ''ہمیں یقین ہے کہ مستقبل قریب میں بطور خاص پانی اہم ذریعہ بن کر ابھرے گا۔ وہ جس قدر کم میسر ہوگا اس کی قیمت میں اتنا ہی اضافہ ہوگا۔ اسے کاروباری نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو بے حد منافع بخش ہوگا۔ قدرتی چیزوں کا توازن بگڑتا جا رہا ہے۔ اس لیے ہم نے زمین اور پانی پر پوری توجہ مرکوز کر رکھی ہے۔''

پیریئر کمپنی نے جو رپورٹ پیش کی ہے وہ بھی چونکا دینے والی ہے۔ ''ہمارے ذہن میں روشنی کا جھما کہ ہوا..... ہمیں صرف اتنا ہی کرنا ہے کہ زمین سے پانی نکالیں اور اسے شراب، دودھ یا پیٹرول سے زیادہ مہنگے دام پر فروخت کریں۔ بس...''

ازورکس کمپنی کے خازن نے یہ جملے قلمبند کیے ہیں۔'' ہماری کمپنی کو ساری دنیا پر دبدبہ قائم کرنا ہے۔ اس بات کو خفیہ رکھنے کی ضرورت نہیں۔ ہم برلن، بخارسٹ، لاطینی امریکہ اور امریکہ کی جانب بڑھنے کو تیار ہیں۔ ہمیں زیادہ سے زیادہ پیسہ کس طرح حاصل ہوسکتا ہے، اس میں ہم ساری توانائی صرف کررہے ہیں۔ سب سے زیادہ دولت پانی سے ہی حاصل کی جاسکتی ہے۔''

آپ نے پانی سے وابستہ چند کمپنیوں کے عزائم کا اندازہ کرلیا ہوگا۔ اس طرح کی ہزارہا کمپنیاں اپنا دبدبا قائم کرنے کے لیے بازار کی مسابقت کی دوڑ میں شامل ہوگئی ہیں۔ ترقی پذیر ممالک کو اور عوام کو برے نتائج کے لیے ذہنی طور پر تیار رہنا ہوگا۔ آخر میں عالمی بین کے 'ماہر آب' کے چند جملے ملاحظہ کرلیں: '' آج جس طرح تیل کو ساری دنیا میں اہمیت دی گئی ہے اسی طرح پانی کو اہمیت دی جائے گی۔'' گذشتہ صدی میں بین الاقوامی کمپنیوں نے تیل کے کنوؤں پر جس طرح قبضہ جمایا تھا اسی طرح اس صدی میں وہی کمپنیاں میٹھے پانی کے ذخائر پر قابض ہوجائیں گی۔ ہمارے ملک میں ندیوں کو جوڑنے کے جو منصوبے بنائے جارہے ہیں ان منصوبوں پر بین الاقوامی کمپنیوں کی نظر ہے۔ اس طرح کی کمپنیاں سرمایہ کاری کرکے حکومت سے ندیوں کے حقوق حاصل کرلیں گی۔ اس کے بعد عوام سے من مانی قیمت وصول کرتی رہیں گی۔ یہ منظرنامہ صرف ہندوستان کا نہیں ہے بلکہ سارے عالم کا ہے۔

☆☆☆

معروف محقق اسلم مرزا کی ایک اور تحقیقی کاوش

سلاطین دکن کے عہد میں

شادیاں

(اپنے موضوع پر اولین کتاب)

قیمت: ۷۵؍روپئے

رابطہ: Flat No.8, 1st Floor, Saleem Complex,

Dewrhi Bazar, Aurangabad-431001

امرت لال ویگڑ

ترجمہ: قاسم ندیم

بگل بجانے کا وقت آ گیا ہے

گاؤں اور شہروں میں رہتے ہوئے انسان اپنے سیارے کی بنیادی ساخت کو بھلا بیٹھا ہے۔ اس کا صحیح اندازہ تبھی ہوسکتا ہے جب وہ کسی طویل سمندری سفر پر روانہ ہو جائے۔ چاروں جانب پانی ہی پانی، حدِ نگاہ پانی، پانی کی بے پناہ وسعت۔ پہلی بار اس کے سامنے یہ حقیقت اجاگر ہوتی ہے کہ اس کی دنیا پانی کی دنیا ہے۔ وہ ایک ایسے سیارے کا باشندہ ہے جس پر پانی کا اختیار ہے۔ زمین پر رہتے ہوئے یہ بات کبھی اس کی سمجھ میں نہ آتی۔ جبکہ سمندر اور انسان میں کتنی یکسانیت ہے۔

ہمارا دل دھڑکتا ہے، سمندر گرجتا ہے

کہیں سمندر کا گرجنا زمین کے دل کی دھڑکنیں تو نہیں!

سمندر کا پانی نمکین ہے کہیں ہمارے لہو میں وہی نمکین پن تو نہیں!!

اسی لیے سمندر ہمیں جس قدر بے چین کرتا ہے اور اپنی جانب کھینچتا ہے، اتنی کشش کسی اور میں نہیں ہے۔ پوری کا سمندر دیکھ کر چیتنیہ پربھو جذبات سے اس قدر مغلوب ہو گئے کہ اس میں سما گئے۔

سمندر میں برہما بھی ہے، وشنو بھی۔ وہ پالن ہار بھی ہے۔ سمندر ہی اپنے پانی کو صاف کر کے، اس کا کھارا پن دور کر کے ہمیں بھیجتا ہے۔ اگر وہ پانی کی تبخیر بند کر دے تو زمینی کرّے کی حیات ختم ہو جائے گی۔ وہ آج بھی ہمیں بطور غذا کئی چیزیں فراہم کر رہا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ سمندر (منتھن) سے ایک ہی بار امرت نکلا تھا۔ امرت ہر بار نکلتا ہے اور بارش کے روپ میں زمین پر برستا ہے۔

سورج کی گرمی سے سمندر کا پانی بھاپ بنتا ہے۔ بنا شکل کی بھاپ اوپر جا کر بادلوں کی شکل میں ڈھل جاتی ہے۔ ان بادلوں کو سیکڑوں یا ہزاروں کلومیٹر دور مختلف جگھوں تک مانسون کی ہوائیں لے جاتی ہیں۔ جن اونچے پہاڑوں یا گھنے جنگلوں تک مانسون پہنچتا ہے تو وہاں کی ٹھنڈک پا کر ٹھہر جاتا ہے۔ پہاڑ اور جنگلات جیسے اس سے کہتے ہیں: ''زمین، چرند، پرند، پیڑ، پودے اور انسان کب سے تمھاری راہ دیکھ رہے ہیں۔ اونچی اٹاری پر سے

نیچے اترو، گیس سے دوبارہ مائع بنو، پانی بن کر تپتی ہوئی زمین کو سیراب کر دو۔اس زمین میں نیا جوش بھر دو۔اس زمین پر فصلیں لہلہادو۔لوگوں میں نئی زندگی کی امنگ پیدا کر دو۔

بادل جیسے اس پل کا انتظار کر رہے تھے۔اپنی زندگی کی تکمیل کا وقت آپہنچا ہے۔لوگوں کی فلاح و بہبود کے لیے اپنے آپ کو قربان کرنے کی گھڑی آ گئی ہے۔یہ کوئی سفر کے لیے سفر نہیں تھا۔آسمان میں منڈلاتے رہنا ہی ان کا مقصد نہیں۔بنجر زمین کو زرخیز بنانا، سمندر نے جو دولت اسے سونپی ہے وہ زمین کی جھولی میں ڈال دینا۔یہی تو ہے وہ مشن، جس کے لیے سمندر نے اسے روانہ کیا تھا۔اگر وہ برستا نہیں تو اس کا سفر بے کار ہو جاتا۔

پہلے ننھی ننھی بوندیں، پھر موسلا دھار بارش۔میگھ جھکور جھکور کر برس رہے ہیں۔بجلی بھی کڑکتی ہے۔پودے جھوم رہے ہیں، درخت ڈول رہے ہیں۔آسمان سے اتنا سارا پانی کیسے برس سکتا ہے؟ بادلوں نے اس قدر بوجھ کیسے اٹھا رکھا ہوگا؟ چھٹتے ہوئے بادلوں کے درمیان سورج کی آنکھ مچولی کا منظر کتنا موہک لگتا ہے۔رہی سہی کسر دھنک پوری کر دیتی ہے۔ہوا کس قدر خوشگوار لگ رہی ہے۔

میرے لیے موسمِ برسات میں آسمان آرٹ گیلری یا کلاؤڈ گیلری کی مانند ہے اور بادل جیسے آسمان میں لٹکے ہوئے فن پارے۔زندگی سے دھڑکتے، اوپر سے کودتے، ندی نالوں کو چھلکاتے، آب و ہوا میں ٹھنڈک بکھیرتے، میدانوں کو سرسبز و شاداب کرتے اور اپنے آپ کو نچھاور کرتے زندہ جاوید فن پارے۔

بارش یعنی ایک عظیم الشان ڈرامہ۔باب اوّل کھیلا جاتا ہے سمندر میں۔باب دوم آسمان کی وسعتوں میں اور باب سوم زمین کے اسٹیج پر۔بارش کا کینوس بہت وسیع و عریض ہے۔لاکھوں کلومیٹر تک یہ اسٹیج اور کینوس پھیلا ہوا ہے۔کس قدر مضبوط ہیں آسمان اور زمین کے رشتے۔

زمانۂ قدیم میں زراعت پوری طرح بارش پر منحصر تھی۔ایک برسات سے دوسری برسات تک کے وقت کو لوگ ایک برس مانتے تھے۔ورش (برس) لفظ ورشا (برسات) سے بنا ہے۔مصر میں بارش نہیں ہوتی۔وہاں زراعت کا انحصار دریائے نیل پر تھا۔وہاں کے باشندے ایک سیلاب سے دوسرے سیلاب تک کے عرصے کو سال مانتے تھے۔بارش اور سیلاب نے ہی تقویم کو جنم دیا۔

پانی کا چنچل روپ ہے ندی۔یہ وہ زندگی کی پکڑ ہے جو اپنے کچھار میں بسے لوگوں کو زندہ رہنے کے لیے پانی فراہم کرتی ہے۔جس زمین پر صرف بارش کے پانی سے زراعت ہوتی ہے اسے آسمانی نعمت اور جو زمین صرف بارش کے بھروسے نہ رہ کر ندی کے پانی سے سینچی جاتی ہے اسے نعمتِ دریا کہا گیا ہے۔ان دنوں ندیوں کا پانی مچھلیوں سے لبالب رہتا تھا۔ندی کے کنارے بسنے کے لیے یہ سب سے بڑی جاذبیت تھی۔مچھلی ایک ایسی غذا تھی جو برس کے بارہ مہینے دستیاب ہو جاتی تھی۔پینے کے لیے پانی، کھانے کے لیے مچھلی اور کھیتی باڑی کے لیے زرخیز مٹی (جو ندی باڑھ کے وقت بہا کر لاتی ہے) قدیم زمانے کے لوگوں کے لیے اس سے بڑھ کر نعمت اور بھلا کیا ہو سکتی تھی؟ ندی کے سبب زراعت ممکن ہو سکی۔جو انسان شکاری تھا وہ مزارع بن گیا اسے شکار کی دوڑ بھاگ سے

نجات مل گئی۔ وہ ایک جگہ گھر بسا کر فن، مذہب، مطالعہ، سائنس اور ادب کی جانب متوجہ ہو سکا۔ انسان کی زندگی میں ایک بے حد اہم موڑ آیا۔

ہزاروں برس سے انسان ندی کی اور کھنچتا چلا آیا ہے۔ صرف اس لیے نہیں کہ وہ ہماری اور ہمارے کھیتوں کی پیاس بجھاتی ہے، بلکہ اس لیے بھی کہ وہ ہماری روح کو بھی سیراب کرتی ہے۔ تہذیبوں جنم ہوتا ہے۔ دنیا کی سبھی تہذیبیں ندیوں کی کوکھ سے جنم لیتی آئی ہیں۔ ہندوستانی تہذیب گنگا کی دین ہے۔

آخر میں ندی سمندر سے جا ملتی ہے۔ پانی جہاں سے چلا تھا، واپس وہیں پہنچ گیا۔ ندی کبھی نہ ختم ہونے والی ایک مسلسل تخلیق ہے۔ ایک ایسی قوت جو ہر دم نیا جنم لیتی رہتی ہے:۔

سمندر سے بادل/بادل سے بارش

بارش سے ندی/ندی سمائے سمندر میں

لیکن ندی ایک متحرک دوست ہے!

صدیوں سے موسمِ باراں میں ندی کنارے بسے ہوئے لوگوں کو باڑھ کا قہر جھیلنا پڑتا تھا۔ ندی کا پانی اپنے بہاؤ کے ساتھ ساری رکاوٹوں کو توڑتا ہوا گاؤں کے گاؤں بہالے جاتا تھا۔ آدمی اور ندی کے بیچ یہ لڑائی چلتی رہتی ہے۔ کبھی ایک بازی مار لیتا ہے تو کبھی دوسرا۔ لوگ اپنے گھروندے بناتے اور ندی انھیں بہالے جاتی۔ لوگ اس لڑائی سے اکتا گئے۔ آخر کار انھوں نے ندی پر بند بنانا سیکھ لیا۔

ہمارے پاس آج اتنا ہی پانی ہے، جس قدر کہ ہزار برس قبل تھا۔ لیکن گذشتہ کچھ برس سے پانی کی مانگ بے تحاشہ بڑھ گئی ہے۔ آزادی سے قبل ہماری آبادی پچیس کروڑ سے تھوڑی زیادہ تھی۔ آج ایک سو کروڑ کے ہندسے کو تجاوز کر گئی ہے۔ بند ہماری مجبوری ہے۔ آبادی کو دوبارہ پچیس کروڑ پر لا دیجئے پھر نئے بند بنانا تو دور، پرانے بند بھی توڑ دیجئے۔ ہزاروں برس سے انسان پانی جمع کرتا آیا ہے۔ کنوؤں، تالابوں اور باؤلیوں کے روپ میں۔ بند اس سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

برف، کہرا، بجلی، شبنم سبھی پانی کے مختلف روپ ہیں۔ سبھی ممالک اپنی ندیوں کے پانی کا بھرپور استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ جب کوئی ندی کئی ممالک سے ہو کر گزرتی ہے تو وہ تنازعہ کا سبب بھی بن جاتی ہے۔ ہر ملک کو لگتا ہے کہ دوسرا ملک ندی کا زیادہ پانی استعمال کر رہا ہے۔ وسطی ایشیا کئی چھوٹے چھوٹے ممالک پر مبنی ہے۔ ندی کے تنازعے سب سے زیادہ وہیں پر ہیں۔ ترکی اور عراق کے درمیان یوفریٹس کے پانی کے لیے، عراق اور شام کے درمیان بھی اسی ندی کو لے کر۔ اسرائیل اور فلسطین کے درمیان زیرِ زمین پانی کو لے کر اور اسرائیل اور اردن کے درمیان بند کی جگہ کی وجہ سے مختلف تنازعے حل طلب ہیں۔ کہتے ہیں کہ وسطی ایشیا میں اگر جنگ ہوگی تو تیل کی بنا پر نہیں بلکہ پانی کے سبب ہوگی۔ ان تنازعات کی وجہ سے پانی کا مناسب استعمال نہیں ہو پاتا اور پانی یوں ہی سمندر میں چلا جاتا ہے۔ ہمارے ملک میں مختلف ریاستوں کے درمیان بھی اس قسم کے تنازعے موجود ہیں۔ مثلاً نربدا کو

لے کر گجرات اور مدھیہ پردیس اور کرناٹک، مہاراشٹر اور تامل ناڈو کے درمیان گوداوری کا تنازعہ موجود ہے۔

پوری دنیا میں سب سے زیادہ سوجھ بوجھ کے ساتھ پانی استعمال کرنے والا ملک اسرائیل ہے۔اس کا ساٹھ فیصد حصّہ ریگستانی ہے۔لیکن یہاں کے انجینئروں نے ریگستانی علاقے پر ہریالی کی قالین بچھا دی ہے۔ اسرائیل زمین سے پانی کی آخری بوند تک نچوڑ لیتا ہے۔کبھی یہ ملک پانی کے نقطۂ نظر سے قلاش تھا لیکن وہاں کے انجینئروں نے تحقیق کی کہ وہاں زیرِ زمین چٹانی تہوں کے نیچے تیس ارب گھن میٹر پانی کا عظیم ذخیرہ موجود ہے۔اس میں سے ایک حصّہ سمندری کنارے کے نیچے تھا۔انھوں نے نہ صرف ان ذخائر سے پانی نکالا بلکہ نہروں اور پائپوں کے ذریعے آبپاشی کے نئے طریقے رائج کئے۔اس کے لیے انھوں نے پائپ اور پمپ کی صنعتیں قائم کیں۔

آج دنیا میں خطرناک سے خطرناک کیمیائی اشیاء پیدا کی جارہی ہیں۔انھیں اِدھر اُدھر پھینک دینے یا ندیوں میں بہادینے سے بھیانک نتائج برآمد ہورہے ہیں۔کارخانوں کے علاوہ بڑے شہر بھی اپنی ساری آلودگی ندیوں کے حوالے کردیتے ہیں۔ہم ندیوں میں مسلسل زہر گھول رہے ہیں۔کھیتوں میں کسان جن جراثیم کش ادویات کا چھڑکاؤ کرتے ہیں، دیر سویر وہ بھی ندیوں میں پہنچ جاتے ہیں۔ان میں کچھ زہریلے مادّے برسوں بعد بھی بےاثر نہیں ہوتے۔امریکہ میں ڈی ڈی ٹی پاؤڈر پر پابندی لگنے کے بیس برس بعد بھی وہ مسی سپی کے پانی میں پایا گیا۔مسی سپی میں پکڑی گئی سیکڑوں ٹن مچھلیاں اس لیے کھاد میں تبدیل کردی گئیں کہ ان میں پی سی بی نامی زہریلا کیمیائی جُز پایا گیا۔جن پرندوں نے ان مچھلیوں کو کھایا وہ مرگئے ۔یہ غذا کے ساتھ انسان کے جسم میں اور ماں کے دودھ کے ساتھ بچّے کے بدن میں پہنچ جاتا ہے۔ندی میں گھلے ہوئے کیمیائی اجزا کالرا، ٹائیفائڈ اور دست جیسی بیماریاں پھیلاتے ہیں۔آلودہ پانی بطور خاص گاؤں میں بیماری پھیلانے کا سبب بنتا ہے۔زہریلے کیمیائی مادّوں کے سبب پانی کا ایک بہت بڑا حصّہ آکسیجن سے خالی ہوجاتا ہے۔ایسی حالت میں بےشمار مچھلیاں آکسیجن نہ ملنے کی وجہ سے مرجاتی ہیں۔

ایک زمانہ تھا جب لوگ ندیوں کے ساتھ اپنائیت کا جذبہ رکھتے تھے۔جب انسان غیر مہذب تھا، تب ندیاں صحت منداور صاف ستھری تھیں۔آج جب انسان مہذب ہوگیا ہے تو ندیاں آلودہ اور زہریلی ہوگئی ہیں۔ اس زمانے میں ندیاں اپنی صفائی خود کرنے کی استطاعت رکھتی تھیں مگر بڑھتی ہوئی آلودگی کے سبب آج ندیاں اپنی یہ استطاعت کھوتی جارہی ہیں۔پانی کی آلودگی کے خلاف جنگ کا بگل بجانے کا وقت آگیا ہے۔

ایک جانب میں ہم اپنی زمین کی شکل بگاڑ رہے ہیں، ماحولیات کو نقصان پہنچا رہے ہیں اور ندیوں کو زہر آلود کررہے ہیں، وہیں دوسرے ممالک کے لوگ زمین کو سنوارنے میں لگے ہوئے ہیں۔وہ جنگل اگارہے ہیں ،ندیوں کو صاف کررہے ہیں اور ریگستانوں میں پانی لارہے ہیں۔کیا ہم یہ نہیں کرسکتے ؟ آخر اس زمین پر ہم مہمان ہی تو ہیں۔ہماری آمد سے قبل یہ دھرتی جیسی تھی، اگر جاتے ہوئے اسے ہم کچھ اور اچھی نہ بناسکیں تو کم از کم خراب کرکے تو نہ جائیں۔☆☆☆

پانی کی جنگ

بڑے شہر میں رہنے کے تجربات بھی بڑے ہوتے ہیں۔ ممبئی یعنی ایک میٹرو پولیٹن شہر یا عروس البلاد، ایک ایسا شہر جو گھڑی کی سوئیوں کی مانند ہمیشہ حرکت میں رہتا ہے۔ کبھی تھکتا ہی نہیں۔ اس شہر کی خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہاں کوئی بھوکے پیٹ نہیں سوتا۔ پیسہ ہو تب بھی اور نہ ہو تب بھی۔ گویا ممبئی جادو کی نگری ہے۔ چمک دمک اور ملمع کاری سے پرے حقیقتاً بھی اسے جادو کی نگری ہی کہا جاسکتا ہے۔ ہندوستان اپنی تہذیبی رنگارنگی کے باعث پوری دنیا میں اپنی انفرادیت رکھتا ہے اور ممبئی ہندوستان کی اس تہذیبی رنگارنگی کا ایک بونسائی روپ ہے۔ کشمیر سے کنیا کماری اور گجرات سے آسام تک کے تہذیبی جلوؤں کا ممبئی ایک ایسا گلدستہ ہے جو ہمیشہ تر و تازہ و شاداب رہتا ہے۔

لیکن اِدھر کچھ برسوں سے ممبئی کا یہ نقشہ کچھ کچھ دھندلا ہو چلا ہے۔ آبادی میں برق رفتار اضافہ اور اس کے نتیجے میں غیر قانونی تعمیرات اس کی بنیادی وجوہ ہیں۔ آبادی میں اضافہ اور نئی تعمیرات نے ممبئی میں پانی کے مسئلہ کو بہت پیچیدہ بنا دیا ہے۔ ویسے پانی کا مسئلہ تو عالمی پیمانے پر ایک بحرانی صورتِ حال کا پیش خیمہ ہے۔ عالمی بینک کی ایک رپورٹ میں اس کے عالمی کمیشن برائے آبی وسائل کے سربراہ ڈاکٹر اسماعیل سراج الدین نے کئی سال قبل کہا تھا کہ:
''بیسویں صدی میں کئی جنگیں تیل کے لیے لڑی گئیں لیکن اکیسویں صدی میں یہ جنگیں پانی کو لے کر لڑی جائیں گی۔''

ممبئی میں پانی کی قلت کی طرف سنجیدگی سے توجہ نہیں دی جارہی ہے۔ حکومت اعلانات ضرور کرتی رہی ہے لیکن عملی طور پر دیکھیں تو واٹر پارک اور کنکریٹ جنگل میں اضافہ ہی ہوتا دکھائی دے رہا ہے۔ 1965 میں بھی اسی طرح کی صورتِ حال کے پیشِ نظر ممبئی خالی کرنے کا اعلان ہو گیا تھا لیکن عین وقت پر حالات قابو میں آگئے تھے۔ غور کریں تو آج ممبئی کی آبادی 1965 کے مقابلہ میں بہت زیادہ بڑھ چکی ہے۔ اس کے علاوہ گلوبل وارمنگ کے سبب جو موسمی تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں اس کی وجہ سے یہ مسئلہ ممبئی ہی نہیں عالمی پیمانے پر بھی فوری توجہ چاہتا ہے۔ اس کرۂ ارض کے دو تہائی حصّہ میں آج بھی کھارا پانی بھرا ہوا ہے اور صرف ایک تہائی حصّہ زمین پر مشتمل ہے اور اس میں بھی پہاڑ، جنگل، کھیت اور آبادی پھیلی ہوئی ہے۔ اس آبادی کے بڑے حصّہ کو پینے کا صاف پانی میسر نہیں ہے۔ اسی لیے وہ مسموم پانی استعمال کر کے مختلف بیماریوں کا شکار بن رہا ہے۔ دوسری طرف دنیا کی آبادی چھ ارب انسانی نفوس کے ایک بڑے عدد کو پار کر چکی ہے۔

آبادی کے اس روز افزوں پھیلاؤ کے لیے پانی کی ضرورت بھی بڑھ رہی ہے۔ جتنی برق رفتاری سے ترقیاتی منصوبوں پر کام ہو رہا ہے اتنی ہی تیزی سے پانی کے وسائل بھی ساتھ چھوڑ رہے ہیں۔

ایسے وقت میں جب عالمی پیمانے پر پانی کو لے کر اس درجہ تشویشناک صورتِ حال ہے، ممبئی میں حکومت اور پالیسی ساز ادارے اس شہر کو سنگھائی بنانے کی بات کر رہے ہیں۔ یہ کتنی حیرت انگیز بات ہے کہ ایک ایسا شہر جو اپنی کشادہ دامنی کی وجہ سے پورے ملک کی امیدوں کا مرکز تھا وہاں اب پانی پر راشننگ کی نوبت آ چکی ہے۔ شنگھائی نہیں ممبئی کو نیویارک یا پیرس بنایئے لیکن ممبئی کے مزاج اور اس کے کردار کی شرط پر نہیں۔ ممبئی کو بین الاقوامی شہروں کے طرز پر ڈھالنے سے پہلے اس شہر کے انفرااسٹرکچر پر توجہ مرکوز کرنی ضروری ہے۔ ممبئی کی پہچان اس کے سوئمنگ پول اور فائی اسٹار ہوٹل نہیں ہیں بلکہ ممبئی کی اصل پہچان اس کی کشادہ دلی اور ہر کس و ناکس کو اپنے دامن میں پناہ دینے کی روایت ہے۔ اس روایت کو مسخ کر کے بھلے یہاں شنگھائی جیسی ترقیات کی جا سکتی ہیں لیکن اسے ممبئی کا چہرہ نہیں عطا کیا جا سکتا۔

آج کی ممبئی میں پانی کا مسئلہ ایسا سنگین ہو چلا ہے کہ بعض علاقوں میں بچے صبح کاندھوں پر اسکول بیگ لٹکانے کے بجائے ہنڈا اور کلسی لیے گلی گلی پانی کی تلاش میں بھٹکتے نظر آتے ہیں۔ ایسی مثالیں آپ کو شاذ و نادر نہیں روزانہ ہی مل جائیں گی۔ جھگی جھونپڑیوں کی باتیں تو اب کوئی نہیں کرتا لیکن بلڈنگوں میں بھی پانی کی قلت کا مسئلہ نئے روپ میں در آیا ہے۔ پرانی بلڈنگوں کے سامنے جدید طرز کے ٹاوروں میں لگے ہائی پاور موٹر کم منزلہ پرانی بلڈنگوں کا پانی بھی کھینچ لے جاتے ہیں۔ گویا یہ مسئلہ کچھ اس طرح کا ہو گیا ہے جیسے کرناٹک اور مہاراشٹر میں دریا کے پانی کا۔ اس طرح پانی کی قلت نے تعلقات میں کشیدگی کے کئی مدارج پیدا کر دیئے ہیں۔ آج پانی کے باعث مختلف ملکوں کے تعلقات میں کشیدگی پیدا ہو رہی ہے۔ یہی نہیں ملک اور ریاست کا رشتہ، ریاست اور شہر کا تعلق، شہر اور محلوں کا ربط و ضبط یہاں تک پانی کی وجہ سے پڑوسیوں، عزیزوں اور ملنے جلنے والوں کے تعلقات بھی بگڑتے جا رہے ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے ترکی اور شام جیسے ہمسایہ ممالک میں پانی کے مسئلہ کو لے کر جنگ ہوتے ہوتے رہ گئی۔ دوسری طرف مصر نے ایتھوپیا کو واضح الفاظ میں تنبیہ کر دی تھی کہ اگر اس نے دریائے نیل سے مزید پانی لیا تو اس کے خطرناک نتائج کا وہ ذمہ دار ہوگا۔ ممبئی کے ایک محلّہ سے مصر اور ایتھوپیا تک پھیلی پانی کی یہ لڑائی قدرت کی ستم ظریفی نہیں بلکہ سسٹم کی ناکامی کا آئینہ ہے اور افسوس کی بات یہ ہے کہ اس آئینے میں سسٹم کا چہرہ تو جوں کا توں ہے البتہ عام آدمی کا عکس ضرور مسخ ہو گیا ہے۔

سسٹم کی ناکامی اور غلط پالیسیوں کی وجہ سے ممبئی اور عالمی پیمانے پر پانی کی جو قلت پیدا ہو گئی ہے اس سے نبرد آزما ہونا آج کے انسان کا مقدر ہے۔ لیکن آج کا انسان کیا کر رہا ہے۔ اس میں بھی اس مسئلہ کے تئیں بیداری نظر نہیں آ رہی ہے۔ اگر ممبئی کی کل آبادی اپنے نہانے کے پانی میں صرف ایک لوٹا پانی کم کر دے تو قریباً ایک مہینہ پینے کے پانی کا ذخیرہ بڑھ سکتا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ سسٹم کی ناکامی پر تنقید کرتے ہوئے اپنا احتساب بھی کیا جائے۔ ☆

ٹھاکر کا کنواں

جوکھو نے لوٹا منہ سے لگایا تو پانی میں سخت بدبو آئی۔ گنگی سے بولا۔ یہ کیسا پانی ہے؟ مارے باس کے پیا نہیں جاتا۔ گلا سوکھا جا رہا ہے اور تو سڑا ہوا پانی پلائے دیتی ہے۔

گنگی ہر روز شام کو پانی بھر لیا کرتی تھی۔ کنواں دور تھا۔ بار بار جانا مشکل تھا۔ کل وہ پانی لائی تو اس میں بو بالکل نہ تھی۔ آج پانی میں بدبو کیسی؟ لوٹا ناک سے لگایا تو سچ مچ بدبو تھی۔ ضرور کوئی جانور کنوئیں میں گر کر مر گیا ہوگا، مگر دوسرا پانی آوے کہاں سے؟

ٹھاکر کے کنوئیں پر کون چڑھنے دے گا۔ ساہو کا کنواں گاؤں کے اس سرے پر ہے، پرنتو وہاں بھی کون پانی بھرنے دے گا؟ چوتھا کنواں گاؤں میں ہے نہیں۔

جوکھو کئی دن سے بیمار ہے۔ کچھ دیر تک تو پیاس روکے چپ پڑا رہا، پھر بولا، اب تو مارے پیاس کے رہا نہیں جاتا۔ لا، تھوڑا پانی ناک بند کر کے پی لوں۔

گنگی نے پانی نہ دیا۔ خراب پانی پینے سے بیماری بڑھ جائے گی۔ اتنا جانتی تھی، لیکن یہ نہ جانتی تھی کہ پانی کو ابال دینے سے اس کی خرابی جاتی رہتی ہے۔ بولی یہ پانی کیسے پیو گے؟ نہ جانے کون جانور مرا ہے۔ کنوے سے میں دوسرا پانی لائے دیتی ہوں۔

جوکھو نے حیرت سے اس کی اور دیکھا۔ دوسرا پانی کہاں سے لائے گی؟

ٹھاکر اور ساہو کے دو کنوئیں تو ہیں۔ کیا ایک لوٹا پانی نہ بھرنے دیں گے؟

ہاتھ پاؤں تڑوا آئے گی اور کچھ نہ ہوگا۔ بیٹھ چپکے سے۔ برہمن دیوتا آشیرواد دیں گے۔ ٹھاکر لاٹھی ماریں گے، ساہو جی ایک کے پانچ لے گئے۔ غریبوں کا درد کون سمجھتا ہے۔ ہم تو مر بھی جاتے ہیں تو کوئی دوار پر جھانکنے نہیں آتا، کندھا دینا تو بڑی بات ہے، ایسے لوگ کنوئیں سے پانی بھرنے دیں گے۔

ان شبدوں میں کڑوا ستیہ تھا۔ گنگی کیا جواب دیتی، لیکن اس نے وہ بدبودار پانی پینے کو نہ دیا۔

(۲)

رات کے نو بجے تھے۔ تھکے ماندے مزدور تو سو چکے تھے۔ ٹھاکر کے دروازے پر دس پانچ بے فکر جمع تھے۔ میدانی بہادری کا تو اب زمانہ رہا ہے نہ موقع۔ قانونی بہادری کی باتیں ہو رہی تھیں۔ کتنی ہوشیاری سے ٹھاکر نے تھانے دار کو ایک خاص مقدمے میں رشوت دے دی اور صاف نکل گئے۔ کتنی عقل مندی سے ایک معرکے کے مقدمے کی نقل لے آئے۔ ناظر اور مہتمم سبھی کہتے تھے نقل نہیں مل سکتی۔ کوئی پچاس مانگتا، کوئی سو، یہاں بے پیسے۔ کوڑی نقل اڑا دی۔ کام کرنے کا ڈھنگ چاہئے۔

کسی سے گنگی کنوئیں سے پانی لینے پہنچی۔

کو پپی کی دھندلی روشنی کنوئیں پر آ رہی تھی۔ گنگی جگت کی آڑ میں بیٹھی موقع کا انتظار کرنے لگی۔ اسی کنوئیں کا پانی سارا گاؤں پیتا ہے۔ کسی کے لیے روک نہیں، صرف یہ بد نصیب نہیں بھر سکتے۔

گنگی کا ودروہی دل رواجی پابندیوں اور مجبوریوں پر چوٹیں کرنے لگا۔ ہم کیوں نیچ ہیں۔ یہ لوگ کیوں اونچے ہیں؟ اس لیے کہ یہ لوگ گلے میں تاگا ڈال لیتے ہیں۔ یہاں تو جتنے ہیں، ایک سے ایک جھنٹے ہیں؟ چوری یہ کریں، جال فریب یہ کریں، جھوٹے مقدمے یہ کریں، ابھی اس ٹھاکر نے تو اس دن بے چارے گڈریا کی ایک بھیڑ چرالی تھی اور بعد میں مار کر کھا گیا۔ انہی پنڈت جی کے گھر میں تو بارہوں مانس جوا ہوتا ہے۔ یہی ساہو جی تو گھی میں تیل ملا کر بیچتے ہیں۔ کام کرا لیتے ہیں، مزدوری دیتے نانی مرتی ہے۔ کس بات میں ہیں ہم سے اونچے ہاں، منہ میں ہم سے اونچے ہیں۔ ہم گلی گلی چلاتے نہیں کہ ہم اونچے ہیں، ہم اونچے ہیں۔ کبھی گاؤں میں آ جاتی ہوں، تو رس بھری آنکھوں سے دیکھنے لگتے ہیں۔ جیسے سب کی چھاتی پر سانپ لوٹنے لگتا ہے۔ پرنتو گھمنڈ یہ کہ ہم اونچے ہیں۔

کنوئیں پر کسی کے آنے کی آہٹ ہوئی۔ گنگی کی چھاتی دھک دھک کرنے لگی۔ کہیں دیکھ لیں تو غضب ہو جائے گا۔

ایک لات بھی تو نیچے نہ پڑے۔ اس نے گھڑا اور رسی اٹھالی اور جھک کر چلتی ہوئی ایک درخت کے اندھیرے سائے میں جا کھڑی ہوئی۔ کب ان لوگوں کو دیا آتی ہے کسی پر۔ بے چارے مہنگو کو اتنا مارا کہ مہینوں لہو تھوکتا رہا۔ اس لیے تو کہ اس نے بے گار نہ کی تھی۔ اس پر یہ لوگ اونچے بنتے ہیں۔

کنوئیں پر دو عورتیں پانی بھرنے آئی تھیں۔ ان میں باتیں ہو رہی تھیں۔

کھانا کھانے چلے اور حکم ہوا کہ تازہ پانی بھر لاؤ۔ گھڑے کے لیے پیسے نہیں ہیں۔

ہم لوگوں کو آرام سے بیٹھے دیکھ کر جیسے مردوں کو جلن ہوتی ہے۔

ہاں، یہ تو نہ ہوا کہ کلسا اٹھا کر بھر لاتے۔ بس حکم چلا دیا کہ تازہ پانی لاؤ۔ جیسے ہم لوڑیاں ہی تو ہیں۔

لوڑیاں نہیں تو اور کیا ہو تم؟ روٹی کپڑا نہیں پاتیں؟ دس پانچ روپے چھین جھپٹ کر لے ہی لیتی ہو اور لوڑیاں کیسی ہوتی ہیں۔

مت لا جاؤ دی دی۔ چھن بھر آرام کرنے کو جی ترس کر رہ جاتا ہے۔ اتنا کام کسی دوسرے کے گھر کر دیتی تو اس سے کہیں آرام سے رہتی۔ اوپر سے وہ احسان مانتا۔ یہاں کام کرتے کرتے مر جاؤ پر کسی کا منہ ہی سیدھا نہیں ہوتا۔ دونوں پانی بھر کر چلی گئیں تو گنگی درخت کی چھایا سے نکلی اور کنوئیں کے جگت کے پاس آئی۔ بے فکر چلے گئے تھے۔ ٹھاکر بھی دروازہ بند کر اندر آنگن میں سونے جا رہے تھے۔ گنگی نے چھڑک (عارضی) سکھ کی سانس لی۔ کسی طرح میدان تو صاف ہوا۔ امرت چرالانے کے لیے جو راج کمار کسی زمانے میں گیا تھا وہ بھی شاید اتنی ساؤدھانی کے ساتھ اور سمجھ بوجھ کر نہ گیا ہوگا۔ گنگی دبے پاؤں کنوئیں کے جگت پر چڑھی۔ وجے کا ایسا انوبھوا سے پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔

اس نے رسی کا پھندا گھڑے میں ڈالا۔ دائیں بائیں چوکنی درشٹ سے دیکھا۔ جیسے کوئی سپاہی رات کو دشمن کے قلعے میں سوراخ کر رہا ہو۔ اگر اس سمے وہ پکڑ لی گئی تو پھر اس کے لیے معافی یا رعایت کی رتی بھر امید نہیں۔ انت میں دیوتاؤں کو یاد کر کے اس نے کلیجا مضبوط کیا اور گھڑا کنوئیں میں ڈال دیا۔

گھڑے نے پانی میں غوطہ لگایا، بہت ہی آہستہ ذرا بھی آواز نہ ہوئی، گنگی نے دو چار ہاتھ جلدی جلدی مارے۔ گھڑا کنوئیں کے منہ تک آ پہنچا۔ کوئی بڑا شہزور پہلوان بھی اتنی تیزی سے اسے نہ کھینچ سکتا تھا۔

گنگی جھکی کہ گھڑے کو پکڑ کر جگت پر رکھے کہ یکا یک ٹھاکر صاحب کا دروازہ کھل گیا۔ شیر کا منہ اس سے زیادہ بھیانک نہ ہوگا۔

گنگی کے ہاتھ سے رسی چھوٹ گئی۔ رسی کے ساتھ گھڑا دھڑام سے پانی میں گرا اور کئی چھنڑ تک پانی میں ہلکورے کی آوازیں سنائی دیتی رہیں۔

ٹھاکر کون ہے، کون ہے؟ پکارتے ہوئے کنوئیں کے پاس آ رہے تھے اور گنگی جگت سے کود کر بھاگی جا رہی تھی۔ گھر پہنچ کر دیکھا کہ جوکھو لوٹا منہ سے لگائے وہی میلا گندا پانی پی رہا تھا۔

☆☆☆

معید رشیدی کی تحقیقی وتنقیدی کتاب

وحشت: حیات اور فن

شائع ہو چکی ہے

قیمت: ۳۰۰ روپے

رابطہ: شب خون کتاب گھر، 313، رانی منڈی، الٰہ آباد

آ گستو سیپیڈ لیس

مترجم قاسم ندیم

سوکھا کنواں

میں ہوں میگوئل مازایا، ایک بولیوین لیفٹیننٹ ۔اس وقت میں بیری بیری بیماری میں مبتلا ہونے کی وجہ سے یہاں تائری اسپتال میں پچاس روز کے لیے قید سا ہوگیا ہوں۔ میں گذشتہ ڈھائی سال سے زائد عرصے تک محاذ پر رہا ہوں۔مگر نہ تو پچھلے برس لگی گولی کا زخم اور نہ ہی میری یہ بیماری مجھے فوج سے نجات دلا سکی ہے۔اس دوران میں اسپتال میں ایک جیسے پہناوے میں بھوت سے لگتے بیمار لوگوں کے بیچ اٹھتے بیٹھتے اوب گیا ہوں۔میرے پاس ان پر عذاب لمحات میں مطالعے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے لہٰذا میں خود کو اپنی ڈائری میں ڈبو دیتا ہوں۔ دھندلاتے جا رہے تجربات کو ڈائری کے صفحات پر نقل کرتے ہوئے میں ایک ایسے کنوئیں کی کہانی لکھنے میں کامیاب ہوگیا ہوں، جو اب پیراگوانا کے قبضے میں ہے۔

لیکن اس نے ہمیں جو تکالیف دی ہیں ان کی وجہ سے یہ کنواں میرے لیے اب بھی بولیوین ہے۔اس کے آس پاس اور اس کی گہرائی میں بے شمار دردناک واقعات رونما ہوتے رہے۔میری ڈائری میں یہ کہانی اس طرح رقم ہے۔

15 / جنوری 1931

جھلسا دینے والی گرمی کا موسم ۔ چاکو کے اس علاقے میں بہت کم بارش ہوتی ہے اور جو تھوڑی بہت بارش ہوتی ہے اس کا پانی بھاپ بن کر اُڑ جاتا ہے۔ چاروں طرف جہاں تک نظر جاتی ہے،سوکھے جنگل کی عریانیت دکھائی دیتی ہے۔ٹھونٹھ جو کبھی پیڑوں کے تنے رہے ہوں گے، نرکنکالوں کی طرح کھڑے ہیں۔ جیسے اس بنجر زمین پر پڑے رہنے کے لیے مجبور ہوں۔کہیں پانی کی ایک بوند بھی نہیں ہے۔

ہم زندہ ہیں۔کمزور، بے بس........وقت سے قبل بوڑھے ہو چکے ان پیڑوں کی طرح جن پر پتوں سے زیادہ شاخیں ہیں۔میرے ماتحت بیس آدمی ہیں۔ہم خندق کھودنے والوں کی ریجمنٹ کی ایک ٹکڑی ہیں۔ہم نے لوا قلعے کے قریب ایک ہفتہ قبل پڑاؤ ڈالا ہے۔ہمیں یہاں سڑک کاٹنے کے کام پر لگایا گیا ہے۔

پہاڑ کانٹے دار، گھنی، پیلی جھاڑیوں سے ڈھکے ہیں۔ یہاں پانی نہیں ہے۔

ہمارے سامنے جو علاقہ ہے اس پر ہماری فوج نے قبضہ کرلیا ہے اوراس علاقے کی حفاظت کررہی ہے۔

17/جنوری1931

شام کے وقت دھول اُڑاتا پانی کا ٹینکر آ گیا۔اس کا مڈگارڈ ٹوٹا ہوا تھا، ونڈ اسکرین غائب تھی اور ایک بتّی دھول کی وجہ سے بند تھی۔

کالی ٹینک کو لانے والا یہ ٹرک ایسے لگ رہا تھا جیسے کسی زلزلہ زدہ علاقے سے نکل کر آ رہا ہو۔ڈرائیور کی قمیص کے کھلے بٹنوں کے درمیان سے چھاتی پر پسینے کی بوندیں چمک رہی تھیں۔

''تالاب سوکھتا جا رہا ہے۔'' آتے ہی اُس نے کہا۔''پانی کے راشن میں کٹوتی کرنی پڑے گی۔''اس نے یہ خبر دی کہ پلوتا نیلوس میں ہماری ٹکڑی کو مزید آگے بھیجنے کا منصوبہ بنایا جا رہا ہے۔اس خبر سے فوجیوں میں بے چینی پھیل گئی۔کالے اور مضبوط قد کاٹھی والے'چاکون' نے فوراً پوچھا''کیا وہاں پانی ملے گا؟''

''یہاں سے کم۔''جواب ملا۔

''کیا مطلب؟ تو کیا ہم کسی کیکٹس کی طرح ہوا پر زندہ رہیں گے؟''

ایک پیپے کا ڈھکن کھولتے ہوئے ڈرائیور نے دو گیسولین کینوں کو پانی سے بھرا۔ایک پکانے کے لیے اور ایک پینے کے لیے۔ٹینکر پھر دھول اُڑاتا ہوا چلا گیا۔ہمیشہ پانی کی کچھ بوندیں زمین پر ٹپک جاتی تھیں۔سفید تتلیوں کے جھنڈ زمین کی اس نمی کو چوسنے کے لیے وہاں منڈلانے لگتے تھے۔

21/جنوری1931

پھر وہی گرمی۔سورج کی چکاچوند اور کھال پر ہنٹر برساتی خشکی۔مجھے لگتا ہے کہیں ایک کھڑکی کھولی جانی چاہئے جس سے ہوا اندر آ سکے۔آسمان پتھر کی ایک بڑی سِل جیسا لگتا ہے۔جس پر سورج چمک رہا ہے۔

ہم کدال، پھاوڑے ڈھوتے ہوئے جا رہے ہیں۔ ہماری بندوقیں تمبوؤں میں دھول کھا رہی ہیں۔ اس وقت ہم صرف مزدور ہیں اور پہاڑ کو خطِ مستقیم میں تراشتے جا رہے ہیں۔دھوپ سے جھلستے ہوئے جھاڑ جھنکاڑ کے بیچ سے راستہ نکال رہے ہیں۔کیوں؟ ہمیں بھی معلوم نہیں۔سورج نے سب کچھ جلا ڈالا ہے۔گھاس کا میدان جو کل صبح پیلا معلوم ہو رہا تھا،سورج کی زد میں آتے ہی آج سلیٹی ہو گیا ہے۔

بھٹّی کی طرح تپتے ہوئے اس علاقے میں صبح گیارہ بجے سے دوپہر تین بجے تک کام کرنا ناممکن ہوتا ہے۔اس دوران میں کسی سایہ دار درخت کی تلاش میں ناکام ہونے کے بعد کسی سوکھے پیڑ کی تصوراتی چھاؤں میں لیٹ جاتا ہوں۔نمی نہ ہونے کی وجہ سے مٹّی اُڑتی ہوئی پیڑوں سے لپٹ لپٹ جاتی ہے۔سورج کی کرنیں مُردوں کی طرح پھیلی چراگاہ کی سطح پر مقناطیسی کپکپی پیدا کرتی ہیں۔ٹڈیوں کے شور کے درمیان ہم بے حس وحرکت رہتے۔ ہم ان پاگل کر دینے والی آوازوں کے بیچ کچھ سوچے بنا جی رہے تھے........سونے آسمان پر منڈلاتے گِدھوں کو

دیکھتے ہوئے، جو اس لا متناہی پھیلے ہوئے کینوس پر کسی چھپے ہوئے پرندوں جیسے لگتے تھے۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد کہیں دور سے فائرنگ کی آوازیں سنائی دینے لگتی تھیں۔

یکم فروری 1931

دن بھر کی تپش ہمارے جسم کا حصّہ بن کر اسے بے جان کرتی جارہی تھی، دھول اور غبار ہمارے وجود کو نگلے جارہے تھے۔ صرف رات میں ہی ہم اپنے آپ میں ہوتے تھے۔ رات آتی تھی اور ہم سونا چاہتے تھے۔ حالانکہ جانوروں کی چیخوں، سیٹیوں اور لگاتار آنے والی کراہوں سے چڑ پیدا ہوتی تھی۔

رات......پھر دن۔ دن میں ہم سب چپّی سادھے رہتے تھے لیکن رات میں گفتگو کرتے تھے۔ ہم میں سے کچھ کی معلومات درحقیقت وسیع تھیں جیسے کہ 'نکولس پیڈر ریچا یا پھر بیلی گرانڈ ینو، جو چالو میں 1930 سے تھا۔ اسے ملیریا تھا اور وہ کسی پیڑ کے تنے کی طرح زرد اور سوکھا ہوا تھا۔

''وہ کہتے ہیں کہ دشمن ہمارے علاقوں کی طرف بڑھ رہے ہیں۔'' چاکون نے اعلان کیا۔

''یہاں کہیں پانی نہیں ہے۔'' پیڈر ریچا نے دعوے کے ساتھ کہا۔

''لیکن پیرا گواں پہلے ہی اسے کھوج چکے ہیں۔ وہ پہاڑوں کو سب سے زیادہ جانتے ہیں۔'' ٹرسٹا نے مخالفت کی۔ وہ لا پاز کا رہنے والا تھا۔

''ہاں، لوگ یہی کہتے ہیں، لیکن ایک پیرا گواں ٹروپر ہمیں سِکٹ کے قریب پیاس سے مرا ہوا ملا تھا۔ جبکہ تالاب زیادہ دور نہیں تھا۔ اس کے بارے میں آپ کیا کہیں گے لیفٹینینٹ؟'' اسموکی نے پوچھا جو کپا باما سے آیا تھا۔

''ہاں ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اور کامپاس کے سامنے بھی تو ایک ملا تھا، جس نے زہریلے لیمو کھانے کی وجہ سے دم توڑا تھا۔''

''لوگ بھوک سے نہیں مرتے، مگر پیاس انھیں مار دیتی ہے۔ میں نے دس نومبر کی لڑائی کے بعد سِکٹ چراگاہ میں کچھ لوگوں کو کیچڑ چوستے دیکھا ہے۔''

اس طرح قصّے اور باتیں چلتی رہتی ہیں۔

6/فروری 1931

پھر پانی برسا، پیڑوں میں کچھ جان آئی۔ ہمارے پاس پانی سے بنی کچھ چیزیں تھیں۔ مگر روٹی اور چینی نہیں تھی۔ سپلائی کرنے والا ٹرک کیچڑ میں پھنس گیا تھا۔

10/فروری 1931

وہ ہمیں تقریباً بیس کلومیٹر آگے بڑھا رہے ہیں۔ اس سڑک پر ہماری محنت بے کار گئی۔ ہمیں دوسری

سڑک بنانے کا حکم دیا گیا ہے۔ پسینے سے شرابور ٹرک ڈرائیور بُری خبر لایا ہے۔ ''پانی کا تالاب سوکھ چکا ہے۔اب ہمیں لاچانٹا سے پانی لانا پڑے گا۔''

26/فروری1931

کل ایک بوند بھی پانی نہیں تھا۔سپلائی کا سسٹم گڑبڑا رہا ہے۔ٹرکوں کو طویل دوری طے کرنی پڑتی ہے۔ کل پورے دن پہاڑ میں پھاؤڑا چلانے کے بعد ہم سڑک پر کھڑے ٹرک کا انتظار کرتے رہے۔سورج کی آخری کرن میرے ساتھیوں کے دھول بھرے چہرے پر پڑ رہی تھی۔مگر ٹرک کی مانوس آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔

آج صبح پانی کا ٹرک آیا۔ پیپوں کے پاس برتنوں کی کھنکھناہٹ تھی جو جلد بازی کی وجہ سے ایک دوسرے سے ٹکرا رہے تھے۔آپس میں جھڑپ بھی ہوگئی اور مجھے مداخلت کرنی پڑی۔

یکم مارچ1931

ایک چھوٹے قد کا تنک مزاج لیفٹیننٹ ہماری چوکی پر آیا۔اس نے مجھ سے پوچھا، میں کتنے آدمی دے سکتا ہوں۔

''مورچے پر ہمارے پاس پانی کی ایک بوند بھی نہیں ہے۔''اس نے بتایا۔''تین روز قبل ہمارے تین آدمیوں کو لو لگ گئی۔ہمیں کنوئیں کی کھوج کرنی چاہئے۔''

''وہ کہتے ہیں روچانٹا میں کنوئیں کھودے گئے ہیں۔''

''تو کیا انھیں پانی ملا؟''

''ہاں، کچھ تو ملا۔''

''یہ قسمت کی بات ہے۔''

''یہاں بھی،لوا کے پاس انھوں نے کنوئیں کھودنے کی کوشش کی تھی۔''

پیڈر ریچا، جو بڑی دیر سے ہماری باتیں سن رہا تھا،اس نے بتایا کہ برسوں پہلے یہاں سے قریب پانچ کلو میٹر دور واقعی کھدائی کی گئی تھی۔کچھ ہی میٹر کنواں کھودا گیا تھا۔شاید جو لوگ پانی ڈھونڈ رہے تھے وہ کہیں اور چلے گئے تھے۔پیڈر ریچا کا ماننا ہے کہ ہمیں کچھ اور گہرا کھودنا چاہئے۔

2/مارچ1931

پیڈر ریچا نے جو جگہ بتائی تھی، وہاں ایک اونچے پیڑ کے پاس جھاڑیوں سے گھرا ایک گڑھا تھا۔لیفٹیننٹ نے کہا کہ وہ ہیڈ کوارٹر کو خبر کرے گا۔دوپہر میں ہمیں حکم ملا کہ جب تک پانی نہ ملے ہمیں کھدائی جاری رکھنا ہوگی۔ میں نے اس کے لیے پیڈر ریچا،ٹرستا، چاکون،اسموکی اور چارانڈینس کا انتخاب کیا۔

3/مارچ1931

گڑھا قریب پانچ میٹر قطر والا اور اتنا ہی گہرا ہے۔ زمین پتھر کی طرح سخت ہے۔ ہم نے اس گڑھے تک کا راستہ صاف کیا اور پاس ہی کیمپ لگا دیا۔ آج ہمارا ارادہ سارا دن کھدائی کرنے کا ہے کیونکہ گرمی کچھ کم ہو گئی ہے۔ فوجیوں کا بدن کمر تک عریاں ہونے کی وجہ سے ان کے پٹھے پسینے سے چمکنے لگے ہیں۔ پسینے کے پرنالے ان کی چھاتی پر بہتے ہیں۔ وہ کدالوں کو گڑھے میں پھینکنے کے بعد چمڑے کی رسّی سے نیچے اتر جاتے ہیں۔

10/مارچ1931

بارہ میٹر۔ لگتا ہے ہم پانی تک پہنچنے والے ہیں۔ مٹّی زیادہ سے زیادہ نم ہوتی جا رہی ہے۔ ہم نے کنوئیں میں آنے جانے کے لیے ایک طرف لکڑی کے تختے ٹھونک دیئے ہیں۔ میں نے ایک سیڑھی بنانے کا حکم دیا ہے۔ تا کہ مٹّی نکالنے میں آسانی ہو جائے۔ فوجی شفٹوں میں کام کرتے ہیں۔ پپڑ ریجا کو یقین ہے کہ ایک ہفتے کے اندر پانی نکل آئے گا۔

22/مارچ1931

آج میں کنوئیں میں اترا تھا۔ اس میں اترتے ہی آپ کو کچھ عجیب سا احساس ہوتا ہے......سورج کی روشنی سے دور ایک ایسی عجیب ہوا سے سامنا ہوتا ہے جس میں مٹّی کی بو رچی بسی ہوتی ہے۔ جیسے ہی میں کنوئیں کی گہرائیوں میں اترا اور میرے پیروں نے اس کی تل کو چھوا، ایک ٹھنڈی لہر سی بدن میں دوڑ گئی۔ میں قریب اٹھارہ میٹر گہرائی میں تھا۔ اوپر دیکھنے پر کنوئیں کا اوپری حصّہ کالی اندھیری نال جیسا دکھائی دیتا ہے۔ جس کے سرے پر سورج کی روشنی ہے۔ ہمارے قدموں کے نیچے کیچڑ ہے اور کنوئیں کی دیواروں کو ہاتھ سے چھونے پر مٹّی بھر بھرا کر گرتی ہے۔ میں کیچڑ میں لت پت باہر آیا۔ مچھروں کے ایک غول نے فوراً مجھ پر یلغار کر دیا اور تب تک ڈستے رہے جب تک میرا پیر سوج نہیں گیا۔

30/مارچ1931

حیرت ہے! دس دن پہلے تک کنوئیں سے گیلی مٹّی نکل رہی تھی، مگر اب سوکھی مٹّی نکلنے لگی ہے۔ میں ایک بار پھر کنوئیں میں اترا۔ کنوئیں کی دیوار کو چھونے پر نمی کا احساس ہوتا ہے۔ نیچے پہنچنے کے بعد ہی سمجھ میں آیا کہ ہم گیلی مٹّی کی ایک پرت کو کھود چکے ہیں۔ میں نے کھدائی روکنے کا حکم دیا تا کہ شاید کچھ دنوں میں گیلی پرت سے کچھ پانی رِس کر تہہ میں جمع ہو جائے۔

12/اپریل1931

کنوئیں کی تہہ سوکھی ہی ہے۔ پھر کھدائی شروع ہوئی اور میں چوبیس میٹر نیچے اترا۔ کنوئیں کے نیچے کی طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ جب میں نے کنوئیں کی دیوار پر کدال سے ضرب لگائی تو ٹھوس آواز آئی، جسے میں

بڑی دیر تک اپنے دل پر محسوس کرتا رہا۔

28/اپریل 1931

مجھے لگتا ہے کہ ہمیں پانی نہیں ملے گا اور کھدائی کا کام روک دیا جانا چاہیئے۔ میں نے ہیڈ کوارٹر کو مطلع کر دیا۔ مجھے وہاں کل بلایا گیا ہے۔

29/اپریل 1931

''کیپٹن'' میں اپنے افسر سے مخاطب ہوا۔ ''ہم کنوئیں کو تیس میٹر گہرا کھود چکے ہیں، مگر پانی ملنے کے آثار نظر نہیں آتے۔''

''لیکن ہمیں ہر قیمت پر پانی چاہیئے۔'' اس نے جواب دیا۔

''تب پھر ہمیں کسی دوسری جگہ کنواں کھودنا چاہیئے۔''

''قطعی نہیں، جہاں شروع کیا ہے...... وہیں کھودو۔ تیس تیس میٹر کے دو کنوئیں ہمیں پانی نہیں دے سکتے، لیکن ہوسکتا ہے ایک کنواں چالیس میٹر کھودنے پر پانی دے دے۔''

''او کے کیپٹن۔''

''ہوسکتا ہے پانی نکلنے ہی والا ہو۔''

''ٹھیک ہے کیپٹن۔''

''شاباش! تھوڑی اور کوشش کرو۔ ہمارے آدمی پیاس سے مر رہے ہیں۔''

لیکن ہم پیاس سے نہیں مر رہے تھے بلکہ پانی کی کھوج میں روز روز کی نہ ختم ہونے والی تکالیف ہمیں مارے ڈال رہی تھی۔ فی فرد ایک جگ پانی دیا جاتا تھا۔ فوجیوں کو باہر کی بہ نسبت کھدائی کے دوران زیادہ پیاس لگتی تھی۔ میں نے جب فوجیوں کو اپنے کیپٹن کا حکم سنایا تو انھوں نے سخت مخالفت کی۔ میں نے ایک افسر کا فرض نبھاتے ہوئے انھیں خاموش کیا اور ان کے پانی کے راشن میں اضافہ کر دیا۔

3/مئی 1931

کھدائی کا کام جاری ہے۔ یہ کنواں کسی طلسمی دیو کی طرح ہمیں اپنی گرفت میں لیتا جا رہا ہے۔ پانی ملنے کی مدھم سی امید ہمیں کیڑے مکوڑوں کی طرح مٹّی میں کھدائی کرنے پر مجبور کر رہی ہے۔ جب بھی میں اپنے فوجیوں کی طرف دیکھتا ہوں، ریڑھ کی ہڈی میں جھرجھری سی دوڑ جاتی ہے۔ ان کی آنکھیں، پلکیں، کان اور نتھنوں پر مٹّی جم گئی ہے۔ بال مٹّی سے سفید ہو گئے ہیں۔ وہ گوشت پوست کے نہیں بلکہ مٹّی سے بنے معلوم ہوتے ہیں۔

24/مئی 1931

ہم کچھ میٹر اور نیچے پہنچے ہیں۔ کھدائی کی رفتار دھیمی ہے۔ ایک فوجی کنوئیں میں مٹّی کھودتا ہے۔ دوسرا کپّی چلاتا

ہے۔مٹّی گیسولین کے کین سے بنائی گئی بالٹی کے ذریعے اوپر آتی ہے۔کنوئیں کے اندر فوجی آکسیجن کی کمی کی شکایت کر رہے ہیں۔جب وہ کھودتے ہیں،کنوئیں کے اندر کا بے رحم،بوجھل،دم گھونٹنے والا دباؤ جیسے انھیں وہیں ملیامیٹ کر دینا چاہتا ہے۔

وہ اپنے مگ سے گرم گندا پانی پیتے ہیں مگر ان کی پیاس کبھی نہیں بجھتی۔وہ ان کے پھیپھڑوں میں کسی زہریلی ناگ پھنی کی طرح بیٹھی رہتی ہے۔کھدائی کرنے والا اپنے ننگے پیروں سے اس نمی کو تلاش کرتا ہے جو کبھی دور اس کے گاؤں کے کھیتوں میں اس کے پیروں کے نیچے ہوا کرتی تھی۔وہ پھر کدال چلاتا ہے،کھودتا ہے۔مٹّی گرتی جاتی ہے اس کے پیروں میں،اس کی پلکوں پر،لیکن وہ پانی کہیں نظر نہیں آتا جس کے لیے ہم سب جی جان سے جٹے ہوئے ہیں۔

5/جون 1931

ہم چالیس میٹر کی گہرائی پر پہنچنے والے ہیں۔فوجیوں کی حوصلہ افزائی کے لیے میں خود کنوئیں میں اترا اور کھدائی کی۔دور لڑائی جاری ہے اور ختم نہ ہونے والی تباہی بھی ابھی میلوں دور ہے۔مگر یہاں امید کی کوئی کرن دکھائی نہیں دیتی۔ہوا کا بھاری پن مجھے کھلنے لگتا ہے۔کنوئیں کا اندھیرا کسی بھاری چٹان سا مجھ پر آ گرا ہے اور میں باہری دنیا سے الگ تھلگ سا آ پڑا ہوں۔میں نے تیزی سے کدال چلاتے ہوئے وقت کی رفتار کو بڑھانے کی جی توڑ کوشش کی،مگر اس اندھے کنوئیں میں وقت جیسے ٹھہرا ہوا ہے۔باہر کی روشنی کے بدلاؤ کا یہاں کوئی احساس نہیں ہوتا،یہاں پر وقت گرتی ہوئی گرم دھول سے زیادہ کچھ بھی نہیں۔

16/جون 1931

عجیب بات ہے۔اندھیرے،سوکھے کنوئیں میں کام کرتے ہوئے پانی ہمارے خواب میں تیرنے لگا ہے۔اسموکی نے مجھے بتایا کہ کل وہ کنوئیں کی تہہ میں سو گیا اور اس نے وہاں چمکدار روشنی دیکھی۔اس نے روشنی کو پکڑنا چاہا تو وہ ہاتھ سے پھسل گئی۔دیکھتے ہی دیکھتے کنوئیں کی دیوار پر ایسے ہی کئی سانپ بلبلوں کی طرح نکلنے لگے۔ دراصل وہ سانپ نہیں بلکہ پانی کے دھارے تھے۔ان دھاروں پر اسموکی تب تک تیرتا رہا جب تک اس کی آنکھ نہیں کھل گئی۔اسے لگ رہا تھا کہ ہر پیڑ پر ایک فوارہ بن گیا ہے۔پیلی،سوکھی چراگاہ ندارد تھی اس کی جگہ ٹھنڈے پانی کی ہری بھری جھیل تھی۔جس میں ہمارے فوجی پیڑ کی گھنی چھاؤں کے نیچے نہا رہے تھے۔اسے فوجیوں کو جھیل کے اس پار فائرنگ کرتے دیکھ کر حیرت نہیں ہوئی اور نہ یہ دیکھ کر کہ فوجی ہنسی مذاق کے بیچ گولیاں پکڑنے کے لیے پانی میں کود رہے ہیں۔اسموکی صرف پانی پینا چاہتا تھا۔اس نے جھیل میں سے نکلتے فوارے سے پانی پیا مگر اس کی پیاس اس فوارے سے نہیں بجھی،کیونکہ یہ سب دھوکہ تھا......آنکھوں کا چھلاوہ تھا۔گذشتہ رات اسموکی بخار کی شدت سے تپتا رہا۔میں اسے رجمنٹ کے مرکز بہ غرض علاج روانہ کرنے کا انتظام کیا۔

27/جون 1931

ڈویژن کے آفیسر نے یہاں سے گزرتے ہوئے اپنی کار ہمارے کیمپ پر رکوائی۔اسے اس بات پر

یقین نہیں آ رہا تھا کہ ہم لوگوں نے کین سے بنی بالٹی اور کپّی کی مدد سے پینتالیس میٹر گہرا کنواں کھودا ہے۔
''کرنل، جب کسی فوجی کی شفٹ کا کام ختم ہو جاتا ہے تو اسے کنوئیں سے باہر بلانے کے لیے ہمیں چلّانا پڑتا ہے۔'' میں نے اسے بتایا۔

لوٹنے کے بعد کرنل نے کوکا کے پودے اور سگریٹوں کے ساتھ ساتھ ایک بِگل بھی بھیج دیا۔

ہم کھدائی میں لگے رہے۔ ہر بار پہلے سے کہیں زیادہ اکیلے......بے حال...... عجیب طرح کے خیالوں کے بیچ ڈوبتے ابھرتے ہم کھدائی کا کام کرتے رہے.....کھودتے رہے.....جیسے اس کنوئیں کے بھاری ماحول میں ناچتی موت کی تال اور ٹھوس زمین پر نہیں بلکہ خود پر کدال چلاتے رہے ہوں۔

4/ جولائی 1931

کیا حقیقت میں پانی جیسی کوئی چیز دنیا میں ہے؟ اسموکی کے بعد ہم سبھی اس کے خواب دیکھنے لگے ہیں۔ پیڈریجا نے دیکھا کہ وہ اچانک آئی پانی کی باڑھ میں ڈوب رہا ہے اور پانی اس کے سر پر سے گزر رہا ہے۔ ٹرسٹا کے مطابق کھودتے ہوئے اسے محسوس ہوا کہ اس کی کدال برف کی سل سے ٹکرائی، جبکہ چاکون کو زمین کے نیچے کئی بار جھیل دکھائی دی۔ ہم سوچ میں پڑ جاتے.....اس قدر پسینہ بہانے کے باوجود پانی کے چشمے ہمارے خوابوں تک ہی محدود کیوں ہیں؟

16/ جولائی 1931

فوجی بیمار پڑ رہے ہیں۔ وہ مورچے پر لڑ مرنے کو تیار ہیں۔ مگر کنوئیں میں اترنے سے انکار کر رہے ہیں۔ میں نے انھیں سمجھایا۔ میں خود کنوئیں میں اترا اور جلد ہی خوفزدہ ہو کر حیرت میں ڈوبا باہر آ گیا۔ ہم قریب پچاس میٹر گہرا کھود چکے ہیں۔ گہرائی کے ساتھ کنوئیں کا اندھیرا گہرا ہوتا جا رہا ہے۔ اندھیرے کی چبھن سے جسم میں عجیب سا ساکت پن در آتا ہے۔ نیچے مٹّی کی پرتیں دم گھوٹنے لگتی ہیں اور وہاں ایک گھنٹے سے زیادہ ٹھہرنا ناممکن لگتا ہے۔ یہ سب ایک برے اور بھیانک خواب سا معلوم ہوتا ہے۔ یہ چاکو کی مٹّی کس قدر عجیب وغریب ہے۔

25/ جولائی 1931

ہر ایک گھنٹے کے بعد کنوئیں میں کھدائی کرنے والے کو واپس بلانے کے لیے کرنل کے ذریعے بھیجا گیا بِگل کنوئیں کے منہ پر بجایا جاتا ہے۔ بِگل کی آواز نیچے گہرائی میں کام کرنے والوں کی کنپٹیوں پر ہتھوڑے سی بجتی ہے لیکن اس دوپہر بِگل بجانے کے باوجود کوئی کنوئیں سے باہر نہیں آیا۔

29/ جولائی 1931

آج چاکون بے ہوش ہو گیا۔ جب اسے یہاں سے لے جایا جا رہا تھا وہ پھانسی پر لٹکائے گئے شخص جیسا

نظر آ رہا تھا۔

5/ستمبر 1931

کیا یہ کھدائی کا کام کبھی ختم نہیں ہوگا؟ پانی ملنے کی امید نہ ہونے کے باوجود فوجی کھدائی میں لگے ہیں....... بے مقصد۔ اوپر سے یہ کنواں کبھی نہ ختم ہونے والی جنگ کی طرح لگنے لگا ہے۔ جگہ جگہ کنوئیں سے نکالی گئی مٹّی کے ٹیلے بن گئے ہیں جن پر چھپکلیاں اور بچھو گھومتے رہتے ہیں۔ جب کوئی کھدائی کرنے والا دھول مٹّی سے لت پت باہر نکلتا ہے تو کسی راکشس کی طرح دکھائی دیتا ہے۔ ماحول کو بہتر بنانے کے لیے میں اس سے پوچھتا ہوں: ''کچھ ملا؟''

''کچھ نہیں، ابھی بھی کچھ نہیں لیفٹیننٹ۔''

کچھ نہیں......کچھ نہیں، ہماری اس لڑائی کی طرح شاید اس 'کچھ نہیں' کا کبھی خاتمہ نہیں ہوگا۔

یکم اکتوبر 1931

کھدائی روک دینے کے احکامات ملے ہیں۔ سات ماہ کی مسلسل کھدائی کے باوجود اس گرم دھول کے علاوہ ہمارے ہاتھ کچھ نہیں لگا ہے۔ اس بیچ آؤٹ پوسٹ کافی بدل گئی ہے۔ کچھ کیبنوں کے علاوہ ایک کمانڈ اسٹیشن بھی بن گیا ہے۔ اب ہمیں مشرق کی جانب ایک سڑک بنانے جانا ہے۔ مگر ہمارا بیس کیمپ اسی جگہ رہے گا۔ یہ منحوس کنواں بھی کسی دشمن کی طرح ہمارے درمیان رہے گا.....سنّاٹے میں ڈوبا ہوا اپنی بے معنی گہرائی کے ساتھ.....بے کار!

7/دسمبر 1931

آخر کار وہ کنواں بے کار ثابت نہیں ہوا۔ میری یادداشت اب بھی سلامت ہے......چار تاریخ کو حملہ ہوا تھا اور وہ مجھے یہاں پانچ تاریخ کو لائے تھے۔ میں ملیریا کی وجہ سے کانپ رہا تھا۔ ظاہر ہے، مورچے پر پکڑے گئے ہمارے فوجیوں نے دشمن پیرا گونوں کو بتایا ہوگا کہ ہماری تعیناتی کے پیچھے ایک کنواں ہے۔ پیاس سے بے حال دشمنوں نے ہم پر حملہ کرنے کے بارے میں سوچا ہوگا۔ صبح چھ بجے کے قریب وہ علاقہ مشین گنوں کی تڑ تڑاہٹ سے کانپ اٹھا تھا۔ دشمن کی گولہ باری ہم سے دو سو میٹر آ گے تھے۔ دو بم ہمارے تمبو کے پیچھے گرے۔

میں نے فوجیوں کو ان کی دھول کھا رہی رائفلیں تھما دیں اور انھیں صحیح جگہ تعینات کر دیا۔ اسی وقت ہمارا ایک افسر مشین گن اور کچھ فوجیوں کے ہمراہ ہم سے آ ملا۔ اس نے اپنے فوجیوں کو کنوئیں کی بائیں جانب قطار بند تعینات کر دیا۔ ہم کنوئیں کے دائیں جانب تھے۔ کچھ فوجیوں نے مٹّی کے ٹیلوں کے پیچھے پوزیشن سنبھال لی۔ گولیاں عجیب سی آواز کرتی سوکھی ٹہنیوں پر برستی رہیں۔ مشین گن کی گولیوں نے ایک بڑے پیڑ کو چھید کر رکھ دیا۔ پیرا گونوں کی گولیوں کی بوچھار نزدیک آتی گئی۔ گولیوں کی آوازوں کے بیچ ان کی وحشی آوازیں واضح طور پر سنی جاسکتی تھیں۔ انھوں نے کنوئیں پر قبضہ کرنے کے مقصد سے حملہ تیز کر دیا تھا۔ لیکن ہم ایک انچ بھی پیچھے نہیں ہٹے۔ کنوئیں کی حفاظت اس طرح کرتے رہے جیسے اس میں سچ مچ پانی ہو۔ گولیوں کی بوچھار سے دھول کے غبار اُڑتے رہے.......

مشین گنوں کی گولیاں فوجیوں کے سروں اور چھاتیوں کو چھلنی کرتی رہیں۔ لیکن ہم نے پانچ گھنٹے تک چلی اس مڈبھیڑ کے باوجود کنوئیں کو نہیں چھوڑا۔ دوپہر میں وہاں موت سا سنّاٹا چھا گیا۔ دشمن لوٹ چکا تھا۔ ہم نے لاشوں کو اٹھایا۔ پیرا گون اپنے پیچھے پانچ فوجیوں کی لاشیں چھوڑ گئے تھے۔ ہمارے آٹھ شہیدوں میں اسموکی، پیڈر ریجا، ٹرسٹا اور چاکون بھی شامل تھے۔ ان کی چھاتیاں ننگی تھیں۔ کھلے منہ سے دھول بھرے دانت چمل رہے تھے۔

پہاڑی پر چھائی سڑی گرمی میں قبر کھودنے کی محنت سے بچنے کے لیے میں نے اس کنوئیں کا استعمال کرنے کے بارے میں سوچا۔ تیرہ لاشوں کو کنوئیں کے منہ تک کھینچ کر لایا گیا اور انھیں اس کنوئیں کی گہری تاریکیوں میں آہستگی سے دھکیل دیا گیا۔ لاشیں کنوئیں کی گہرائی میں غائب ہوگئیں۔ اوپر سے مٹّی ڈال دی گئی...... ڈھیر ساری مٹّی اور دھول۔ اس کے باجود یہ کنواں آج بھی پورے چاکو میں سب سے گہرا ہے۔☆☆☆

لے سانس بھی آہستہ

(ناول)

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہہِ شیشہ گری کا

– میری تقی میؔر

میرا نیا ناول '**لے سانس بھی آہستہ**' درحقیقت میؔر کے اسی شعر کی ترجمانی کرتا ہے۔
اس انتہائی ترقی یافتہ سائنسی عہد میں ہمارا معاشرہ اچانک ایک ایسی تاریک سرنگ میں داخل ہوگیا ہے۔ جہاں حقیقت اور تصوریت سے الگ ایک سوال ذہن میں پیدا ہوتا ہے...... 'کہ کیا مذہبی تصورات اس جینوم اور کلوننگ عہد میں قابلِ قبول بھی ہیں یا نہیں—؟

یا پھر یہ— کہ جدید طرز زندگی اور عریانیت اگر ایک دوسرے کے ہم خیال ہیں تو پھر انسانی اخلاقیات کے کورے صفحوں کو لکھنے کی نہ ذمہ داری کس کی ہے......؟

شاید اسی لیے یہ کہانی ایک ایسے موقع پر جنم لیتی ہے جب سن ۲۰۰۹ کے آخر میں کوپن ہیگن میں ماحولیات کے تحفظ کو لے کر ہونے والی کانفرنس ایک فلاپ شو میں تبدیل ہوجاتی ہے۔ ایک ایسے پرآشوب اور پرفریب عہد میں، جہاں بھوتوں کی آن لائن شاپنگ کے دروازے کھلتے ہیں، یہ کہانی ایک ایسے کردار کو شامل لے کر چلتی ہے جو ۴۷ء آزادی ملنے سے صرف ایک گھنٹے پہلے پیدا ہوتا ہے۔

ایک غلام ملک کی اخلاقیات جو صرف ایک گھنٹے بعد ایک آزاد ملک کی اخلاقیات میں تبدیل ہوجاتی ہے۔

— کہیں نہ کہیں اس بے حد لاغر اور مجبور انسان کی اخلاقیات، انسان نہیں بلکہ قدرت لکھ رہا ہے۔ تہذیبوں کا تصادم جاری ہے۔ مگر ریموٹ اور کمان درحقیقت قدرت کے ہاتھ میں ہے اور یہی اس ناول کا موضوع ہے۔

– **مشرف عالم ذوقی**

مارگریٹ دیوراس

ترجمہ: قاسم ندیم

نل کاٹنے والا

یہ واقعہ گرمی کے ایک دن مشرقی فرانس کے ایک گاؤں میں تین چار برس قبل، دوپہر کے بعد رونما ہوا تھا۔ ایک آدمی نل کاٹنے کے لیے واٹرڈپارٹمنٹ سے کچھ لوگوں کے ساتھ یہاں آیا۔ یہاں رہنے والے باقی آبادی سے الگ کچھ مخصوص لوگ تھے۔ مقامی انتظامیہ نے انھیں ایک ویران ریلوے اسٹیشن پر رہنے کی اجازت دے رکھی تھی۔ تیز رفتار گاڑیاں اب دوسرے اسٹیشنوں سے ہو کر گزرنے لگی تھیں۔ شوہر گاؤں میں چھوٹا موٹا کام کرتا تھا۔ شاید ٹاؤن حال کی طرف سے بھی اس خاندان کو کچھ مدد مل جایا کرتی تھی۔ ان کے دو بچے تھے۔ ایک چار سال کا اور دوسرا ڈیڑھ سال کا۔

وہ بہت غریب تھے اور گیس، بجلی اور پانی کے بلوں کی ادائیگی نہیں کر پاتے تھے لہٰذا ایک دن ان کے گھر نل کاٹنے والا آ پہنچا۔ اس نے عورت کو دیکھا، جو کچھ نہ بولی۔ اس کا شوہر گھر پر نہیں تھا۔ دونوں بچے گھر ہی میں تھے۔ جو آدمی ان کے گھر آیا وہ دوسرے آدمیوں جیسا ہی دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے اس کا نام ''نل کاٹنے والا'' رکھا۔ اسے احساس تھا کہ گرمی اپنے شباب پر ہے۔ اسے احساس تھا کیونکہ اس گرمی کی شدت کو وہ خود بھی محسوس کر رہا تھا۔ اسے پتہ تھا کہ اس سال گرمی کچھ زیادہ ہی تھی۔ اس نے اٹھارہ ماہ کے بچے کو بھی دیکھا مگر اس سے کہا گیا تھا کہ وہ نل کاٹ ڈالے، اس نے اسی بات پر عمل کیا۔ اس نے اپنی ذمہ داری نبھائی اور پانی کاٹ ڈالا۔ اس نے عورت کو، بچوں کو پینے کے پانی سے محروم کر دیا، انھیں نہانے دھونے کے پانی سے محروم کر دیا۔ اس شام وہ عورت اور اس کا شوہر اپنے دو بچوں کے ساتھ تیز رفتار گاڑی کی پٹری پر لیٹ گئے جو پاس کے اسٹیشن سے گزرتی تھی۔ وہ سبھی ایک ساتھ مر گئے۔ صرف سو گز کا فاصلہ۔ جاؤ اور لیٹ جاؤ۔ بچوں کو چپ کراؤ۔ انھیں سلانے کے لیے شاید لوری گاؤ۔

لوگوں کا کہنا تھا کہ گاڑی رک گئی تھی۔ کہانی تو یہی تھی۔

واٹرڈپارٹمنٹ کے کارندے نے کہا کہ اس نے وہاں جا کر پانی کاٹ دیا ہے۔ اس نے یہ نہیں کہا اس نے بچوں کو دیکھا تھا یا یہ کہ بچہ ماں کے پاس تھا۔ اس نے بتایا کہ عورت نے کوئی بحث نہیں کی، نہ ہی اسے نل کاٹنے

سے روکا۔ ہمیں تو صرف اتنا ہی معلوم ہے۔

یہ کہانی جو میں نے سنائی ہے اس میں مجھے اچانک اپنی آواز سنائی دینے لگی ہے۔ اس عورت نے کچھ نہیں کیا، کوئی جرح نہیں کی۔ یہ سب ٹھیک ایسے ہی رونما ہوا تھا۔ ہمیں اس بات کی معلومات واٹر ڈپارٹمنٹ کے کارندے سے ہی ملی تھی۔ کوئی سبب ہی نہیں تھا کہ وہ کارندہ حکم پر عمل نہ کرے۔ اس عورت نے اسے پانی کاٹنے سے روکا ہی نہیں تھا۔ کیا ہم سے بھی یہی توقع ہے کہ ہم ایسا سمجھیں؟ یہ پورا واقع آپ کو پاگل کر دینے کے لیے کافی ہے۔

تو میں یہ بات جاری رکھتی ہوں اور سمجھنے کی کوشش کرتی ہوں۔ اس نے نل کاٹنے والے سے اپنے بچوں کے بارے میں کوئی بات نہیں کی۔ کیونکہ وہ خود اس گرمی میں موجود تھا۔ عورت نے نل کاٹنے والے کو جانے دیا۔ اس کے بعد وہ چند لمحے اپنے بچوں کے ساتھ وہاں رکی، پھر گاؤں چلی گئی۔

وہ اس کیفے میں گئی جس کا پتہ اس کے پاس تھا۔ ہمیں معلوم نہیں کہ اس نے کیفے کی مالکن سے کیا کہا۔ ہمیں نہیں معلوم کیفے کی مالکن نے عورت سے کچھ کہا یا نہیں۔ ہمیں صرف یہ معلوم ہے کہ اس عورت نے موت کے بارے میں کوئی بات نہیں کی۔ ہوسکتا ہے اس نے کیفے کی مالکن کو ساری بات بتائی ہو لیکن اس نے یہ نہیں بتایا کہ اس کا منشا کیا ہے؟ یا خودکشی کرنے کا ارادہ ہے۔ یا پھر اس نے اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ مر جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

چونکہ نامہ نگاروں کو معلوم نہیں تھا کہ اس نے کیفے کی مالکن سے کچھ باتیں کی تھیں لہٰذا انھوں نے اس پورے معاملے کا ذکر تک نہیں کیا۔ اس معاملے سے میری مراد ان سلسلہ وار واقعات سے ہے جس کی شروعات تب ہوئی جب پورے خاندان کی موت کا فیصلہ کرنے کے بعد وہ اپنے دو بچوں کے ساتھ باہر نکلی۔ مرنے سے پہلے کچھ کرنے یا کچھ کہنے! وہ کب گھر سے باہر نکلی ہمیں نہیں معلوم۔

نل کے کٹنے اور کیفے سے اس کی واپسی کے درمیانی فاصلے کی خاموشی کو اب میں کہانی میں واپس لاتی ہوں۔ دوسرے لفظوں میں، میں ادب کی گہری خاموشی کو واپس لاتی ہوں اسی سے مجھے مدد ملتی ہے۔ میں اس طرح کہانی میں داخل ہوسکتی ہوں: وہ اپنے شوہر کا انتظار کرسکتی تھی۔ اسے بتا سکتی تھی کہ اس نے سب کی موت کا فیصلہ کر لیا ہے بجائے اس کے وہ گاؤں جا کر کیفے میں داخل ہوتی۔

اگر اس نے اپنی بات کی تفصیل بتائی ہوتی تو میری اس میں دلچسپی ختم ہو جاتی۔ ایک دوسری عورت کرسٹین ویلمین میں بھی میری دلچسپی جنون کی حد تک ہے۔ اس لیے کہ وہ دو جملے بھی بول نہیں پاتی۔ کیونکہ وہ بھی عورت کی طرح بے پناہ غصے سے بھری ہوئی ہے۔ ان دونوں عورتوں کا برتاؤ عام طور پر ظاہر ہوتا ہے۔ ان کا یہی برتاؤ ہم خاموشی کے نام منسوب کرتے ہیں۔

آدمیوں کا برتاؤ خموشیوں سے منسوب کرنا مشکل ہے۔ خاموشی کوئی مردانہ علامت نہیں ہے۔ ادب بھی عورتوں کا ہی زیادہ تخلیق کیا گیا ہے۔ چاہے اس میں عورت کا کردار ہو یا عورتوں کے ذریعے تخلیق پائے۔ عورتوں کا ہی ادب ہے۔

اس عورت نے بات ضرور کی ہوگی۔جس کے بارے میں لوگ سوچتے ہیں کہ اس نے کوئی بات نہیں کی ہوگی۔اس لیے کہ وہ کبھی بات کرتی ہی نہیں تھی۔اس نے اپنے فیصلے کے بارے میں بات نہیں کی ہوگی۔اس نے کچھ ایسا کہا ہوگا جس نے اس کے فیصلے کی جگہ لی ہوگی۔کچھ ایسا کہا ہوگا اس نے ، جو اس کے اپنے فیصلے کا حل رہا ہوگا۔ان لوگوں کے لیے بھی فیصلے کا حل رہا ہوگا ، جنھوں نے اس کہانی کو سنا۔شاید اس نے گرمی کے بارے میں کچھ کہا ہو۔الفاظ کو پاکیزہ رکھنا چاہیے۔

ایسے ہی وقت زبان اپنے نقطۂ انتہا کو چھونے لگتی ہے۔اس نے کیفے کی مالکن سے کچھ بھی کہا ہو، اس کے لفظوں نے سبھی کچھ کہہ دیا ہوگا۔وہ تین الفاظ جو فیصلے پر عمل کرنے سے پہلے اس نے کہے، ان لوگوں کی تاحیات خاموشی کا ہی حل تھے لیکن کسی کو بھی وہ الفاظ یاد نہیں ہیں۔

زندگی میں ہمیشہ یہی ہوتا ہے۔جب کوئی چلا جاتا ہے یا مر جاتا ہے یا پھر کوئی غیر متوقع طور پر خودکشی کا واقعہ ہو جاتا ہے، لوگ بھول جاتے ہیں کہ کیا کہا گیا تھا۔پہلے ایسا کیا رونما ہوا تھا جس سے لوگوں کو ہوشیار ہو جانا چاہیئے تھا۔وہ چاروں گئے اور تیز رفتار گاڑی کی پٹری پر جا کر لیٹ گئے۔آدمی اور عورت نے اپنی بانہوں میں ایک ایک بچے کو بھر لیا اور ریل گاڑی کا انتظار کرنے لگے۔نل کاٹنے والے کا اس دنیا میں اب ایک بھی دشمن نہیں رہا۔

نل کاٹنے والے کی کہانی میں میں ایک بات اور جوڑنا چاہتی ہوں۔جس عورت کو سبھی لوگ ذہنی طور پر کمزور سمجھتے تھے۔اسے کچھ تو یقینی طور پر معلوم تھا۔اسے پہلے سے بھی بہتر طور پر معلوم تھا کہ وہ اور اس کا خاندان بے سہارا ہے۔اسے معلوم تھا اسے سبھی چھوڑ چکے ہیں۔یہاں تک کہ پورے سماج نے انھیں نظر انداز کر دیا ہے اور یہ کہ مرنے کے علاوہ اس کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔اتنا اسے معلوم تھا۔یہ معلومات بڑی بھیانک اور حیرت انگیز ہے۔اس لیے اگر کوئی اس کے بارے میں بات کرے تو اس کی ذہنی کمزوری کے سوال پر اسے دوبارہ غور کرنا چاہیئے ، جو کوئی بھی نہیں کرے گا۔اسے شاید آخری بار یاد کیا جا رہا ہے۔میں اس کا نام لینے جا رہی ہیں لیکن مجھے اس کا نام یاد نہیں ہے۔

اب کیس کو بند کیا جا چکا ہے۔

اب شاید گرمی میں مرنے سے پہلے ایک بچے کی پیاس ہی ہے جو یاد رہتی ہے اور ایک ذہنی طور سے کمزور جوان ماں، جو مقررہ وقت سے پہلے اِدھر اُدھر گھوم رہی تھی۔

☆☆☆

سمرقند

امین مالوف

ترجمہ: محمد عمر میمن

بحرِ اوقیانوس کی تہ میں ایک کتاب ہے۔ میں آپ کو اس کی سرگزشت سنانے والا ہوں۔

آپ کو شاید کہانی کے انجام کا علم ہے۔ معاصر اخباروں نے اس کی بابت لکھا تھا، جس طرح دوسروں نے بعد میں۔ جب 14 اپریل 1921 کی شب ٹائٹینک نئی دنیا کے ساحل سے تھوڑے فاصلے پر غرق ہوا، تو اس کا سب سے بلند مرتبت شکار ایک کتاب تھی، عمر خیّام، دانائے ایرانی، شاعر اور عالمِ ہیئت کی رباعیات کا اکلوتا نسخہ۔

میں جہاز کی تباہی کے ذکر پر طولِ کلام نہیں کروں گا۔ دوسروں نے پہلے ہی ڈالروں میں اس کی قیمت کا تخمینہ لگا دیا ہے، مرنے والوں کی فہرست بنا دی ہے اور لوگوں کے آخری الفاظ قلم بند کر دیے ہیں۔ اس واقعے کے چھ سال گزرنے کے بعد بھی گوشت وسیاہی کی اس شے کا خیال جس کا میں نااہل نگہبان تھا ہنوز مجھ پر مسلّط ہے۔ کیا یہ میں، بینجامن او۔ لیسیج، ہی نہیں تھا جس نے اس کو اس کی ایشیائی زاد بوم سے اُچک لیا تھا؟ کیا یہ میرے سامان میں نہیں تھی کہ اسے ٹائٹینک پر سفر کے لیے نکلنا پڑا؟ اور کیا اس کے زمانوں کے سفر میں میری صدی کی نخوت پسندی نے دخل اندازی نہیں کی تھی؟

اس وقت سے دنیا روز بہ روز لہو اور اداس اندھیروں میں اور زیادہ ڈوبتی جا رہی ہے، اور زندگی نے مجھ پر مسکرانا چھوڑ دیا ہے۔ مجھے خود کو لوگوں سے دور کرنا پڑا ہے تا کہ اپنی یاد کی آواز کو سن سکوں، ایک سادہ لوح امید اور ضدّی وہم کی پرورش کر سکوں کہ کل یہ قلمی نسخہ مل جائے گا۔ اپنے زرّیں بکسے میں مامون، یہ سمندر کی تاریک گہرائیوں سے صحیح سلامت برآمد ہوگا، اس حال میں کہ اس کی قسمت ایک نئے جوکھوں بھرے طویل سفر سے مالا مال ہو چکی ہوگی۔ لوگ اسے اپنی انگلیوں سے الٹ پلٹ سکیں گے، اسے کھول سکیں گے اور اس میں خود کو گم۔ مقیّد آنکھیں اس کی مہمات کے وقائع کا حاشیہ حاشیہ تعاقب کریں گی، وہ شاعر کو دریافت کریں گی، اس کے اولین کلام، اس کی اولین مدہوشیوں کے دورے اور اس کے اولین خوفوں کو؛ اور فرقۂ حشّاشین۔ پھر وہ ایک تصویر پر آ کر رک جائیں گی، متأمل، جوریت اور زمرّد کے رنگ کی ہے۔

اس پر نہ تاریخ پڑی ہے نہ کسی کے دستخط ہی ہیں، کچھ بھی تو نہیں، سوائے ان لفظوں کے جو پُرجوش بھی ہو سکتے ہیں یا مایوسانہ: ''سمرقند، حسین ترین چہرہ جو زمین نے کبھی سورج کو دکھایا ہو۔''

پھلی کتاب

شعراء اور عشّاق

ناکردہ گناہ در جہان کیست بگو
وآنکس کہ گنہ نکرد چون زیست بگو
من بَد کنم و تو بَد مکافات بدہی
پس فرق میانِ من و تو چیست بگو

عمر خیّام

باب ا

کبھی کبھار سمرقند میں، ایک سست رو اور بے کیف دن کی شام، اہالیان شہر وقت گزاری کے لیے دو میخانوں والی سڑک کے آخر پر آ نکلتے جہاں مرچ بازار کے قریب آ کر راستہ ختم ہو جاتا تھا۔ وہ یہاں سُغد کی شراب کا ذائقہ چکھنے کے لیے نہیں آتے تھے جس سے مشک کی مہک اٹھتی تھی، بلکہ آمد و رفت کا نظارہ کرنے یا کسی بدمست کی گھات میں، جسے زمین پر پٹخا جاتا، خوب ذلیل کیا جاتا، اور ایسے جہنّم بھیجنے کی بد دعا دی جاتی جس کی آتش، دنیا کے ختم تک، شراب کی ترغیبات کی گلگونی کی یاد دلاتی رہے۔

1027ء کی گرمیوں میں ایسے ہی کسی واقعے سے ''رباعیات'' کا مخطوطہ معرضِ وجود میں آنے والا تھا۔ عمر خیام چوبیس سال کا تھا اور حال ہی میں سمرقند میں وارد ہوا تھا۔ کیا اُس شام وہ میخانے کا قصد کرے یا آرام آرام سے مٹرگشت؟ ڈھلتے دن کے ہزار تماشوں کی ہم راہی میں اس نے ایک نادیدہ شہر میں سڑکیں ناپنے کے شیریں لطف و نشاط کا انتخاب کیا۔ ریوندِ چینی کے کھیتوں والی سڑک پر ایک چھوٹا سا لڑکا بڑی تیزی سے اس کے پاس سے

گزر گیا۔ وہ چوڑی سِلوں سے پٹے راستے پر ننگے، دبے پاؤں ایک سیب مضبوطی کے ساتھ گردن سے چپکائے ہوئے تھا جو اس نے کسی خوانچے سے اُچک لیا تھا۔ پارچہ فروشوں کے بازار میں، ایک ذرا اونچے سے دکانچے پر، نرد بازوں کی ایک ٹولی روغنی مشعل کی روشنی میں بیٹھی اپنی بحثا بحثی میں لگی رہی۔ دو پانسے اچھلے، جس کے بعد لعنت ملامت، اور پھر دبی دبی سی ہنسی۔ ریسمان سازوں کے مسقّف راستے پر، ایک خچّر بان ایک فوارے کے پاس آ کر رک گیا، ٹھنڈے پانی کو اپنی اوک میں گرنے دیا، پھر جھکا، ہونٹ یوں باہر کو نکلے ہوئے جیسے کسی محوِ خواب بچّے کی پیشانی کو چومنے کو ہوں۔ پیاس بجھا کر اس نے اپنی گیلی ہتھیلیاں چہرے پر پھرائیں اور بڑ بڑا کر خدا کا شکر ادا کیا۔ پھر وہ ایک جوف دار تربوز لے کر آیا، اسے پانی سے بھرا اور اپنے جانور کے پاس لے گیا تا کہ پانی پینے کے لیے اس کی باری بھی آ جائے۔

پکے پکائے کھانوں کے بازار کے چوک میں ایک پندرہ سالہ لڑکی نے جو امید سے تھی اور جس کی نقاب الٹی ہوئی تھی خیام کو مخاطب کیا۔ اپنے بھولے بھالے چہرے پر مسکراہٹ لائے یا ایک لفظ کہے بغیر اس نے اس کے ہاتھوں سے چند سِکی ہوئی بادامیں چپکے سے کھسکا دیں جو اس نے ابھی ابھی خریدی تھیں، لیکن سیر کرنے والے کو اس پر تعجب نہیں ہوا۔ سمرقند میں یہ قدیم عقیدہ ہے کہ جب کسی ہونے والی ماں کی کسی من بھاؤ نے اجنبی سے سڑک پر مڈ بھیڑ ہوتی ہے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس کے کھانے میں شریک ہو تا کہ بچّہ اتنا ہی خوش شکل نکلے، اس کا پہلو کا رخ بھی اتنا ہی نازک اندام ہو، اس کے خط و خال بھی اتنے ہی نجیب اور ہموار ہوں۔

عمر وہیں لٹکا رہا، فخر سے بقیہ بادامیں چباتے ہوئے اس ناشناسا عورت کو دور جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اچانک کسی آواز نے اسے وہاں سے جلدی کرنے کی تحریک دلائی۔ جلد ہی وہ ایک بے قابو ہجوم کے بیچوں بیچ میں تھا۔ ایک پیرِ فرتوت، جس کے لمبے لمبے استخوانی اعضا تھے، پہلے سے زمین پر چت پڑا ہوا تھا۔ اس کا سر ننگا تھا اور بس اس کی دھوپ سے سنولائی ہوئی چندیا پر گنے چنے سفید بال منتشر تھے۔ طیش اور خوف کی جو چیخیں اس کے منھ سے نکل رہی تھیں ان کی حیثیت ایک لمبی سسکی سے زیادہ نہ تھی اور اس کی آنکھوں نے نو وارد کو بڑی عاجزی سے دیکھا۔

اُس بدقسمت کے چاروں طرف بیسیوں باریش بڑے انتقامی انداز میں اپنی جریبیں لہرا رہے تھے، اور کچھ فاصلے پر ایک اور ٹولی بڑے جوش و خروش سے اس منظر کو دیکھ رہی تھی۔ ان میں سے ایک نے خیام کے چہرے پر خوف و ہراس کا تأثر دیکھ کر اسے تسلّی دی، ''پریشان مت ہو۔ یہ تو بس جابرِ لاغر ہے!'' عمر ٹھٹھکا اور ندامت کی ایک لہر اس کے جسم میں سنسنا گئی۔ ''جابر، ابوعلی کا رفیق!'' وہ بڑبڑایا۔

یوں تو ابوعلی ناموں میں کا بے حد عام سا نام تھا، لیکن جب بخارا، قرطبہ، بلخ یا بغداد میں کوئی صاحبِ علم و فضل اسے اتنے مانوس لحاظ اور پاسِ ادب کے لہجے میں ادا کرتا، تو اس کے مشارالیہ کے بارے میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہ جاتی۔ یہ ابوعلی ابن سینا تھا، جو مغرب میں Avicenna کے نام سے مشہور تھا۔ عمر کی اس سے

ملاقات نہیں ہوئی تھی، کیونکہ وہ اس کی پیدائش سے گیارہ سال پہلے ہی راہیِ ملکِ عدم ہو چکا تھا، تاہم وہ اس کی اپنی نسل کے بلا حجت استادِ گرامی، صاحبِ علم، علم بردارِ عقل و منطق ہونے کی حیثیت سے تکریم کرتا تھا۔

خیام پھر بڑبڑایا، ''جابر، ابوعلی کا منظورِ نظر چیلا!'' اگرچہ وہ اسے پہلی ہی بار دیکھ رہا تھا، اسے اس رقّت آمیز اور عبرت انگیز عقوبت کا علم تھا جو اس پر عائد کی گئی تھی۔ ابوسینا نے جلد ہی طب اور مابعدالطبیعیات کے دائروں میں اسے اپنا جانشین تصور کر لیا تھا؛ اس نے اس کی قدرتِ استدلال کو تحسین کی نگاہ سے دیکھا تھا اور صرف اس بات پر اس کی سرزنش کی تھی کہ وہ اپنے نظریات کی تشریح کے انداز میں ذرا زیادہ ہی خودبیں اور بدلحاظ واقع ہوا ہے۔ اس کے نتیجے میں جابر کو کئی بار حوالات کی سیر کرنی پڑی تھی اور تین بار عوام الناس کی زد و کوب کا نشانہ بھی بننا پڑا تھا، جس میں کی آخری سمرقند کے بڑے چوک میں واقع ہوئی جہاں اسے اپنے اہلِ خانہ کے سامنے ڈیڑھ سو کوڑے لگائے گئے۔ اس شرمساری سے وہ کبھی جانبر نہ ہو سکا۔ وہ ٹھیک کس لمحے کنارے سے لڑھک کر پاگل پن کی حد میں جا گرا تھا؟ بیشک اپنی بیوی کی وفات پر۔ اسے اِدھر اُدھر چیتھڑوں میں ڈگمگاتے دیکھا جا سکتا تھا، چیختے چلاتے ہوئے، بے ادبی سے اول فول بکتے ہوئے۔ بچوں کے غول اس کا پیچھا کرتے چلے آتے، تالیاں بجاتے اور اس پر سنگ برساتے، حتیٰ کہ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے تر ہو جاتیں۔

اس منظر کو دیکھتے ہوئے عمر یہ سوچے بغیر نہ رہ سکا، ''اگر میں نے احتیاط سے کام نہیں لیا، تو میرا بھی یہی حشر ہو سکتا ہے۔'' یہ بات نہیں تھی کہ اسے مدہوشی کا خوف تھا، کیونکہ وہ اور شراب ایک دوسرے کا پاس رکھنا سیکھ چکے تھے، اور ایک، دوسرے کو کبھی بھی سبک سر کرنے والا نہیں تھا۔ اسے خوف تھا تو اس بات کا کہ کہیں مجمع اس کے ناموس کی دیوار کو نہ ڈھا دے۔ اس آبرو باختہ آدمی کی حالت نے اسے کچھ زیادہ ہی ہراساں کر دیا اور اسے اس سے گریز کی خواہش محسوس ہوئی۔ اس کے باوجود اسے یہ احساس بھی تھا کہ وہ ابن سینا کے رفیق کو یوں مجمع کے رحم و کرم پر چھوڑ کر جا بھی نہیں سکتا۔ اس نے تین باوقار قدم اٹھائے، غیر جانبدارانہ انداز اختیار کیا اور شاہانہ اشارے کے ساتھ مستحکم آواز میں کہا۔

''اس غریب کی جان چھوڑو۔''

ٹولی کا سرغنہ جو جابر پر جھکا ہوا تھا، دخل اندازی کرنے والے کے پاس آیا اور سینہ تان کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی داڑھی کے سرتاسر، دائیں کان سے لے کر ٹھوڑی کی نوک تک، ایک گہرے زخم کا نشان پڑا تھا، اور یہ شکن آلود نیم رخ تھا جو اس نے عمر کے آگے بڑھاتے ہوئے فیصلہ کن انداز میں کہا، ''یہ آدمی شرابی ہے، ایک کافر،'' پھر آخری لفظ کسی کوسنے کی طرح سسیاتے ہوئے ادا کیا، ''ایک فیلَسوف!''

''سمرقند میں ہمیں فیلَسوف نہیں چاہئیں!''

بھیڑ سے تائید کی بڑبڑاہٹ ابھری۔ ان لوگوں کے نزدیک ''فلسفی'' کی اصطلاح ہر اس چیز پر دلالت کرتی تھی جو یونانی ملحدانہ علوم سے قریبی تعلق رکھتی ہو، اور اس سے بھی زیادہ ہر وہ چیز جو نہ دین ہو نہ ادب۔ اپنی کم

عمری کے باوجود خیام پہلے ہی سے ایک نامی گرامی فیلَسوف تھا اور یوں دیکھا جائے تو بے چارے جابر کے مقابلے میں کہیں زیادہ شکار کے قابل۔

زخم رسیدہ آدمی نے یقیناً اسے نہیں پہچانا تھا، کیونکہ وہ دوبارہ جابر کی طرف متوجہ ہو گیا جس کی زبان ہنوز گنگ تھی۔ اس نے اسے بالوں سے پکڑ لیا، سر کو تین چار جھٹکے دیے یوں جیسے کسی قریبی دیوار سے مار کر پاش پاش کر دینے کو ہو، لیکن پھر اچانک اسے چھوڑ دیا۔ اگرچہ سفّاک، یہ پھر بھی خود پر قابو رکھنے کی ایک وضع تھی، جیسے کہ یہ شخص اپنے عزم کا مظاہرہ کرنے کے باوجود ارتکابِ قتل سے ہچکچا رہا ہو۔ خیام نے دوبارہ مداخلت کے لیے اس لمحے کا انتخاب کیا۔

''اس بڈھے کی جان چھوڑو۔ یہ رنڈوا ہے۔ بیمار ہے — ایک دیوانہ۔ نہیں دیکھ رہے کہ یہ اپنے لبوں کو جنبش تک دینے سے عاجز ہے۔''

ٹولی کا سرغنہ اچھل کر خیام کی طرف آیا، اور اس کی داڑھی میں انگلی گھسیڑ دی۔

''لگتا ہے تم اسے خوب جانتے ہو! ہاں تو جناب کی ذاتِ شریف؟ تم سمرقند کے تو نہیں! اس شہر میں تمھیں کسی نے کبھی نہیں دیکھا!''

عمر نے حقارت کے ساتھ اس کا ہاتھ اپنے سے جھٹک دیا لیکن اب اتنی بے لچکی سے بھی نہیں کہ جس سے اسے لڑنے کا بہانہ مل جائے۔ آدمی ایک قدم پیچھے ہٹا پھر بھی اَڑا رہا، ''تمھارا کیا نام ہے، اجنبی؟''

خیام نے خود کو انھیں سپرد کرنے میں تأمل کیا۔ اس نے بچ نکلنے کی کوئی ترکیب سوچی۔ اس نے آنکھیں آسمان کی طرف اٹھائیں جہاں ہلکے سے بادل نے ابھی ابھی ماہِ ہلال کو ڈھانپ لیا تھا۔ وہ خاموش رہا، پھر ایک گہری سانس لی۔ اس نے خود کو غور و فکر میں غرق کرنے کی تمنا کی، اختر شماری کرنے کی، کہیں دور ہونے کی، بھیڑ بھاڑ سے محفوظ و مامون رہنے کی!

ٹولی نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا تھا اور کچھ ہاتھ اس کے جسم سے چُھلنے بھی لگے تھے۔ وہ واپس اپنی دنیا میں آ گیا۔

''میں عمر ہوں، نیشاپور کے ابراہیم کا بیٹا۔ اور تم کون ہو؟''

سوال محض ایک رسم نبھانے کو کیا گیا تھا۔ اس آدمی کی خود کو متعارف کرانے کی کوئی نیّت نہیں تھی۔ وہ اپنے وطن میں تھا اور سوال وہی کر رہا تھا۔ بعد میں جا کر عمر کو اس کا نام معلوم ہونے والا تھا۔ یہ ایک طالب علم تھا اور ''زخمی چہرہ'' کے لقب سے مشہور تھا۔ ہاتھوں میں لاٹھی اور لبوں پر ایک قول لیے وہ جلد ہی پورے سمرقند میں خوف و ہراس کی تھراہٹ دوڑانے والا تھا لیکن فی الوقت اس کی دھاک کا دائرہ اپنے ارد گرد پھیلے نوجوانوں سے آگے نہیں بڑھا تھا جو اس کے ہر لفظ اور ہر اشارے پر آمنّا و صدقّنا کہتے تھے۔

یک بارگی اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ وہ اپنے چیلوں کی طرف لوٹا، اور پھر فتح مندی سے مجمع کی طرف

رخ کر کے چلایا، ''یااللہ، میں کیوں عمر ابن ابراہیم خیام نیشاپوری کو پہچاننے سے عاجز رہا؟ عمر، ستارۂ خراسان، نابغۂ فارس وعراق، امیرِ فلاسِفہ!''

جب وہ خوب جھک جھک کر کورنش بجا لانے کی نقالی کر رہا تھا، تو اس نے اپنی دستار کے دونوں جانب اپنی انگلیاں پھڑ پھڑائیں اور ناظرین کو بے تحاشہ قہقہہ لگوانے میں کامیاب ہوگیا'' میں کیوں کر اس شخص کو پہچاننے میں ناکام رہا جس نے اتنی متقیانہ اور عبادت گزار رباعی کہی ہے:

ابریقِ مئے مرا شکستی ربّی
برمن درِ عیش را بہ بستی ربّی
برخاک فگندی مئے گلگونِ مرا
خاکم بدہن، مگر تو مستی ربّی

عمر نے یہ سخت برہمی سے سنا اور فکر مند ہوا۔ یہ اشتعال انگیزی اسی جگہ قتل کا بہانہ بن سکتی ہے۔ بغیر ایک لمحہ ضائع کیے، اس نے بڑی بلند اور واضح آواز میں جواب دیا تاکہ کوئی اُس شخص کے جھانسے میں نہ آجائے۔'' میں اس رباعی کو نہیں پہچانتا۔ حقیقت میں پہلی بار اسے سن رہا ہوں۔ لیکن یہ رہی ایک رباعی جو میں نے خود کہی ہے:

نہ کچھ جانیں، نہ جاننا چاہیں
تہی از علم یہ جو دنیا پہ حکمرانی کریں
ان میں سے نہیں، تو کافر کہلاؤ
نظر انداز کرو، خیام، اپنی راہ لگو

''تہی ازعلم'' کہتے وقت عمر کو واقعی اپنے حریفوں کی طرف استہزا سے اشارہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔ ہاتھ اس کی طرف اٹھے، اس کی عبا کو کھسوٹا، جو پھٹنے لگی۔ وہ ڈگمگا گیا، اس کی کمر کسی کے گھٹنے سے ٹکرائی اور وہ سنگِ سڑک پر جا پڑا۔ جب وہ اس غولِ بیابانی کے نیچے کچلا پڑا تھا، اس نے نبرد آزما ہوکر گلوخلاصی مناسب خیال نہیں کی بلکہ چارو ناچار اپنے لباس کو جسم سے پھٹ جانے دیا، اعضا سے چندی چندی ہو جانے دیا، اور اب تو اس نے اپنے کو اس مفلوج کیفیت کے سپرد کر دیا تھا جو کسی قربانی کے جانور کی ہوتی ہے۔ اسے کچھ بھی محسوس نہیں ہو رہا تھا، کچھ بھی سنائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ اپنے میں سمٹا سمٹایا پڑا تھا، اور برہنہ۔

یہاں تک کہ اس نے ان دس مسلّح آدمیوں کو جو اس قربانی کے مجمع کو منتشر کرنے آئے تھے داخل اندازی کرنے والوں میں ہی گردانا۔ یہ سمرقند کے بلدی فوجی رضا کار (ملیشیا) تھے جن کی نمدے کی ٹوپیوں پر ''احداث'' کا شناختی نشان جڑا ہوا تھا۔ اِنھیں دیکھتے ہی خیام پر حملہ کرنے والے پیچھے ہٹنے لگے، ساتھ ساتھ اپنے طرزِ عمل کو برحق دکھانے کی خاطر یہ بھی چلانے لگے'' کیمیا گر! کیمیا گر!''، اور ہجوم سے اس کی شہادت چاہی۔

اربابِ اقتدار کی نگاہ میں فلسفی ہونا کوئی جرم نہیں تھا، لیکن کیمیا گری کی عملیات کا مطلب موت نکل سکتا تھا۔

خیر، پہرے کا سربراہ بحثا بحثی میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔

''اگر یہ شخص واقعی کیمیا گر ہے،'' اس نے فیصلہ صادر کیا،'' تو ضروری ہے کہ اسے قاضی القضاۃ ابوطاہر کے پاس لے جایا جائے۔''

جب جابرِ لاغر، جسے اس درمیان میں سب بھول بھال گئے تھے، قریب ترین میخانے کی طرف رینگنے لگا، اور بتدریج اندر داخل ہوا، اس عزم کے ساتھ کہ اب ہرگز کبھی باہر نہیں نکلے گا، عمر کسی کی مدد کے بغیر خود ہی لشٹم پشٹم کھڑا ہوگیا۔ وہ ناک کی سیدھ میں چلنے لگا، عالمِ سکوت میں۔ اس کے تار تار لباس اور اس کے خون آلود چہرے کو اس کے انداز کی برتری نے کسی حجاب کی طرح ڈھانپا ہوا تھا۔ اس کے آگے آگے فوجی رضا کار مشعلیں اُٹھائے چل رہے تھے۔ دنبالے میں اس کے حملہ آور چلے آ رہے تھے، اور ان کے عقب میں منھ پھاڑ کر دیکھنے والوں کا ایک گروہ۔

عمر کو نہ وہ نظر آئے نہ سنائی دیے۔ جہاں تک اس کا تعلق تھا، راستے ویران پڑے تھے، ملک خاموش تھا، آسمان بے ابر، اور سمرقند ہنوز خوابوں کی وہ سرزمین تھا جسے اس نے چند سال پہلے دریافت کیا تھا۔

وہ یہاں تین ہفتوں کا سفر کرکے پہنچا تھا اور تھوڑا سا بھی آرام کیے بغیر گزرے وقتوں کے سیّاحوں کے مشورے پر عمل کرنے کا فیصلہ کر ڈالا تھا۔ قہندرز کے مرتفع پر جاؤ، انھوں نے صلاح دی تھی۔ اطراف واکناف پر خوب اچھی نظر ڈالو اور تمھیں پانی اور سبزہ دکھائی دے گا، پھولوں کے قطعے، سرو جنھیں فنّان مالیوں نے بیلوں، فیلوں، جفاکش شتروں، یا جنگ آمدہ پلنگوں کے قالب میں تراشا ہوگا جو بالکل چھلانگ مارتے ہوئے لگتے ہوں۔ بیشک، اندرونِ فصیل، خانقاہ کے پھاٹک سے، مغرب اور بابِ صین تک، عمر نے کبھی اتنے گھنے باغات اور شفاف چشمے نہیں دیکھے تھے۔ پھر، جہاں تہاں، ایک مینارۂ خشت بلند ہو رہا تھا، اپنے گنبد کے ساتھ جسے سایے نے تراشا تھا، کسی سیر بین مہتابی کی دیوار کی سفیدی اور، ایک جھیل کے کنارے، جو اپنے بیدِ مجنوں کے سایوں میں جانے کن سوچوں میں غلطاں تھی، ایک ننگی پیراک جھلستی ہوئی ہوا میں اپنے بال پھیلائے ہوئے تھی۔

کیا یہ بہشت کا وہی منظر تو نہیں تھا جس کی، بہت بعد میں، ''رباعیات'' کے قلمی نسخے کو مصوّر کرنے کی کوشش کے وقت وہ گم نام مصور یاد آوری کرانا چاہتا تھا؟ کیا یہ سب وہی نہیں تھا جو اس وقت اس کے ذہن میں گھوم رہا تھا، اس وقت جب اسے اسفزار کے علاقے لے جایا جا رہا تھا جہاں سمرقند کے قاضی القضاۃ ابوطاہر کی اقامت گاہ تھی؟ وہ بار بار اپنے سے یہی دہرا رہا تھا، ''میں اس شہر سے نفرت نہیں کروں گا۔ چاہے میری وہ پیراک دوشیزہ ایک سراب ہی کیوں نہ ہو۔ چاہے حقیقت سرد مہر اور زشت ہی کیوں نہ ہو۔ چاہے یہ سرد رات میری آخری رات ہی کیوں نہ ہو۔''

باب۲

قاضی کے طویل و عریض دیوان میں دور کے شمع دان خیام پر ایک عاج رنگ کی چھوٹ ڈال رہے تھے۔ ابھی وہ داخل ہوہی رہا تھا کہ دو ادھیڑ عمر کے پہرے داروں نے اسے کندھوں سے یوں جکڑ لیا جیسے وہ کوئی خونخوار یا پاگل ہو — اور اس حالت میں اسے دروازے کے پاس انتظار کرنا پڑا۔

قاضی جو کمرے کے دوسرے سرے پر بیٹھا ہوا تھا اس کی طرف متوجہ نہیں ہوا۔ وہ کسی قضیے پر حکم سنا رہا تھا، مدعیان سے محوِ مناقشہ تھا، ایک سے استدلال اور دوسرے کی سرزنش۔ قرینے سے یہ دو ہمسایوں کے مابین کوئی پرانا جھگڑا الگ رہا تھا، فرسودہ و دیرینہ شکوے شکایات اور کٹ حجتی سے متعلق۔ ابو طاہر نے بڑے اعلانیہ طور پر اپنی بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے کارروائی لپیٹ دی، دونوں خاندانوں کے سربراہوں کو گلے لگنے کا حکم دیا، وہیں ابھی ابھی اس کے سامنے، یوں جیسے وہ کبھی ایک دوسرے سے نہ جھگڑے ہوں۔ ان میں سے ایک نے قدم آگے بڑھایا لیکن دوسرے نے، جو ایک تنگ پیشانی والا لحیم شحیم آدمی تھا، مزاحمت کی۔ قاضی نے اس کے منہ پر زور کا تھپڑ مارا جس کے باعث حاضرین کانپنے لگے۔ لحیم شحیم نے اس گول مٹول، برہم، چلبلے آدمی پر ایک فوری نظر ڈالی جو اس تک پہنچنے کے لیے خود کو اوپر اٹھا رہا تھا، پھر اپنا چہرہ نیچے کیا، اپنے رخسار پر ہاتھ پھیرا اور حکم بجا لایا۔

اس جماعت کو رخصت کر کے ابو طالب نے اپنے رضا کاروں کو قریب آنے کا اشارہ کیا۔ انھوں نے جلدی جلدی اپنی روداد پیش کی اور سوالوں کا جواب دیا، اور بتانا پڑا کہ انھوں نے اتنے بڑے مجمع کو سڑک پر جمع ہونے ہی کیوں دیا۔ پھر زخمی چہرہ کی باری آئی کہ اپنا بیان دے۔ وہ قاضی کی طرف جھکا جو لگتا تھا جیسے ایک زمانے سے اس سے واقف ہو، اور بڑی جوشیلی خود کلامی شروع کر دی۔ ابو طاہر اپنے احساسات ظاہر کیے بغیر بڑے غور سے سنتا رہا۔ پھر، کچھ دیر غور کرنے کے بعد، حکم دیا، ''مجمع سے منتشر ہو جانے کے لیے کہو۔ ہر آدمی سے کہو کہ کوتاہ ترین راہ سے گھر واپس جائے اور،'' حملہ آوروں سے مخاطب ہو کر، ''تم سب بھی گھر واپس جاؤ۔ کل سے پہلے کوئی فیصلہ نہیں ہوگا۔ مدعا علیہ رات یہیں ٹھہرے گا اور صرف میرے آدمی، کوئی دوسرا نہیں، اس کی رکھوالی کریں گے۔''

اس پر متعجب کہ اسے یوں چٹ پٹ رفو چکر ہو جانے کے لیے کہا جا رہا تھا، زخمی چہرہ نے مِن مِنا کر احتجاج کرنا چاہا لیکن پھر اصرار نہ کرنے ہی میں بہتری سمجھی۔ دانائی کے ساتھ اس نے اپنے لبادے کا پلّو سمیٹا اور احتراماً کمر جھکا کر الٹے قدم پلٹ گیا۔

جب ابو طاہر عمر کے ساتھ تنہا رہ گیا، شاہدین میں اس کے محرم و معتمد ہی باقی بچ رہے، تو اس نے خوش آمدید کا ایک پراسرار فقرہ ادا کیا، ''مشہور و معروف عمر خیامِ نیشاپوری کا خیر مقدم کرنا میرے لیے باعثِ صد احترام ہے۔''

اس کے فقرے سے کسی بھی جذبے کے شائبے کی غمازی بھی نہیں ہو رہی تھی۔ اس میں نہ طنز کی چبھن تھی نہ کوئی گرم جوشی۔ اس کا لہجہ بالکل غیر جانبدارانہ تھا اور آواز سپاٹ۔ وہ ایک لالہ شکل دستار پہنے ہوئے تھا، بھویں

گنجان تھیں اور بے مونچھوں کی سفید داڑھی تھی، اور وہ خیام کو طویل، برماتی نظر سے دیکھ رہا تھا۔

سب سے زیادہ الجھن میں ڈالنے والی بات تو خیر مقدم تھا کیونکہ عمر وہاں ان چیتھڑوں میں کوئی گھنٹہ بھر سے کھڑا تھا، کہ سب دیکھ سکیں اور اس پر خندہ زن ہو سکیں۔

خاموشی کے کئی بڑی مہارت سے حساب لگائے ہوئے لمحوں کے بعد ابو طاہر نے یہ اضافہ کیا، ''عمر، تم سمرقند میں ناآشنا نہیں ہو۔ کم عمری کے باوجود، تمھارے علم و فضل کے پہلے ہی یہاں چرچے ہیں، اور مدرسوں میں تمھارے گُن گائے جاتے ہیں۔ کیا یہ سچ نہیں کے تم نے اصفہان میں ابن سینا کا ایک ادق رسالہ سات بار پڑھا، اور نیشاپور لوٹنے پر حرف بہ حرف حافظے سے دہرا دیا؟''

خیام کو یہ بات بے حد باعثِ تسکینِ نفس معلوم ہوئی کہ وہ مستند کارنامہ لوگوں کو ماوراءالنہر (طبرستان) معلوم تھا، لیکن اس کی فکروں میں ہنوز کوئی کمی نہیں ہوئی۔ شافعی مذہب کے قاضی کے منھ سے ابن سینا کا حوالہ کوئی بہت قابلِ اطمینان بات نہیں تھی، پھر یہ بھی کہ ہنوز اسے بیٹھنے کی دعوت نہیں دی گئی تھی۔ ابو طاہر نے کلام جاری رکھا ''یہ صرف تمھارے کارنامے ہی نہیں جو زبان زدِ خاص و عام ہیں بلکہ چند عجیب و غریب رباعیاں بھی تم سے منسوب کی جا رہی ہیں۔''

فقرہ کسی جذبے سے عاری تھا۔ وہ اس پر تہمت نہیں دھر رہا تھا، لیکن وہ اسے بری الذمہ بھی قرار نہیں دے رہا تھا— وہ تو صرف و محض اس سے کنایتاً ایک سوال کر رہا تھا۔ عمر نے اپنی خاموشی کو توڑنے کی کوشش کی۔ ''وہ رباعی جو زخمی چہرہ سنا رہا تھا میری رباعیوں میں سے نہیں۔''

قاضی نے اس احتجاج کو بےصبری سے رد کر دیا، اور پہلی بار اس کے لہجے میں سختی آ گئی۔ ''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کے تم نے یہ بیت کہا ہے یا وہ بیت۔ مجھے اتنے فحش شعروں کی خبر ملی ہے کہ میں انھیں سن کر خود کو اتنا ہی مجرم گردانوں گا جتنا وہ شخص جس نے انھیں شائع کیا ہے۔ میں تم پر کوئی سزا لاگو کرنے کی کوشش نہیں کر رہا ہوں۔ لیکن یہ کیمیا گری کے اتہامات، تو انھیں ایک کان میں ڈال کر دوسرے کان سے باہر نہیں نکالا جا سکتا۔ ہم اس وقت تنہا ہیں۔ ہم دو اصحابِ فضیلت ہیں اور میں صرف سچ کا طلب گار ہوں۔''

عمر کو اس سے بالکل بھی تسلّی نہیں ہوئی۔ اسے ایک دام کا احساس ہوا اور اس نے جواب دینے میں تأمل کیا۔ وہ اپنے کو بہ خوبی دیکھ سکتا تھا کہ جلاّد کے سپرد کیا جا رہا ہے، تاکہ ہاتھ پاؤں برید کر دیے جائیں، آختہ کر دیا جائے یا سولی چڑھا دیا جائے۔ ابو طاہر نے آواز بلند کی اور تقریباً چلا کر کہا، ''عمر، ولد ابراہیم، خیمہ سازِ نیشاپور، کیا تم ایک دوست کو پہچاننے سے عاجز ہو؟''

اس کے لہجے کے خلوص نے خیام کے اوسان خطا کر دیے۔ ''ایک دوست کو پہچاننے سے؟'' اس نے موضوع پر خوب غور و خوض کیا، قاضی کے چہرے کا گہرا مشاہدہ کیا، اس انداز پر متوجہ ہوا جس میں وہ دانت باہر کیے ہنس رہا تھا اور اس کی داڑھی مرتعش تھی۔ آہستہ آہستہ اس نے اپنے کو قائل ہو جانے دیا۔ اس کے چہرے کا تناؤ ڈھیلا پڑ گیا۔ اس نے خود کو پہرے داروں کی گرفت سے آزاد کیا جنھوں نے، قاضی کا اشارہ پا کر، اسے باز رکھنے

کی کوشش نہیں کی۔ پھر بغیر دعوت دیے وہ بیٹھ گیا۔ قاضی دوستانہ انداز میں مسکرایا لیکن کسی تاخیر کے بغیر پھر جرح شروع کر دی۔ ''کیا تم وہ کافر ہو جس کا بعض لوگ تمھارے باب میں دعویٰ کرتے ہیں؟''

یہ سوال سے زیادہ ہی کچھ تھا۔ یہ ابتلا کی وہ پکار تھی جسے عمر نظر انداز نہیں کر سکا۔ ''مجھے پارساؤں کے جوش و خروش سے نفرت ہے، لیکن میں نے کبھی یہ نہیں کہا کہ 'ایک' دو ہے۔''

''کیا کبھی ایسا سوچا ہے؟''

''کبھی نہیں، اور خدا میرا شاہد ہے۔''

''جہاں تک میرا تعلق ہے، یہ میرے لیے کافی ہے، اور میرا خیال ہے کہ خالق کے لیے بھی۔ لیکن عوام الناس کے لیے بھلا کہاں۔ وہ تمھارے الفاظ پر نظر رکھتے ہیں، تمھاری ادنیٰ ترین حرکات پر — خود میرے افعال و حرکات پر بھی، امرا کے الفاظ اور اشاروں تک پر۔ تم یہ کہتے ہوئے سنے گئے ہو، 'میں کبھی کبھی ایسی مسجدوں میں جاتا ہوں جہاں جھپکی لینے کے لیے چھاؤں اچھی ہوتی ہے۔'''

''عبادت گاہ میں صرف وہی آدمی سو سکتا ہے جو اپنے خالق سے راضی خوشی ہو۔''

قاضی کی خشم گینی اور اس میں بھرے شک کے باوجود عمر جوش میں آ گیا اور اپنا بیان جاری رکھا، ''میں ان میں سے نہیں جن کے لیے دین محض یوم الحساب کا خوف ہے۔ میری عبادت کا کیا ڈھنگ ہے؟ میں ایک گلاب کا بہ نظرِ غائر مشاہدہ کرتا ہوں، میں اختر شماری کرتا ہوں، میں کائنات کے حسن پر تعجب کرتا ہوں اور اس پر کہ یہ کس قدر منظّم ہے، انسان پر، جو خالق کی حسین ترین صنعت ہے، انسان کے دماغ پر جو علم کا پیاسا ہے، اس کے دل پر جو محبت کا بھوکا ہے، اس کے حواس پر، چاہے یہ بیدار ہوں یا آسودہ۔''

فکر مند آنکھوں کے ساتھ قاضی اٹھا اور آ کر خیام کے برابر بیٹھ گیا، پھر پدرانہ شفقت سے ہاتھ اس کے کندھے پر رکھ دیا۔ محافظوں نے ایک دوسرے کی طرف گم سُم نگاہوں سے دیکھا۔

''میرے نوجوان رفیق، سنو۔ قادرِ مطلق نے تمھیں ان نایاب چیزوں سے نوازا ہے جو کسی ابنِ آدم کو میسّر ہوں — ذہانت، قادر الکلامی، صحت، وجاہت، طلبِ علم اور حرصِ حیات، مردوں کی ستائش اور، میں سمجھتا ہوں، عورتوں کی آرزومندی آہیں۔ مجھے امید ہے کہ اُس نے خاموشی کی دانائی سے بھی تمھیں محروم نہیں رکھا ہوگا، جس کے بغیر، سابق الذکر میں سے کسی کی بھی قدر دانی ہو سکتی ہے نہ اسے قائم رکھا جا سکتا ہے۔''

''تو کیا جو میں سوچتا ہوں اس کے اظہار کے لیے اپنے پیر فرتوت ہو جانے کا انتظار کروں؟''

''قبل اس کے کہ وہ سب جو تم سوچتے ہو اس کا اظہار کر سکو، تمھارے بچوں کے بچوں کے بچے بوڑھے ہو چکے ہوں گے۔ ہم رازوں اور خوف کے عہد میں زندگی کر رہے ہیں۔ تمھارے لیے ضروری ہے کہ تمھارے دو چہرے ہوں۔ ایک کا رخ عوام الناس کی طرف کرو، دوسرے کو اپنے اور اپنے خالق کے لیے رکھو۔ اگر تم اپنی آنکھوں، کانوں اور زبان کی سلامتی چاہتے ہو تو بھول جاؤ کہ تم ان کے مالک ہو۔''

قاضی اچانک خاموش ہو گیا، لیکن اس لیے نہیں کہ عمر کو بولنے دے، بلکہ اپنی تنبیہ کو زیادہ مؤثر بنانے کے لیے۔ عمر نے اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور منتظر رہا کہ دیکھیں قاضی اور کیا کیا خیالات اپنے سر سے برآمد کرتا ہے۔

اس کے برخلاف ابو طاہر نے ایک گہری سانس لی اور اپنے آدمیوں کو بڑی کراری آواز میں رخصت ہونے کا حکم دیا۔ جوں ہی انھوں نے اپنے پیچھے دروازہ بند کیا، وہ دیوان کے کونے کی طرف آیا، مشجّر کپڑے (ٹیپسٹری) کا ایک حصہ اوپر اٹھایا اور دمشقی نقاشی کا ایک ڈبا کھولا۔ اس نے ایک کتاب نکال کر عمر کو ایسے رسمی تپاک سے پیش کی جسے پدرانہ تبسم نے گداز کر دیا تھا۔

تو یہ کتاب بالکل وہی تھی جسے میں، بنجامن او۔ لیسیج، ایک دن خود اپنے ہاتھوں میں لینے والا تھا۔ میرا خیال ہے اپنے ناہموار و دبیز چرم سمیت —— جس کے نقوش کسی طاؤس کی دم جیسے لگ رہے تھے —— اور اپنے اوراق کے ساتھ —— جن کے کنارے ناہموار اور خستہ تھے —— اس کا لمس بالکل ویسا ہی رہا ہوگا۔ جب خیام نے گرما کی اُس ناقابلِ فراموش شب کو اسے کھولا ہوگا تو اسے صرف دو سو چھپن کورے صفحے ہی نظر آئے ہوں گے جو ابھی اشعار، تصاویر، حاشیاتی تفاسیر یا طلاکاری سے پُر نہیں ہوئے تھے۔

اپنے جذبات کو مخفی رکھنے کی خاطر ابو طاہر کسی فروش کار کے لہجے میں بولا۔

''چینی کاغذ کی ہے، نفیس ترین کاغذ جو سمرقند کی کارگاہوں میں کبھی تیار ہوا ہو۔ ماترید علاقے کے ایک یہودی نے اس اسے ایک قدیم نسخے کے مطابق فرمائشی بنایا ہے۔ یہ کل کا کل توت سے بنا ہے۔ ذرا چھو کر تو دیکھو۔ اس میں وہی صفات ہیں جو ریشم میں ہوتی ہیں۔''

کلام جاری رکھنے سے پہلے اس نے کھانس کر گلا صاف کیا۔

''میرا ایک بھائی ہوا کرتا تھا، مجھ سے دس سال بڑا۔ جب وہ تمھاری سی عمر کا تھا، اس کی وفات ہوگئی۔ اسے ایک نظم کہنے پر، جس سے حکمرانِ وقت ناراض ہو گیا تھا، بلخ جلاوطن کر دیا گیا تھا۔ اس پر بدعقیدگی بھڑکانے کا الزام عائد کیا گیا تھا۔ یہ بات درست تھی یا نہیں، یہ مجھے نہیں معلوم، لیکن میں ضرور آزردہ ہوں کہ اس نے محض ایک نظم کے پیچھے اپنی جان گنوا دی، ایک بدبخت نظم جو بہ مشکل ایک دوبیتی جتنی دراز ہوگی۔''

اس کی آواز لرزنے لگی، اور وہ بے دم بولے گیا۔

''اس کتاب کو اپنے پاس رکھو۔ جب کبھی کوئی شعر تمھارے دماغ میں متشکل ہونے لگے، یا تمھاری نوکِ زبان تک آ جائے، اسے روکے رکھو۔ ان اوراق پر اسے نقل کر لو، اور جب نقل کر رہے ہو، ابو طاہر کو یاد کر لینا۔''

کیا قاضی کو معلوم تھا کہ اس اشارے اور ان الفاظ کے ساتھ وہ تاریخِ ادب میں ایک سب سے زیادہ مخفی راز کو جنم دے رہا ہے، کہ عمر خیام کی پرشکوہ شاعری کو دریافت کرنے کے لیے عالم کو پوری آٹھ صدیاں انتظار کرنا ہوگا، کہ ''رباعیات'' کی دنیا کے سب سے زیادہ طبعزاد کارناموں میں سے ایک ہونے کی حیثیت سے تکریم ہوگی، اس سے بھی پہلے کہ سمرقندی مخطوطے کی عجیب قسمت کا حال دریافت ہو؟

باب۳

اس رات عمر نے ایک منظرے میں، جو ابو طاہر کے بڑے کشادہ باغ کے وسط میں ٹیلے پر تعمیر کیا گیا ایک چوبی مقصورہ تھا، کچھ سو لینے کی بے سود کوشش کی۔ اس کے قریب ہی ایک پستہ سی میز پر پَر کا قلم اور دوات پڑی تھی، ایک چراغ جسے ابھی روشن نہیں کیا گیا تھا، اور اس کی کتاب — پہلے صفحے پر کھلی ہوئی جو ابھی تک کورا تھا۔

صبحِ کاذب کے دھندلکے میں ایک سایہ سا تیر گیا۔ ایک خوب صورت کنیز رکابی میں خربوزے کی قاشیں اس کے لیے لائی، لباس کا ایک نیا جوڑا اور اس کی دستار کے لیے زَندان کے ریشم کا گھماؤ پارچہ۔ اس نے سرگوشی میں ایک پیغام دیا۔

''آقا نمازِ فجر کے بعد آپ کا انتظار کریں گے۔''

کمرا پہلے ہی سے مدّعیوں، حاجت مندوں، درباریوں، رفقا اور بھانت بھانت کے ملاقاتیوں سے بھرا تھا۔ ان میں زخمی چہرہ بھی شامل تھا جو یقیناً سن گن لینے وہاں پہنچا تھا۔ عمر کے دروازے سے داخل ہوتے ہی قاضی کی آواز نے ہر کس کی نظر اور تبصرے کا رخ اس کی جانب موڑ دیا۔

''امام عمر خیام کو خوش آمدید، جس کا حدیثِ نبوی کے علم میں کوئی ہم سر نہیں، ایک مرجع جس میں کسی کو کلام نہیں، ایک آواز جس کی کوئی تردید نہیں ہو سکتی۔''

حاضرین یکے بعد دیگرے کھڑے ہو گئے، تکریم سے جھکے اور پھر بیٹھنے سے پہلے دبی زبان سے کوئی فقرہ ادا کیا۔ عمر نے اپنی آنکھ کے گوشے سے زخمی چہرہ کا جائزہ لیا جو اپنے کونے میں بھیگی بلّی بنا بیٹھا تھا، اس کے باوجود اس کا چہرہ خفیف سا شکن آلود بھی تھا۔

ابو طاہر نے بے حد رسمی انداز میں عمر کو اپنی دائیں طرف آ بیٹھنے کی دعوت دی، اور اپنے پاس جو لوگ بیٹھے ہوئے تھے انھیں بڑے ظاہری طور پر وہاں سے رخصت کیا۔ اس کے بعد اس نے سلسلۂ کلام جاری رکھا، ''ہمارے بلند مرتبت مہمان کو کل شام ایک حادثہ پیش آیا۔ یہ آدمی جس کی خراسان، فارس اور مازندران میں عزّت ہوتی ہے، جس کی پذیرائی کا خواہش مند ہر شہر ہے اور جسے ہر امیر اپنے دربار سے وابستہ کرنے کا حریص، تو اس آدمی پر کل سمرقند کی سڑکوں پر دست اندازی کی گئی۔''

لوگوں نے اس پر دم بہ خود رہ جانے کا اظہار کیا، اس کے بعد افراتفری سی مچ گئی جسے قاضی نے کسی قدر فزوں ہونے دیا اور پھر کہیں جا کر اسے تھمنے کا اشارہ کیا، اور کلام جاری رکھا۔

''اس سے بدتر یہ کہ بازار میں تقریباً بلوا ہو گیا۔ بلوا اور وہ بھی ہمارے باعثِ تکریم حکمراں، نصر خان، شمس الملک، کی آمد سے ایک دن پہلے، جو انشاءاللہ! ٹھیک آج صبح ہی بخارا سے آنے والا ہے۔ اگر ہجوم پر قابو پا کر اسے منتشر نہ کر دیا گیا ہوتا تو میں تصوّر بھی نہیں کر سکتا کہ آج ہم کس مصیبت سے دوچار ہوتے۔ میں آپ کو خبردار کرتا

ہوں کہ کوئی سر اپنے کندھوں پر مطمئن نہ ہوتا!''

اس نے سانس لینے کے لیے توقّف کیا، اور اس لیے بھی کہ بات لوگوں کے دلوں میں اتر جائے، خوف حاضرین کے دلوں میں اپنا کام کر سکے۔

''خوش قسمتی سے میرے ایک پرانے تلمیذ نے، جو اس وقت یہاں موجود ہے، عالی مرتبت مہمان کو پہچان لیا اور مجھے آ کر خبر کر دی۔''

اس نے زخمی چہرہ کی طرف انگلی سے اشارہ کیا اور اسے کھڑے ہونے کی دعوت دی۔

''تم نے امام عمر کو کیسے پہچان لیا؟''

اس نے چند لفظ جواب میں بڑبڑا دیے۔

''ذرا زور سے بولو! یہ ہمارے عمر رسیدہ عم تمھاری بات سن نہیں پا رہے ہیں!'' قاضی نے اپنی بائیں طرف ایک سفید ریش کہن سالہ فرد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے چلا کر کہا۔

''میں بلند مرتبت مہمان کو ان کی قادرالکلامی کے باعث پہچان گیا'' زخمی چہرہ بہ مشکل ہی یہ الفاظ منہ سے نکال سکا۔ ''اور میں نے انھیں قاضی کے پاس لانے سے پہلے ان کی شناخت کی بابت پوچھا۔''

''خوب کیا۔ اگر فساد جاری رہتا تو خوں ریزی ہو سکتی تھی۔ تم اس کے حق دار ہو کہ یہاں آ کر ہمارے مہمان کے برابر بیٹھو۔''

جب زخمی چہرہ جھوٹ موٹ کی اطاعت گزاری کی ادا سے قریب آنے لگا تو ابو طاہر نے عمر کے کان میں کہا، ''چاہے تمھارا دوست نہ بھی بنے، لیکن اب یہ تمھیں عوام الناس کے سامنے لتاڑے گا بھی نہیں۔''

وہ بلند آواز میں بولے گیا، ''کیا میں امید کر سکتا ہوں کہ جو کچھ ان پر گزری ہے اس کے باوجود، خواجہ عمر سمرقند سے بری یادلے کر نہیں جائیں گے؟''

''کل شام کا واقعہ میں پہلے ہی بھول بھال چکا ہوں'' خیام نے جواب دیا۔ ''مستقبل میں مَیں جب بھی اس شہر کو یاد کروں گا تو ایک بالکل ہی مختلف تصویر ذہن میں آئے گی، ایک بے حد نفیس انسان کی تصویر۔ میں ابو طاہر کا ذکر نہیں کر رہا ہوں۔ اعلیٰ ترین ستائش جو کسی قاضی کو پیش کی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ اس کے اوصاف کی مدح آرائی نہ کی جائے بلکہ ان لوگوں کی دیانت داری کی جو اُس کی ذمّے داری ہیں۔ اسے اتّفاق کہہ لیجیے، جس دن میں یہاں وارد ہوا تو میرا خچّر بابِ کش کو جانے والی آخری چڑھائی سے جدوجہد کر رہا تھا، اور خود میں نے ابھی بہ مشکل ہی اپنے قدم زمین پر رکھے تھے کہ ایک آدمی نے مجھے مخاطب کیا۔

'''اس شہر میں آنا مبارک ہو،' وہ بولا۔ 'کیا یہاں آپ کے کوئی خاندان والے یا دوست احباب ہیں؟'

''اس ڈر سے کہ یہ کہیں کوئی چلتا پرزہ یا کم از کم کوئی بھکاری یا ناگوار آدمی نہ ہو، میں نے بغیر رکے ہوئے جواب دیا کہ نہیں، لیکن وہ آدمی بولے گیا:

'''میرے اصرار پر شک وشبہ نہ کریں، مہمانِ شریف۔ یہ تو میرے آقا کا حکم ہے کہ یہاں ہر آنے والے

کا انتظار کروں اور تمام آ نکلنے والے مسافروں کو مہمان نوازی پیش کروں۔'

''یہ آدمی واجبی حیثیت کا نظر آتا تھا، لیکن صاف ستھرے کپڑے پہنے ہوئے تھا اور عزّت داروں کے آداب سے ناواقف نہیں تھا۔ میں اس کے پیچھے ہولیا۔ کچھ دور کے بعد وہ مجھے ایک بھاری دروازے سے اندر لایا اور ایک مسقّف راہداری عبور کر کے میں کسی کارواں سرائے کے صحن میں آ گیا جس کے وسط میں ایک کنواں تھا اور مرد وزن اِدھر اُدھر چہل پہل کر رہے تھے۔ کناروں پر، اوپر اور نیچے کی منزلوں میں مسافروں کے لیے کمرے تھے۔ آدمی نے کہا، 'جب تک جی چاہے یہاں قیام فرمائیں، چاہے ایک رات یا پورا موسم۔ آپ کو فراش، طعام اور اپنے خچّر کے لیے چارہ مہیّا ملے گا۔'

''جب میں نے پوچھا کہ میرے ذمّے کتنی رقم واجب الادا ہے تو یہ بات اسے ناگوار گزری۔

'''آپ میرے آقا کے مہمان ہیں۔'

'''اچھا تو بتاؤ کہ میرے فیّاض میزبان کہاں ہیں تاکہ ان کا شکریہ ادا کر سکوں۔'

'''میرے آقا کا سات سال پہلے انتقال ہو گیا ہے۔ وہ میرے پاس ایک رقم چھوڑ گئے ہیں تاکہ سمرقند کی ہر زیارت کرنے والے کی تعظیم و تکریم پر خرچ کروں۔'

'''تمھارے آقا کا کیا نام ہے؟ بتاؤ تاکہ دوسروں سے ان کی مہربانیوں کا ذکر تو کر سکوں۔'

'''آپ کو صرف قادرِ مطلق کا شکریہ ادا کرنا چاہیے۔ اسے خوب علم ہے کہ اس کے توسّط سے کس کی مہربانیاں پوری ہو رہی ہیں۔'

''تو یوں میں کئی دن اس آدمی کے پاس رہا۔ میں باہر گھومتا گھامتا، لیکن جب بھی واپس آتا مجھے ایک سے بڑھ کر ایک لذیز کھانوں کے انبار لگے ملتے اور میرے خچّر کی نگہداشت اس سے بہتر ہو رہی تھی جو میں کر سکتا تھا۔''

عمر نے کسی ردِعمل کی امید میں اپنے حاضرین پر نظر ڈالی لیکن اس کی کہانی سے نہ کسی آنکھ میں تعجب ابھرا نہ ہی کسی اسرار نے راہ پائی۔ قاضی نے عمر کی الجھن دیکھ کر وضاحت کی۔

''بہتیرے شہر یہی سوچنا پسند کرتے ہیں کہ تمام عالمِ اسلام میں وہی سب سے زیادہ مہمان نواز ہیں، لیکن صرف اہالیانِ سمرقند ہی اس اعزاز کے مستحق ہیں۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے، یہاں کسی مسافر کو اپنے قیام یا طعام کی قیمت ادا نہیں کرنی پڑی ہے۔ مجھے جانے کتنے ایسے خانوادوں کا علم ہے جو یہاں آنے والوں یا حاجت مندوں کی مہمان نوازی میں اپنا سب کچھ لٹا کر برباد ہو گئے ہیں، لیکن تم کبھی بھی انھیں اس کی شیخی مارتے ہوئے نہیں سنو گے۔ کاشی، تانبے اور چینی مٹّی کے بنے ہوئے جو فوارے تم ہر سڑک کے نکڑ پر دیکھتے ہو، شہر میں جن کی تعداد دو ہزار سے زیادہ ہے، جن کا شیریں پانی ہر راہ گیر کی پیاس بجھانے کے لیے ہے، تو یہ سب کے سب سمرقند کے باشندوں ہی نے مہیّا کیے ہیں۔ لیکن کیا تمھیں کسی ایک آدمی کے نام کا کتبہ بھی ان پر نظر آتا ہے جو اپنی حمد و ثنا کرانے کا خواہاں ہو؟''

''مجھے اعتراف ہے کہ ایسی فیّاضی مجھے کہیں نظر نہیں آئی ہے۔ کیا آپ مجھے ایک سوال پوچھنے کی اجازت دیں گے جو مجھے پریشان کر رہا ہے؟''

قاضی نے لفظ اس کے منھ سے اچک لیے، ''مجھے معلوم ہے تم کیا پوچھنا چاہتے ہو: یہی نا کہ وہ لوگ جو مہمان نوازی کے وصف کا اتنا مان کرتے ہیں انھوں نے تم جیسے مسافر کے ساتھ اتنے تردّد کا مظاہرہ کیسے کیا؟''

''یا جابرِ لاغر جیسے بے چارے بڈھے کے ساتھ؟''

''جو جواب میں تمھیں دینے والا ہوں اس کا خلاصہ ایک لفظ میں کیا جا سکتا ہے— خوف۔ ہمارے دین پر ہر طرف سے حملے ہو رہے ہیں: بحرین میں قرامطہ، قم کے امامی، بہتّر فرقے، قسطنطنیہ میں رومی، بھانت بھانت کے کفّار، اور سب سے بڑھ کر مصر کے اسماعیلی جن کے متّبعین کی بڑی بھاری تعداد ٹھیک بغداد کے قلب میں موجود ہے اور خود یہاں سمرقند میں بھی۔ یہ مت بھولو کہ ہمارے اسلامی شہر — مکہ، مدینہ، اصفہان، بغداد، دمشق، بخارا، مَرو، قاہرہ، سمرقند— تو ان کی حقیقت نخلستانوں سے زیادہ نہیں اور اگر ایک لمحے بھی ان سے غفلت برتی جائے تو واپس ریگستان میں بدل جائیں گے۔ یہ ہمیشہ ہی ریتیلی آندھیوں کے رحم وکرم پر رہے ہیں!''

اپنی بائیں طرف کے جھروکے سے قاضی نے بڑی مہارت کے ساتھ گزرانِ آفتاب کا قیاس کیا اور کھڑا ہو گیا۔

''حکمراں سے جا کر ملنے کا وقت ہو گیا ہے،'' وہ بولا۔

اس نے ہاتھ سے تالی بجائی۔

''ہمارے لیے کچھ زادِ راہ مہیّا کرو۔''

یہ اس کی عادت تھی کہ راستے میں چبانے کے لیے اپنے ساتھ کشمش رکھ لیتا تھا، ایک عادت جس کی نقّالی اس کے مقرّبین اور اس کے ملاقاتی دونوں ہی کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی جو تانبے کی بڑی سی سینی اس کے پاس لائی گئی جس پر اس زردی مائل نعمت کا بڑا اونچا سا ڈھیر لگا تھا تا کہ ہر متنفس اس سے اپنی جیبیں اچھی طرح بھر لے۔

جب زخمی چہرہ کی باری آئی، تو اس نے چھوٹی سی مٹھی بھر کشمشیں اٹھا کر خیام کی طرف یہ کہتے ہوئے بڑھائیں، ''میرا خیال ہے تم چاہو گے کہ میں یہ تمھیں شراب کے عوض پیش کروں۔''

گو اس نے یہ بات بلند آواز سے نہیں کہی تھی، لیکن جیسے کسی سحر کے نتیجے میں ہر متنفس بالکل بت بن گیا۔ ہر شخص دم بہ خود کھڑا عمر کے لبوں کو دیکھتا رہا۔

عمر نے جواباً کہا، ''جب کوئی شراب پینا چاہتا ہے تو بڑی احتیاط سے اپنے ساقی اور ندیموں کا انتخاب کرتا ہے۔''

زخمی چہرہ کی آواز کچھ بلند ہو گئی۔

''جہاں تک میرا تعلق ہے، تو میں ایک قطرہ بھی چھونے والا نہیں۔ میں تو جنت الفردوس میں جگہ پانے کا آرزومند ہوں۔ لگتا ہے تم وہاں میری رفاقت کے متمنّی نہیں۔''

''ایک پوری ابدیّت، اور وہ بھی ثقہ علما کی رفاقت میں؟ نہیں صاحب، شکریہ۔ خدا نے تو ہم سے کسی اور چیز کا وعدہ کیا ہے۔''

یہ تبادلہ وہیں رک گیا۔ عمر سرعت سے قاضی کی طرف چل دیا جو اسے بلا رہا تھا۔

''یہ ضروری ہے کہ شہر والے تمھیں میرے برابر برابر سوار دیکھیں۔ اس سے ان کا کل شام کا تاثر زائل ہو جائے گا۔''

رہائش گاہ کے گرد مجتمع ہجوم میں عمر کو یوں لگا جیسے اسے ایک ناشپاتی کے درخت کے سایے میں کوئی بادام فروش نظر آ رہی ہو۔ اس نے رفتار سست کر دی اور اس کی تلاش میں اِدھر اُدھر نظر دوڑائی، لیکن ابوطاہر نے اسے چھیڑا۔

''اور تیز چلو۔ اگر خان ہمارے پہنچنے سے پہلے ہی پہنچ گیا تو تمھاری شامت آ جائے گی۔''

باب۴

''وقت کی تخلیق سے نجومی اعلان کرتے آئے ہیں کہ چار شہر ہیں جو بغاوت کی علامت کے زیرِ سایہ وجود میں آئے ہیں۔ سمر قند، مکہ، دمشق اور پالیرمو، اوران کا قول عین صداقت ہے! اگر یہ شہر کبھی حکومت کے آگے سِپر انداز ہوئے ہیں تو صرف اس کی طاقت کے باعث۔ یہ صراطِ مستقیم کی پیروی اسی وقت کرتے ہیں جب اسے تلوار کے ذریعے بچھایا گیا ہو۔ آنحضرتؐ نے مکے کے گھمنڈ کو تلوار سے ہی کم کیا تھا، اور تلوار ہی سے میں بھی اہالیانِ سمرقند کے گھمنڈ کو کم کروں گا!''

نصر خان، والیٔ ماوراء النہر، ایک کانسی رنگ دیو جو کار چوبی کا لہراتا جبہ پہنے ہوئے تھا، اپنے تخت کے سامنے کھڑا القمہ چبار ہا تھا۔ اس کی آواز گھر والوں اور ملاقاتیوں میں لرزہ پیدا کر رہی تھی۔ اس کی آنکھیں حاضرین میں کسی شکار کو ڈھونڈ نکالتیں، ایک ہونٹ جو کپکپانے کی جرأت کر سکے، ایک نگاہ جس میں مناسب پشیمانی کی کمی ہو، کسی غدّاری کی یاد۔ جبلّی طور پر ہر کس و ناکس اپنے برابر والے کی آڑ میں سرک جاتا، اپنی پشت، گردن اور کندھوں کو ڈھیلا چھوڑ دیتا، اور طوفان کے گزر جانے کا انتظار کرتا۔

اپنے چنگل کے لیے کوئی شکار نہ پا کر ناصر خان نے ہاتھ بھر بھر کے اپنی تقریباتی قبائیں اٹھائیں اور انھیں طیش کے عالم میں ایک کے بعد ایک اپنے پیروں کے پاس پھینک کر ان کا انبار لگا دیا، اور کاشغر کی بلند آہنگ ملی جلی ترک اور منگول بولی میں ایک کے بعد ایک ہتک آمیز فقرے داغنے لگا۔ رواج کے مطابق حکمراں سہ تہی، چہار تہی اور بعض اوقات ہفت تہی کار چوبی کی عبائیں پہنتے، جنھیں دن میں بدن سے جدا کرتے اور جن کی عزّت افزائی مقصود ہوتی ان کی پشت پر بڑی تمکنت سے ڈال دیتے۔ لیکن اپنے موجودہ طرزِ عمل سے ناصر خان نے یہ واضح کر دیا تھا کہ اُس دن اپنے کسی ملاقاتی کی آرزو کو تکمیل سے شاد کرنے کی اس کی کوئی نیّت نہیں۔

جیسا کہ ہر حکمراں کی سمرقند آمد پر ہوتا تھا، اسے بھی جشن اور خوش خرّمی کا دن ہونا چاہیے تھا، لیکن اولین لمحوں ہی میں مسرت کا ہر شائبہ جیسے بجھ کر رہ گیا تھا۔ دریائے سیاب سے اوپر کو جانے والی پکّی سڑک چڑھتے ہی خان شہر کے شمال میں بابِ بخارا سے متانت کے ساتھ داخل ہوا۔ وہ کھل کر مسکرایا، جس سے اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں اور بھی اندر کو دھنسی نظر آنے لگیں، اور ہمیشہ سے زیادہ ترچھی، جس کی وجہ سے اس کے رخساروں کی ہڈیاں آفتاب کے عنبریں انعکاس میں چمکنے لگیں۔ لیکن بھر یک بارگی اس کے ساری شگفتگی رخصت ہوگئی۔ وہ کوئی دوسو کے لگ بھگ امرا کی طرف بڑھا جو قاضی ابوطاہر کے گرد جمع تھے، اور اس گروہ پر جس کے درمیان عمر خیام بھی تھا ایک مضطرب اور تقریباً شک بھری نظر گاڑ دی۔ بہ ظاہر جن کا طلب گار تھا انھیں نہ پا کر، اس نے یک لخت اپنے گھوڑے کو الف کیا، لگام کو زور سے کھٹکا اور نا قابلِ سماعت طور پر کچھ غرّاتے ہوئے وہاں سے دور ہو جانے کے لیے حرکت کی۔ اپنی کالی گھوڑی پر اکڑے ہوئے براجمان وہ اب اور نہیں مسکرا رہا تھا، اور نہ ادنیٰ سے اشارے سے ان ہزار ہا شہریوں کے

مکر رنعرۂ تحسین کا جواب دے رہا تھا جو اس کی پذیرائی کے لیے جمع ہو رہے تھے، اور بعض تو منھ اندھیرے سے۔ ان میں سے کچھ نے عرض داشتیں اٹھائی ہوئی تھیں، جنھیں عوامی منشیوں نے رقم کیا تھا۔ بے سود ہی کیونکہ کسی کی بھی اپنی عرض داشت حکمران کو پیش کرنے کی جرات نہیں ہوئی، بلکہ یہ انھوں نے حاجب کے حوالے کیں جسے ان اوراق کو قبول کرنے کے لیے بار بار آگے کو جھکنا پڑا، اس مبہم وعدے کے ساتھ کہ ان پر عمل درآمد ہوگا۔

آگے آگے چار گھڑسوار، جو دو دمان کا کتھئی علم بلند کیے ہوئے تھے، پیچھے پیچھے ایک کمر تک ننگا پاپیادہ غلام جو ایک دیو ہیکل دھوپ چھتری اٹھائے ہوئے تھا، خان نے بغیر کہیں توقف کیے کشادہ شاہراہیں طے کیں جن کے دورویہ توت کے بل کھاتے ہوئے درختوں کی قطار لگی تھی۔ اس نے بازاروں سے اجتناب کیا اور آبپاشی کی بڑی نہروں کے سہارے سہارے چلا جنھیں اریق کہا جاتا ہے، تا آنکہ اسفیزار کے علاقے میں پہنچ گیا۔ یہاں اس نے ایک عارضی محل بنا رکھا تھا، جو ابوطاہر کی اقامت گاہ سے بالکل متصل تھا، لیکن چونکہ حالیہ جنگوں نے اسے بہت زیادہ شکستہ کر دیا تھا، اسے ترک کرنا پڑا تھا۔ اب یہاں صرف ترکی محافظ فوج وقتاً فوقتاً اپنے خیمے نصب کرتی تھی۔ [اصلی لفظ ''یرٹ'' (yurt) ہے، جو کھال یا نمدے سے بنا ہوتا ہے؛ اسے وسط ایشیا کے خانہ بدوش قبائل استعمال کرتے ہیں۔]

حکمراں کے مزاج کو بگڑا ہوا دیکھ کر عمر کو محل جا کر اپنی تہنیت پیش کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس ہوئی، لیکن قاضی نے اصرار کیا کہ ضرور جائے، یقیناً اس امید میں کہ اتنے بلند مرتبت رفیق کی موجودگی ایک خوش گوار مشغولیت فراہم کردے گی۔ راستے میں ابوطاہر نے جو ابھی ابھی پیش آیا تھا اس سے خیام کو تفصیلاً آگاہ کرنے کی ذمّے داری اپنے سر لی۔ شہر کے ممتاز دینی اشخاص نے استقبالیے کے مقاطعے کا فیصلہ کیا تھا، اس لیے کہ خان نے بخارا کی جامع مسجد کو جلا دیا تھا جہاں مسلّح مخالفین نے مورچہ قائم کر کے پناہ لی تھی۔ ''حکمراں اور مذہبی محکمے کے درمیان،'' قاضی نے وضاحتاً بتایا، ''ہمیشہ کی طرح شدید جنگ جاری ہے۔ بعض اوقات یہ کھلم کھلا اور خونین ہوتی ہے، لیکن زیادہ تر خفیہ اور اندر اندر۔''

یہ افواہ بھی سننے میں آئی تھی کہ علما نے متعدد افسروں سے رابطہ قائم کیا تھا جو امیر کے طرزِ عمل سے سخت تنگ آئے ہوئے تھے۔ کہا جاتا تھا کہ اس کے اجداد سپاہ کے ساتھ طعام تناول فرماتے تھے اور کوئی موقع یہ اعتراف کیے بغیر جانے نہیں دیتے تھے کہ ان کی طاقت کا سرچشمہ ان کی عوام کے جنگجو ہیں۔ لیکن ایک نسل سے دوسری تک ترکی خانوں نے ایرانی شہنشاہوں کی قابلِ مذمّت عادات اختیار کر لی تھیں۔ وہ خود کو نیم دیوتا گردا ننے لگے تھے، اور اپنے گرد ایسی پیچیدہ پرتکلف تقریباتی رسومات کھڑی کر لی تھیں جو ان کے افسران کے لیے ناقابلِ فہم ہی نہیں بلکہ ہتک آمیز بھی تھیں۔ چنانچہ موخر الذکر میں سے بہت سوں نے مذہبی سربراہوں سے رجوع کیا تھا۔ یہ لوگ مذہبی سربراہ افسروں کی زبانی نصر کی ہجو سن کر اور یہ کہ اس نے اسلامی طور وطریق تج دیے ہیں حظ اٹھاتے۔ فوج کے دل میں خوف ڈالنے کے لیے حکمراں علاء کے خلاف سختی سے پیش آیا۔ کیا اس کے باپ نے، جو بنا بریں ایک متّقی تھا، اپنے دورِ سلطنت کا آغاز ایک دستار پوش کا سر قلم کر کے نہیں کیا تھا؟

۱۰۷۲ کے اس سال میں ابوطاہر ان معدودِ چند مذہبی اکابر میں سے تھا جس نے کسی نہ کسی طرح امیر سے

قریبی روابط قائم کیے ہوئے تھے۔ وہ اکثر اس سے ملاقات کرنے بخارا کے قلعے میں جاتا، جو اس کی صدر رہائش گاہ تھی، اور جب بھی وہ سمرقند آتا تو اس کی بڑے پروقار انداز میں پذیرائی کرتا۔ بعض علما ابوطاہر کے مصالحانہ رویّے کو محتاط نظر سے دیکھتے لیکن بیشتر اس ثالث کی موجودگی کو مبارک بھی سمجھتے۔

قاضی کو اپنی ثالثی کا کردار ادا کرنے کا موقع دوبارہ بڑی آسانی سے مل گیا۔ اس نے نصر کی تردید کرنے سے احتراز کیا، اس کے مزاج میں بہتری کی ادنیٰ جھلک کی تاک میں رہا تاکہ اس کی پژمردہ ہمّت کو حوصلہ دے۔ وہ منتظر رہا تا آنکہ وہ صبر آزما لمحے بیت گئے، اور جب حکمراں اپنے تخت پر لوٹا اور ابوطاہر نے دیکھا کہ وہ ایک نرم گاؤ تکیے سے خوب ٹیک لگا کر بیٹھ گیا ہے، تو اس نے ایک بے حد لطیف اور غیر محسوس بازیافت کے ساتھ قابو اپنے ہاتھ میں لے لیا جسے عمر نے اطمینان کے ساتھ دیکھا۔ قاضی کا اشارہ پا کر حاجب ایک نوخیز کنیز کو بلا لایا کہ وہ ان عباؤں کو اٹھالے جو کسی جنگ کے بعد لاشوں کی طرح زمین پر چھوڑ دی گئی تھیں۔ فوراً ہی فضا کی گھٹن قدرے کم ہو گئی، لوگوں نے سنبھل سنبھل کر اپنے باز وسیدھے کیے اور بعضوں نے تو اپنے سے قریبی کان میں کچھ کھسر پھسر بھی۔

پھر قاضی نے کمرے کے وسط میں جو جگہ تھی اس کی طرف قدم بڑھائے، شاہ کے سامنے نشست سنبھالی، سر جھکا لیا، اور کچھ کہا نہیں۔ یہ داؤں اتنی مہارت سے لگایا گیا تھا کہ ایک طویل خاموشی کے بعد، جب نصر نے بالآخر اعلان کیا، ''جاؤ جا کر شہر کے سارے علما سے کہو کہ کل فجر کے وقت آ کر میرے قدموں میں سر جھکائیں۔ جو سر نہیں جھکے گا قلم کر دیا جائے گا، سو کوئی بھی فرار ہونے کی کوشش نہ کرے، کیونکہ کوئی زمین بھی اسے میرے قہر سے امان نہیں دے سکتی،'' تو ہر فرد و بشر سمجھ گیا کہ طوفان فرو ہو چکا ہے اور تصفیے کی امید کی جا سکتی ہے۔ علمائے دین کو بس تلافی کرنے کی حاجت ہے اور شاہ شدید اقدامات کرنے سے باز رہے گا۔

اگلے دن جب عمر پھر قاضی کے ہم راہ دربار گیا تو فضا مشکل سے پہچاننے میں آتی تھی۔ نصر اپنے تخت پر براجمان تھا، جو ایک طرح کا اونچا سا چبوترہ تھا جس پر کسی گہرے رنگ کے قالین کا غلاف پڑا تھا۔ اس کے برابر ایک غلام گلاب کی قند یائی ہوئی پنکھڑیوں کی سینی اٹھائے کھڑا تھا۔ حکمراں ایک پنکھڑی اٹھاتا، اپنی زبان پر رکھتا، اور تالو کے نیچے اسے تحلیل ہونے دیتا، قبل اس کے کہ لاپروائی سے ہاتھ ایک دوسرے غلام کی طرف بڑھا دے جو اس کی انگلیوں پر معطّر پانی چھڑکتا اور توجہ سے انھیں پونچھتا۔ یہ گردان کوئی بیس تیس بار دہرائی گئی، دریں اثنا وفود ایک کے بعد ایک گزرتے رہے۔ یہ شہر کے علاقوں کے نمائندے تھے، خاص طور پر اسفیزار، پنج خین، زگریماچ، ماترید، بازاروں کی انجمنوں، نحّاسوں، کاغذ سازوں، ریشم کے کیڑے کی افزائش کرنے والوں اور سقّوں کی تجارتی اصناف کے، اور ان کے علاوہ ذمّی جماعتوں کے بھی: یہودی، پارسی اور نسطوری عیسائی۔

یہ پہلے فرش کو بوسہ دیتے۔ پھر سیدھے کھڑے ہو جاتے اور ایک بار اور تعظیماً جھکتے اور جھکے رہتے تا آنکہ شاہ انھیں اٹھنے کا اشارہ کرتا۔ ان کا سربراہ چند فقرے ادا کرتا اور وہ الٹے قدم لوٹ جاتے، چونکہ کمرے سے رخصت ہوتے وقت حکمراں کی طرف پیٹھ کرنا ممنوع تھا۔ ایک عجیب و غریب رسم۔ کیا یہ کسی ایسے شاہ نے رائج کی

تھی جو عزّت کروانے کا کچھ زیادہ ہی رسیا تھا، یا کسی خاص طور پر شکّی ملاقاتی نے؟

اب دینی معزّزین آئے، جن کا تجسّس سے انتظار کیا جا رہا تھا تاہم خوف و ہراس کے ساتھ بھی۔ یہ تعداد میں بیس سے زائد تھے۔ ابو طاہر کو انھیں آنے پر قائل کر لینے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی تھی۔ کیونکہ وہ اپنے جذبات کا وافی وشافی اظہار پہلے ہی کر چکے تھے، اس راہ پر مزید گامزن رہنا اپنی شہادت کو دعوت دینے کے مترادف تھا، جس کی کسی کو خواہش نہیں تھی۔

اب انھوں نے بھی خود کو تخت کے سامنے پیش کیا، ہر ایک اتنا نیچا جھکتا جتنا اس کی عمر اور جوڑ اجازت دیتے، منتظر کہ امیر اٹھنے کا اشارہ کرے۔ لیکن اشارہ ہو کر نہ دیا۔ دس منٹ گزر گئے اور ان میں سے سب سے کم عمر بھی اس غیر آرام دہ حالت میں غیر معیّنہ مدّت تک نہیں رہ سکتا تھا۔ پس چہ باید کرد؟ اگر بلا اجازت اٹھتے ہیں تو شاہ کی ملامت کا نشانہ بنتے ہیں۔ ایک کے بعد ایک وہ اپنے گھٹنوں کے بَل ٹِک گئے، ایک ایسی حالت جو اتنی ہی پر تعظیم تھی لیکن قدرے کم مضمحل کر دینے والی۔ جب تک آخری پنڈلی بھی زمین سے نہ لگ گئی حکمراں نے اٹھنے اور فوری وہاں سے روانہ ہو جانے کا اشارہ نہ کیا۔ جو پیش آ رہا تھا اس پر کسی کو بھی تعجّب نہیں ہوا۔ سو شاہی عملداری کے معاملات یہ تھے۔

اس کے بعد تر کی افسر اور معزّزین کی جماعتیں آگے بڑھے، اور کچھ دہقان بھی جو قریبی دیہاتوں کے سربراہ تھے۔ ہر ایک نے اپنے مرتبے کے مطابق حکمراں کی قدمبوسی کی یا شانہ چوما۔ پھر ایک شاعر آگے آیا اور شاہ کی عظمت پر بڑا ٹھسّے دار قصیدہ پڑھا جسے سن کر وہ ظاہرا بہت جلد ہی بے زار نظر آنے لگا۔ اس نے اشارے سے شاعر کی مدح سرائی قطع کی اور حاجب کو اشارہ کیا کہ جھک کر جو حکم اسے تفویض کیا گیا تھا سنائے۔ ''ہمارے آقا کی یہ خواہش ہے کو وہ ان شعرا کو جو یہاں مجتمع ہیں بتائیں کہ وہ ایک ہی موضوعات کی تکرار سنتے سنتے تھک گئے وہ نہ خود کو شیر سے تشبیہہ دلانا چاہتے ہیں نہ عقاب سے، اور اس سے بھی کم آفتاب سے۔ وہ جو اس کے ماسوا کہنے سے عاجز ہیں، براہ کرم تشریف لے جائیں۔''

باب ۵

حاجب کے کلام کے بعد کوئی بیس سے زائد شعرا کی دبی دبی سی آوازیں، کڑ کڑاہٹ اور پھر عام شور وغل اٹھا جو اپنی اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے۔ بعضے تو دوا لٹے قدم اٹھا کر خاموشی سے کھسک گئے۔ قطار سے صرف ایک عورت ہی نکلی اور بڑی مستحکم چال سے آگے بڑھی۔ عمر کی آنکھوں میں تجسّس کو تیرتے دیکھ کر، قاضی نے سرگوشی کی، ''بخارا کی ایک شاعرہ ہے۔ اپنے کو 'جہان' کہلواتی ہے، یعنی کہ عالمِ کل۔ یہ ایک متلوّن مزاج نوعمر بیوہ ہے۔''

اس کے لہجے میں ملامت کا رنگ تھا، لیکن اس نے عمر کی دلچسپی کو اور بھی ہوا دی اور وہ اس سے اپنے نگاہیں نہ پھیر سکا۔ اس وقت تک جہان نے اپنی نقاب کا زیریں حصہ اوپر اٹھا دیا تھا اور اس کے آرائش سے معریٰ ہونٹ نظر آنے لگے تھے۔ اس نے ایک پُر لطف نظم پڑھ کر سنائی جس میں، عجیب بات ہے، خان کا نام ایک مرتبہ بھی نہیں

آیا تھا۔ستائش تو دریا سوگدہ کی کی گئی تھی جو اپنی فیّاضی سمرقند پر نثار کرتا ہے، پھر بخارا پر، قبل اس کے کہ خود کو ریگ زار میں گم کر دے، کیونکہ کوئی سمندر بھی اس کے پانیوں کی پذیرائی کے قابل نہیں۔

''بہت خوب کہا! واجب ہے کہ تمھارا منھ سونے سے بھر دیا جائے،'' نصر نے اپنا رواجی فقرہ دہراتے ہوئے کہا۔

شاعرہ طلائی دیناروں سے بھرے ایک بڑے سے طشت پر جھک گئی اور ایک ایک کر کے سکّے اپنے منھ میں بھرنے لگی جب کہ حاضرین بہ آوازِ بلند گنتے گئے۔ جب جہان نے ہچکی لی اور تقریباً گلا گھٹنے کو ہوا، تو شاہ سمیت پورا دربار قہقہہ زن ہو گیا۔حاجب نے شاعرہ کو اپنی جگہ پر لوٹ جانے کا اشارہ کیا۔انھوں نے چھیالیس دینار گنے تھے۔

صرف خیام ہی نہیں ہنسا۔ نگاہیں جہان پر ثبت کیے وہ اس کے بارے میں اپنے جذبات کو بھانپنے کی کوشش کرنے لگا۔اس کا شعر اس قدر خالص تھا، اس کی قادر الکلامی اس قدر باوقار، اس کی چال اس قدر دلیرانہ، لیکن وہ اپنے منھ میں دھات کے پیلے پیلے سکّے ٹھونسے جا رہی تھی اور خود کو اس قدر ہتک آمیز انعام کا نشانہ بننے دے رہی تھی۔نقاب دوبارہ واپس ڈالنے سے پہلے اس نے اسے ایک ذرا سا اوپر اٹھایا اور ایک نگاہ ڈالی جو عمر کی توجہ میں آئی۔اس نے اسے تنفس کے ساتھ اپنے میں اتر جانے دیا اور اسے وہیں روکے رکھنے کی کوشش کی۔ یہ ایک اتنا زودگزر لمحہ تھا کہ ہجوم کی نظر میں تو کیا آتا لیکن کسی عاشق کے لیے ابدیّت سے کم نہیں تھا۔وقت کے دو چہرے ہوتے ہیں، خیام نے اپنے سے کہا۔اس کی دو ابعاد ہیں، اس کی طوالت کو حرکتِ آفتاب سے ناپا جا سکتا ہے لیکن اس کی گہرائی کو صرف جذبے کے ہیجانی آہنگ ہی سے۔

ان کے درمیان رفعت کا یہ لمحہ قاضی کی مداخلت سے ٹوٹ گیا جو خیام کا شانہ تھپ تھپا کر اسے واپس ہوش وحواس میں لا رہا تھا۔لیکن اب کیا ہوتا ہے،عورت جا چکی تھی۔صرف حجاب ہی باقی رہ گئے تھے۔

ابوطاہر اپنے دوست کو خان کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا تھا۔اس نے بندھے ٹکے الفاظ میں کہا،''آپ کی سقفِ عالی آج خراسان کی عظیم ترین خرد پر سایہ فگن ہے، عمر خیام، جس سے نباتات کا کوئی راز مخفی نہیں، نہ نجوم کا کوئی اسرار۔''

یہ کوئی خوش گوار اتّفاق نہیں تھا کہ قاضی نے ان تمام علوم میں سے جن میں عمر کو فضل وتبحّر حاصل تھا صرف طب اور نجوم ہی کا ذکر کیا، کیونکہ بس یہی دو علم ایسے تھے جن کے امرا شیفتہ وگرویدہ تھے؛ اوّل الذکر تو اس لیے کہ یہ ان کی صحت وزندگی کی بقا کے لیے ضروری تھا، اور موخر الذکر ان کی دھن دولت کی بقا کے لیے۔

امیر کے مزاج میں شگفتگی آ گئی اور بولا کہ یہ بات اس کے لیے باعثِ عزّت ہے۔اس کے باوجود، سردست کسی ذہنی بحث وتمحیص میں پڑنے کے لیے طبیعت کو مائل نہ پا کر یا ملاقاتی کے مقاصد کی بابت غلط قیاس آرائی کے باعث اس نے وہی گھسا پٹا فقرہ دہرانا پسند کیا،''اس کا منھ زر سے بھر دیا جائے!''

عمر ہکّا بکّا رہ گیا اور بہ مشکل ابکائی کو دبا پایا۔ یہ بات ابوطاہر کی توجہ میں آ گئی اور پریشان ہو گیا۔ اس خوف سے کہ کہیں انکار حکمراں کو ناگوار خاطر نہ محسوس ہو، اس نے اپنے رفیق پر بڑی تاکیدی اور گمبھیر

نظر ڈالی اور شانے سے آگے کی طرف بے سود دھکیلا۔ خیام پہلے ہی اپنا فیصلہ کر چکا تھا۔

''براہِ مہربانی، کیا میرے آقا مجھے معاف رکھیں گے۔ میں روزے سے ہوں اور اپنے منہ میں کچھ ڈالنے سے عاجز۔''

''لیکن روزوں کا مہینہ، اگر مجھ سے غلطی نہیں ہو رہی، تو تین ہفتے پہلے ہی ختم ہو چکا ہے!''

''رمضان کے دنوں میں میں نیشاپور سے سمرقند کا سفر کر رہا تھا۔ میں نے اس عہد کے ساتھ اس وقت روزے نہیں رکھے کہ بعد میں یہ فرض پورا کرلوں گا۔''

قاضی دہشت زدہ رہ گیا اور سارے مجتمعین کسمسانے لگے، لیکن حکمراں کا چہرہ بالکل سپاٹ رہا۔ اس نے ابوطاہر سے سوال کرنا پسند کیا۔

''کیا تم جسے مذہب کی تمام تفصیلات کا علم ہے بتا سکتے ہو کہ اگر طلائی سکّے اس کے منہ میں ڈال کر فوراً ہی نکال لیے جائیں تو کیا اس سے خواجہ عمر کا روزہ ٹوٹ جائے گا؟''

قاضی نے غایت درجے کے غیر جانب دارانہ لہجے میں کہا، ''صحیح معنی میں، ہر چیز جو منہ میں جائے روزہ توڑ سکتی ہے۔ ایسا ہوا ہے کہ سکّہ اتفاقاً حلق سے نیچے اتر گیا تھا۔''

نصر نے دلیل قبول کر لی، لیکن اس سے اس کی تشفّی بہرحال نہیں ہوئی۔ اس نے عمر سے مزید استفسار کیا:

''کیا تم نے مجھے اپنے انکار کی اصل وجہ بتائی ہے؟''

خیام لمحے بھر تذبذب کرتا رہا پھر بولا:

''صرف یہی وجہ نہیں ہے۔''

''صاف صاف کہو،'' خان نے کہا۔ ''مجھ سے خوف زدہ ہونے کی حاجت نہیں۔'' پھر عمر نے یہ شعر سنائے:

یہ غربت نہیں جو مجھے آپ کے در پہ لائی ہے
میں مفلس نہیں کہ میری خواہشیں سادہ سی ہیں
آپ سے صرف عزّت کا خواہاں ہوں
ایک آزاد اور مستقل مزاج انسان کی عزّت کا

''خیام، خدا تیرے دن تاریک کرے!'' ابوطاہر نے بڑبڑا کر کہا، جیسے خود اپنے سے۔

اسے معلوم نہیں تھا کہ سوچے تو کیا سوچے، لیکن اس کا خوف بالکل واضح تھا۔ ایک حالیہ طیش کی گونج ہنوز اس کے کانوں میں جھنجھنا رہی تھی، اور اسے یقین نہیں تھا کہ وہ وحشی کو دوبارہ قابو میں رکھ سکے گا۔ خان خاموش و بے حرکت رہا، جیسے کسی بے تھاہ سوچ میں منجمد ہو گیا ہو۔ خان کے مقرّبین اس کے پہلے لفظ کے منتظر تھے جیسے یہ کوئی حتمی فیصلہ ہوگا، اور بعض نے تو طوفان کی آمد سے قبل ہی وہاں سے رخصت ہو جانے میں عافیت سمجھی۔

عمر نے اس عام افراتفری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جہان کی آنکھوں کو تلاش کیا۔ وہ ایک ستون سے اپنی

پشت ٹِکائے کھڑی تھی اس طرح کہ چہرہ ہاتھوں میں دفن تھا۔ کیا یہ ہوسکتا ہے کہ وہ اس کی خاطر لرزہ براندام ہو؟

بالآخر خان بلند ہوا، ثابت قدمی سے عمر کی طرف آیا، اس سے بڑا جاندار معانقہ کیا، ہاتھ تھاما اور اس لے کر وہاں سے چل دیا۔

''حاکم ماوراءالنہر کے دل میں،'' وقائع نگاروں نے اپنی روداد میں رقم کیا،''عمر خیام کی عزّت اتنی بڑھ گئی کہ اسے تخت پر اپنے پاس آ کر بیٹھنے کی دعوت دی۔''

''تو اب تم خان کے دوست ہو،'' جب وہ محل سے نکلے تو ابوطاہر نے خیام سے کہا۔

اس کی خوش مزاجی اتنی ہی شدید تھی جتنا وہ ذہنی عذاب جس نے اس کا حلق جکڑ دیا تھا، لیکن خیام نے سرد لہجے میں جواب دیا:''کیا ہوسکتا ہے کہ آپ وہ ضرب المثل بھول رہے ہوں جس کے مطابق،'سمندر کسی پڑوسی کو نہیں پہچانتا، اور امیر کسی دوست کو'؟''

''کھلے دروازے کی تحقیر نہ کرو۔ مجھے تمھیں دربار میں ملازمت ملنے کے آثار نظر آ رہے ہیں!''

''درباری زندگی میرے لیے نہیں بنی؛ میری صرف اتنی ہی آرزو ہے کہ کبھی میری ایک رصدگاہ ہو اور ایک گلاب کا باغ اور میں خود کو آسمان کے مشاہدے میں غرق کرسکوں، مینا ہاتھ میں ہو اور پہلو میں ایک حسین عورت۔''

''اتنی ہی حسین جتنی وہ شاعرہ تھی؟'' ابوطاہر نے زیرلب ہنستے ہوئے کہا۔

عمر سوائے اس عورت کے کسی اور چیز کے بارے میں سوچنے سے قاصر تھا، پھر بھی اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اسے ڈر تھا کہ لاپروائی میں منھ سے نکلا ادنیٰ سا لفظ اس کی چغلی کھا دے گا۔ خود کو کسی قدر بشّاش محسوس کر کے قاضی نے نہ صرف اپنا لہجہ بلکہ موضوع بھی بدل دیا:

''تم سے ایک عنایت کی درخواست کرنا چاہتا ہوں!''

''یہ تو آپ ہیں جنھوں نے مجھے اپنی عنایات سے مالا مال کر دیا ہے۔''

''ابوطاہر نے بلاحیل و حجت یہ مان لیا۔''اچھا تو یوں سمجھو کہ میں اس کے بدلے میں کچھ چاہتا ہوں۔''

اب وہ اس کی رہائش گاہ کے پھاٹک پر پہنچ گئے تھے۔ اس نے طرح طرح کے کھانوں سے بھری میز کے گِرد خیام کو دونوں کی گفتگو جاری رکھنے کی دعوت دی۔

''میں نے تمھارے لیے ایک منصوبہ بنایا ہے۔ کیوں نہ فی الوقت تمھاری 'رباعیات' سے صرفِ نظر کریں۔ جہاں تک میرا تعلّق ہے، میں تو انھیں عبقریت کی ناگزیر للک سمجھتا ہوں۔ وہ میدان جن میں تمھیں واقعی فضیلت حاصل ہے طب، علمِ نجوم، ریاضی اور ہندسہ، طبیعیات اور مابعدالطبیعیات ہیں۔ میں یہ کہنے میں غلط تو نہیں کہ ابن سینا کی وفات کے بعد کوئی اور انھیں تم سے بہتر نہیں جانتا؟''

خیام خاموش رہا۔ ابوطاہر نے اپنی بات جاری رکھی:

''میں چاہتا ہوں کہ تم ان علوم پر ایک قاطع تصنیف رقم کرو اور اسے میرے نام معنون کرو۔''

''میرے خیال میں تو ان علوم پر کوئی قاطع کتاب نہیں لکھی جاسکتی، اور یہی وجہ ہے کہ میں صرف پڑھنے اور حصول علم پر ہی اکتفا کرتا ہوں، خود کچھ لکھے بغیر۔''

''یعنی!''

''چلیے قدما کا تصوّر کریں— یونانیوں کا، اہلِ ہند اور مسلمانوں کا جو مجھ سے پہلے ہوئے ہیں۔ انھوں نے ان علوم پر بہ کثرت لکھا ہے۔ اگر میں وہی دہرا دیتا ہوں جو وہ پہلے لکھ چکے ہیں، تو میرا کام فالتو ہوگا؛ اگر میں ان کی تردید کرتا ہوں، جس کی مجھے رہ رہ کر ترغیب محسوس ہوتی ہے، تو دوسرے میرے بعد آ کر خود میری تردید کر دیں گے۔ دانشوروں کی نگارشات میں کا آئندہ کل کیا باقی رہ جائے گا؟ صرف وہ عیب جوئی جو انھوں نے اپنے سے پہلے والوں کے بارے میں کی تھی۔ لوگوں کو صرف یہی یاد رہے گا کہ انھوں نے دوسروں کے کون سے نظریات منہدم کیے ہیں، لیکن وہ نظریات جو خود انھوں نے وضع کیے ہیں، آنے والے انھیں منہدم تو خیر کریں گے ہی، ان کا تمسخر بھی اڑائیں گے۔ علم کا قانون یہی ہے۔ لیکن شاعری کا ایسا کوئی قانون نہیں۔ یہ جو پہلے کہا جا چکا ہے اسے ہرگز مسترد نہیں کرتی اور جو اس کے بعد آنے والا ہے اس سے کبھی جھوٹی نہیں پڑتی۔ صدیوں صدیوں شاعری مکمل سکون کی حالت میں رہتی ہے۔ اسی لیے میں نے اپنی 'رباعیات' لکھی۔ آپ کو معلوم ہے کہ علم کی بابت کونسی چیز مجھے من بھاوَنی لگتی ہے؟ یہی کہ مجھے اس میں عظیم ترین شاعری ملی ہے: اعدادِ ریاضی کی سرشار کر دینے والی سرمستی، اور فلکیات میں کائنات کی پراسرار سراہٹ۔ لیکن، آپ کی اجازت ہو تو کہوں کہ براہِ کرم مجھ سے 'سچ' کیا ہے کی بات نہ کریں۔''

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد پھر کہا:

''یہ اتفاقاً سمرقند کے اِرد گِرد چہل قدمی کر رہا تھا تو مجھے پرانے کھنڈرات اور ان کے کتبے نظر آئے جنھیں آج کوئی پڑھ بھی نہیں سکتا۔ میں نے تعجب سے سوچا، 'وہ شہر جو کبھی یہاں آباد تھا، اس کا کیا باقی بچ رہا ہے؟' تو چلیے لوگوں کی باتیں نہ کریں، کیونکہ وہ تخلیق میں سب سے زیادہ آنی جانی شے ہیں، لیکن ان کی تہذیب کا کیا بچا ہے؟ یہاں کس سلطنت، علم، قانون اور سچائی کا وجود تھا؟ کچھ بھی تو نہیں، میں بے سود ہی ان قدیم آثار میں جہاں تہاں ٹامک ٹوئیے مارتا پھرا اور ہاتھ آیا تو صرف کسی سفالی ظرف کا ٹوٹا ہوا پارہ ہی جس پر ایک چہرہ کندہ تھا یا کسی ستون کے آرائشی حاشیے کا ایک ٹکڑا۔ اور ہزار سال بعد میری نظموں کی بھی یہی حالت ہونے والی ہے— پارے، ریزے، ٹکڑے، اس دنیا کا ملبہ جو ابد تک مدفون ہو چکی ہے۔ شہر کا کچھ باقی رہتا ہے تو یہ وہ بے تعلّق نگاہ ہے جس سے کسی نیم مدہوش شاعر نے اسے دیکھا ہوتا ہے۔''

''میں تمھاری بات سمجھتا ہوں،'' ابو طاہر نے ہکلا کر کہا، بلکہ چکرا کر۔ ''اس کے باوجود، تم ایک شافعی مذہب کے قاضی کے نام لگی بندھی نظمیں تو معنون کرنے سے رہے جن سے شراب کی بو آ رہی ہو!''

حقیقت یہ ہے کہ عمر کا رویّہ مصالحتی اور تشکرانہ ثابت ہونے والا تھا۔ بہ الفاظ دیگر، وہ اپنی شراب کی تندی کو کم کرنے والا تھا۔ آنے والے مہینوں میں اس نے کعبی مساوات (cubic equations) سے متعلق ایک بے حد

گمبھیر رسالے کی تصنیف میں خود کو غرق کرلیا۔ الجبر کے اس رسالے میں لامعلوم کی نمائندگی کے لیے، خیام نے عربی لفظ ''شے'' مقرّر کیا، جس کا مطلب ''چیز'' ہے۔ یہ لفظ، جو ہسپانوی کی علمی تصانیف میں xay کے طور پر املا ہوا، رفتہ رفتہ صرف اپنے پہلے حرف، x، سے بدل دیا گیا جو ساری دنیا میں لامعلوم قدر کی علامت کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔

خیام کا یہ علمی پارہ سمرقند میں تکمیل کو پہنچا اور اپنے محافظ کے نام یوں معنون ہوا: ''ہم ایک ایسے عہد کے کشتہ ہیں جسے میں اربابِ علم بے اعتبار ہیں اور ان میں بس معدودِ چند ہی خالص تحقیق کے لیے اپنے کو وقف کرنے کے امکانات سے بہرہ ور ہیں۔ وہ تھوڑا سا علم جو دورِ حاضر کے دانش وروں کو حاصل ہے، وہ مادّی اغراض کی تگ و دو میں کھپ جاتا ہے۔ چنانچہ میں اس عالم میں کسی ایسے کے حصول سے مایوس ہو چکا تھا جس کی دلچسپی علمی چیزوں میں بھی اتنی ہی ہو جتنی دنیوی چیزوں میں، ایک فرد جو انسانی تقدیر کی فکر میں غرق ہو، تا آنکہ خدا نے مجھے قاضی، امام ابو طاہر، سے ملنے کا موقع عنایت فرمایا۔ یہ ان کی نوازشوں کے طفیل ہے کہ میں خود کو ان کاموں میں لگا سکا ہوں۔''

اس رات جب خیام اپنے منظرے کی طرف واپس آ رہا تھا جہاں ان دنوں اس کی رہائش تھی، تو اس نے یہ سوچ کر کہ اب کچھ پڑھنے لکھنے کا وقت کہاں رہا ہے چراغ ساتھ نہیں لیا تھا۔ اس کے باوجود اس کے راستے پر چاند کی روشنی کا مدّھم سا اجالا تھا، ماہِ شوال کے ختم کا لاغر سا ہلال۔ جوں جوں وہ قاضی کی مسکن سے کچھ آگے بڑھا، اسے باقاعدہ ٹٹول ٹٹول کر اپنا راستہ تلاش کرنا پڑا۔ ایک سے زائد بار اسے ٹھوکر لگی، جھاڑیوں کو پکڑ کر اپنے کو گرنے سے روکا اور ٹھیک منھ پر بیدِ مجنوں کے سخت طمانچے کو سہا۔

اس نے ابھی بہ مشکل ہی اپنے کمرے میں قدم رکھا تھا کہ اسے میٹھی میٹھی سی سرزنش کی آواز سنائی دی۔ ''میں ذرا اس سے پہلے تمھارے آنے کی متوقع تھی۔''

تو کیا اس نے اس عورت کے بارے میں اتنی شدّت سے سوچا تھا کہ اب یہ گمان کر رہا ہے کہ اسے سن بھی رہا ہے؟ دروازے کے سامنے کھڑے کھڑے، جسے اس نے دھیرے سے بھیڑ دیا، اس نے کسی نیم رخ کو پہچاننے کی کوشش کی۔ بے سود ہی، کیونکہ دوبارہ صرف آواز ہی آئی، قابلِ سماعت پھر بھی مبہم۔

''تم خاموش ہو۔ یہ یقین کرنے سے انکار کر رہے ہو کہ کوئی عورت یوں بے باکانہ تمھارے کمرے میں در آنے کی جرات کرسکتی ہے۔ محل میں ہماری نظریں ملی تھیں اور جگمگا اٹھی تھیں، لیکن خان وہاں موجود تھا، اور قاضی اور درباری بھی، اور تم نے اپنی نظر پھیر لی تھی۔ بہت سے مردوں کی طرح تم نے بھی رکنا پسند نہیں کیا۔ لیکن تقدیر کی مزاحمت سے کیا ملے گا۔ صرف ایک عورت کی خاطر امیر کے غیظ و غضب کو مول لینے سے کیا ہاتھ آئے گا، ایک بیوہ کی خاطر جو جہیز میں صرف ایک منھ پھٹ زبان اور ایک مشتبہ ناموس ہی لاسکتی ہو؟''

کسی پراسرار طاقت نے عمر کو باز رکھا، ۔ وہ نہ کوئی جنبش کرسکا نہ ہونٹوں کو ڈھیلا ہی۔

''تم تو کچھ بھی نہیں بول رہے،'' جہان نے بڑے گداز طنزِ خفی کے ساتھ تبصرہ کیا۔ ''اچھا، خیر، میں خود ہی بولتی رہوں گی، اور یوں بھی اب تک صرف میں نے ہی کوئی قدم اٹھایا ہے۔ جب تم دربار سے جا رہے تھے، میں

نے تمھاری پوچھ گچھ کی اور تمھاری قیام گاہ کا پتا لگایا۔ میں نے یہ عذر پیش کیا کہ اپنی عم زادی کے پاس رہنے جا رہی ہوں جس کی شادی سمرقند کے ایک متموّل سوداگر سے ہوئی ہے۔ عام طور پر جب میری نقل وحرکت دربار کے ساتھ ساتھ ہوتی ہے تو جا کر حرم میں سوتی ہوں۔ وہاں میری کچھ سہیلیاں ہیں جو میری رفاقت پسند کرتی ہیں۔ بڑے اشتیاق سے میری لائی ہوئی خبریں سنتی ہیں۔ مجھے اپنا رقیب نہیں سمجھتیں کیونکہ انھیں خوب معلوم ہے کہ خان کی بیوی بننے کی میری کوئی خواہش نہیں۔ اگر میں چاہتی تو اسے رجھا پر چا سکتی تھی، لیکن میں شاہ کی بیگمات کے ساتھ اتنا زیادہ وقت گزار چکی ہوں کہ اس قسم کی قسمت مجھے لبھا نہیں سکتی۔ میرے لیے زندگی مردوں سے اس قدر زیادہ اہم ہے! جب تک میں کسی اور کی بیوی ہوں، یا کسی کی بھی نہیں، حکمراں اپنے دیوان میں میری، میرے اشعار کی اور میری خندہ زنی کی نمائش کا مشتاق رہے گا۔ لیکن جس دن بھی مجھ سے شادی کرنے کا خواب دیکھا، وہ شروعات مجھے تالے چابی میں ڈال کر کرے گا۔''

اپنی مجہول کیفیت سے بہ مشکل باہر آتے ہوئے عورت کا ایک لفظ بھی عمر کی سمجھ میں نہیں آیا، اور جب اس نے کچھ کہنے کا فیصلہ کیا تو وہ اُس سے کم، بلکہ اپنے سے یا کسی سائے سے زیادہ بول رہا تھا:

''اپنی جوانی میں، یا اس کے بعد بھی، بارہا کوئی نگاہ مجھ پر اٹھی ہے، یا کوئی مجھے دیکھ کر مسکرایا ہے۔ پھر رات کو میں نے خواب میں اسی نگاہ کو مجسم ہوتے ہوئے دیکھا ہے، گوشت پوست میں بدلتے ہوئے۔ ایک عورت، اندھیرے میں دمکتی ہوا ایک پیکر۔ اچانک، اس رات کے اندھیارے میں، اس غیر حقیقی منظرے میں، اس غیر حقیقی شہر میں، تم یہاں ہو — ایک حسین عورت، اس پر مستزاد ایک شاعرہ، اور مہیّا۔''

وہ ہنس پڑی۔

''مہیّا! یہ تمھیں کیسے معلوم ہوا؟ تم نے تو مجھے ہاتھ بھی نہیں لگایا، مجھے دیکھا تک نہیں، اور یقیناً دیکھو گے بھی نہیں کیونکہ اس سے پہلے کہ سورج مجھے بھگا دے، میں خود ہی یہاں سے رخصت ہو جاؤں گی۔''

اس دبیز تاریکی میں ریشم کی بے ترتیب سی سرسراہٹ ہوئی اور خوشبو سی لہرائی۔ عمر دم بہ خود رہ گیا، اس کا جسم جاگ گیا تھا۔ وہ کسی طفلِ مکتب کی سادہ لوحی سے پوچھے بغیر نہ رہ سکا:

''کیا تم اب بھی نقاب پہنے ہوئے ہو؟''

''تنہا نقاب جو پہنے ہوں وہ رات ہی ہے۔''

باب ٦

ایک عورت اور ایک مرد۔ گمنام مصور نے انھیں نیم رخ میں تصوّر کیا تھا، پھیلے ہوئے اور ایک دوسرے میں پیوست۔ اس نے منظرے کی دیواریں ہٹا دی تھیں، انھیں بسترِ گیاہ مہیّا کر دیا تھا جس کا حاشیہ گلابوں کا تھا اور ایک سیمیں چشمہ جوان کے پاؤں کے قریب اُبل رہا تھا۔ اس نے جہان کے پستان کسی ہندو دیوی جیسے خوش وضع بنائے تھے۔ عمر اس کی زلفوں کو ایک ہاتھ سے ہلکے ہلکے چھو رہا ہے اور دوسرے میں ایک جام سنبھالے ہے۔

ہر روز محل میں ان کی مڈ بھیڑ ہوتی، لیکن وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھنے سے اجتناب کرتے کہ مبادا اپنی چغلی نہ کھا دیں۔ ہر شام خیام بہ عجلت منظرے لوٹ آتا اور اپنی محبوب کا انتظار کرتا۔ قسمت نے انھیں کتنی راتیں ارزانی کی تھیں؟ ہر چیز کا انحصار حکمراں پر تھا۔ جب وہ خیمہ اٹھا دے گا، جہاں اس کے ساتھ ساتھ چلی جائے گی۔ وہ کبھی پیشگی کوئی اطلاع نہیں دیتا تھا۔ کسی صبح یہ ابنِ خانہ بدوش چھلانگ مار کر اپنے راہوار پر جا سوار ہوگا اور بخارا کی راہ لے گا، کش یا پنج قند کی، اور دربار میں افراتفری مچ جائے گی کہ اسے جا لیں۔ عمر اور جہان کو اس لمحے سے خوف آتا تھا اور ان کے ہر بوسے میں الوداع کا ذائقہ ہوتا، ہر ہم آغوشی میں دم بہ خود فرار کا رنگ۔

گرمیوں کی ایک حد درجہ اُمس زدہ رات خیام منظرے کی مہتابی میں انتظار کی گھڑیاں گزار نے پہنچا کہ اسے کہیں نزدیک ہی قاضی کے پہرے داروں کے ہنسنے کی آواز سنائی دی اور وہ بے چین ہو گیا۔ لیکن یہ بے چینی بلا وجہ تھی، کیونکہ جہان آ پہنچی اور اسے اطمینان دلایا کہ کسی کی بھی نظر اس پر نہیں پڑی ہے۔ انھوں نے ایک دوسرے کا پہلے چوری چوری بوسہ لیا، بعد میں ایک اور شدید تر۔ اسی طرح وہ دن کو اس کے اختتام تک پہنچاتے تھے جس میں وہ دوسروں کی ملکیت ہوتے اور اُس رات کی ابتدا کرتے جو ان کی ملکیت تھی۔

''کیا خیال ہے، اس شہر میں کتنے ایسے عاشق ہوں گے جو ہماری طرح محوِ وصل ہوں؟'' جہان نے شرارت سے سرگوشی کی۔ عمر نے ماہرانہ طور پر اپنا مشروبِ شب تیار کیا، گال پھلائے اور غور و فکر کے انداز میں کہا:

''چلو اس پر توجہ سے غور کریں: اگر ہم بے زار بیویوں کو منہا کر دیں، اطاعت گزار باندیوں، بازاری کسبیوں کو جو اپنے کو بیچتی ہیں یا کرائے پر اٹھاتی ہیں، اور آہیں بھرتی باکراؤں کو، تو کتنی عورتیں باقی بچ رہتی ہیں، کتنی عورتیں جو اس آدمی سے محوِ وصل ہیں جسے انھوں نے خود پسند کیا ہے؟ اسی طرح، ایسے کتنے مرد ہوں گے جو اس عورت کے برابر سوئیں گے جس سے انھیں عشق ہے، ایک ایسی عورت جو خود کو اپنی مرضی سے پیش کر رہی ہے، اس لیے نہیں کہ اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں؟ کون جانے، آج رات شاید پورے سمرقند میں صرف ایک ہی ایسا مرد اور ایک ہی ایسی عورت ہے۔ صرف تم ہی کیوں اور صرف میں ہی کیوں؟ اس لیے کہ خدا نے ہمیں محبت میں گرفتار کیا ہے، بالکل جس طرح اس نے بعض پھولوں کو زہرناک بنایا ہے۔''

وہ ہنسا اور وہ رو پڑی۔

''چلو اندر چلیں اور دروازہ بند کر دیں۔ انھیں ہماری خوشیوں کی آواز کان پڑ جائے گی۔''

بہت سی ہم آغوشیوں کے بعد، جہان کمر سیدھی کر کے بیٹھ گئی، اپنے کو کچھ ڈھانپ لیا، اور بڑی نرمی کے ساتھ اپنے کو اپنے عاشق کی آغوش سے علاحدہ کر لیا۔

''مجھے ایک راز تمھیں بتا دینا چاہیے جو میں نے خان کی بڑی بیگم سے سنا ہے۔ معلوم ہے وہ سمرقند کیوں آیا ہوا ہے؟''

عمر نے اسے روک دیا، اس خیال سے کہ حرم کی کوئی گپ شپ ہوگی۔

''امرا کے رازوں سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔ یہ اپنے سننے والوں کے کان جلا دیتے ہیں۔''

''میری بات سنو تو سہی۔ اس راز کا اثر ہم پر بھی پڑتا ہے، کیونکہ یہ ہماری زندگی میں خلل اندازی کر سکتا ہے۔ نصر خان مورچوں کے معائنے کے لیے آیا ہے۔ گرما کے ختم پر، جب گرمی کا زور ٹوٹ چکا ہوگا، وہ سلجوق فوج کی حملہ آوری کا متوقع ہے۔''

سلجوق، خیام ان سے خوب واقف تھا۔ یہ اس کے بچپن کی اولین یادوں میں جاگزین تھے۔ مسلمان ایشیا کے مالک بن بیٹھنے سے بہت پہلے، وہ اس کے پیدائشی شہر پر حملہ آور ہوئے تھے اور اپنے پیچھے، نسلاً بعد نسل تک، ایک خوفِ عظیم کی یاد چھوڑ گئے تھے۔

یہ واقعہ اس کی پیدائش سے دس سال پہلے رونما ہوا تھا۔ نیشاپور کے باشندے ایک صبح اٹھے تو دیکھا کہ ان کے شہر کے گرد تر کی جنگجوؤں نے پورا پورا محاصرہ کیا ہوا ہے، اور ان کی سربراہی دو بھائی کر رہے ہیں، طغرل بیگ باز اور چغری بیگ شِکرا، میخائیل ابن سلجوق کے فرزند، جو اس وقت غیر معروف سے خانہ بدوش سردار تھے اور ابھی حال ہی میں مشرف بہ اسلام ہوئے تھے۔ شہر کے سر برآوردگان کو پیغام ملا: ''کہا جاتا ہے کہ تمھارے نوجوان اپنے فخر پر ناز کرتے ہیں اور میٹھا پانی تمھاری قناتوں میں بہتا ہے۔ اگر تم نے مزاحمت کی کوشش کی تو جلد ہی تمھاری قناتوں کے منھ سوئے فلک کھل جائیں گے اور تمھارے جوان زیرِ زمیں ہوں گے۔''

اس قسم کی لاف زنی محاصرے کے وقت عام تھی۔ اس کے باوجود اکابرِ نیشاپور نے اس وعدے کے عوض ہتھیار ڈالنے میں عجلت دکھائی کہ اہالین شہر کی جان کو کوئی گزند نہ پہنچے اور ان کا مال، ان کے گھر اور ان کی قناتیں محفوظ رہیں۔ لیکن ایک فاتح کے وعدوں کا کیا بھروسا؟ جب لشکر شہر میں داخل ہوا، چغری اپنے سپاہ کو سڑکوں اور بازاروں میں کھلے بندوں چھوڑ دینا چاہتا تھا۔ طغرل کی صلاح مختلف تھی۔ وہ ماہِ رمضان کا احترام کرنا چاہتا تھا کیونکہ اس ماہِ صوم میں ایک اسلامی شہر میں قتل و غارت گری حرام تھی۔ جیت بہر کیف اسی دلیل کی ہوئی، تاہم چغری قائل نہیں ہوا اور چار و ناچار اس وقت کا انتظار کرنے لگا جب آبادی اس مذہبی کیفیت سے نکل آئے گی۔

جب اہالین شہر کو برادران کی نا اتّفاقی کی ہوا لگی اور احساس ہوا کہ ماہِ آئندہ کے آغاز میں ان کی غارتگری، زنا بالجبر اور قتلِ عام ہونے والا ہے، تو بس یہیں سے خوفِ عظیم کی ابتدا ہوئی۔ زنا بالجبر سے زیادہ ہتک آمیز اس کی ناگزیریت کا اعلان ہے، جس پر ہونی کا انفعالی اور باعثِ ذلّت انتظار مستزاد۔ دکانیں خالی ہو گئیں، مرد جا چھپے اور ان کی بیوی بیٹی نے انھیں اپنی بیچارگی کا ماتم کرتے دیکھا۔ کیا کریں؟ کیسے فرار ہوں؟ کس راہ سے؟ قابض ہر طرف دندناتا پھر رہا تھا۔ چوٹی دار سپاہ صدر چوک کے بازاروں میں، مختلف علاقوں، مضافات اور بابِ سوختہ کے اکناف میں گھات لگائے بیٹھے تھے۔ وہ مسلسل پیے ہوتے اور زرِ مخلصی اور لوٹ کھسوٹ کے متلاشی، اور ان کے بے قابو جتّھے دیہی علاقوں میں جراثیم کی طرح پھیلے ہوئے تھے۔

کیا آدمی روزوں کے ختم ہونے اور عید کی آمد کی خواہش نہیں کرتا؟ اس سال وہ چاہتے تھے کہ صیام کبھی ختم نہ ہو اور امید کرتے کہ عید کبھی نہ آئے۔ جب نئے ماہ کا ہلال نظر آیا، کسی کو خوشی منانے یا بھیڑ ذبح کرنے کا خیال

تک نہیں آیا۔ پورا شہر ہی کسی دیوہیکل بھیڑ کی طرح نظر آ رہا تھا جسے خوب کھلا پلا کر قربانی کے لیے فربہ کیا گیا ہو۔

عید سے پچھلی رات، جب ہر امید پوری ہوتی ہے، شبِ عذاب تھی، ہزاروں خاندانوں نے مسجدوں اور اولیاؤں کی درگاہوں کی مشتبہ امان میں آنسو بہائے اور دعائیں مانگیں۔

اس وقت قلعےکے اندر دونوں سلجوق بھائیوں کے درمیان بڑی قیامت خیز بحث جاری تھی۔ چغری چلاّ رہا تھا کہ اس کے سپاہ کو مہینوں سے مشاہرہ نہیں ملا ہے، کہ وہ صرف اس لیے لڑنے کے لیے آمادہ ہوئے تھے کہ ان سے اس ثروت مند شہر میں آزادانہ تصرّف کا وعدہ کیا گیا تھا، کہ وہ بغاوت کی کگر پر کھڑے ہوئے تھے اور کہ وہ، چغری، ان کو مزید روکے رکھنے سے قاصر تھا۔

لیکن طغرل کسی اور ہی زبان میں بات کرر ہا تھا:

''ہماری فتوحات کی ابھی باسم اللہ ہی ہوئی ہے۔ قبضۂ اختیار میں لانے کے لیے ابھی بہتیرے شہر باقی ہیں۔ اصفہان، شیراز، ری، تبریز اور ان سے آگے دوسرے۔ اگر ہم نیشاپور کے سپر انداز ہو جانے کے بعد اس میں لوٹ مار مچاتے ہیں، اپنے سارے وعدوں کے باوجود، تو کوئی اور دروازہ ہمارے لیے نہیں کھلے گا، کوئی اور قلعہ بند شہر اپنی محافظ فوج کے ساتھ ذرہ برابر بھی کم زوری نہیں دکھائے گا۔''

''اگر ہم اپنی فوج ہی سے ہاتھ دھوے بیٹھے اور ہمارے سپاہ ہمیں چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے تو یہ جو تم اتنے بہت سے شہروں کے خواب دیکھ رہے ہو تو یہ کیسے فتح ہوں گے؟ وفادار ترین سپاہی بھی اب شکایت کر رہے ہیں اور دھمکی دے رہے ہیں۔''

دونوں بھائی اپنے سپہ سالاروں اور قبیلے کے بزرگوں میں گھرے ہوئے تھا، جن میں سے ایکو ایک نے چغری کی بات کی تصدیق کی۔ اس سے ہمت پا کر وہ کھڑا ہوا اور معاملہ کو یکسو کرنے کا فیصلہ کر ڈالا:

''بہت باتیں ہو لیں۔ میں اپنے آدمیوں سے جا کر کہتا ہوں کہ شہر کے ساتھ جو کرنا ہے کریں۔ اگر تم اپنے آدمیوں کو باز رکھنا چاہتے ہو تو تمھاری مرضی۔ تم اور تمھارے سپاہ الگ، میں اور میرے سپاہ الگ۔''

اس مخمصے میں پھنس کر، اس نے کوئی جنبش نہیں کی۔ وہ یک بارگی ان کے درمیان سے اچھل کر دور ہوا اور ایک خنجر اٹھالیا۔

خود چغری نے بھی اس درمیان میں اپنی تلوار نیام سے باہر کر لی تھی۔ کسی کو معلوم نہیں تھا کہ مداخلت کریں یا، جیسا کہ رواج تھا، سلجوق بھائیوں کو اپنا حساب خون سے طے کر لینے دیں، کہ طغرل نے پکار کر کہا:

''برادر، میں تمھیں اپنی بات ماننے پر مجبور نہیں کر سکتا۔ میں تمھارے سپاہ کو روک نہیں سکتا، لیکن اگر تم نے انھیں اس شہر پر چھوڑ دیا تو میں یہ خنجر اپنے سینے میں اتار لوں گا۔''

یہ کہتے ہوئے اس نے خنجر کا قبضہ دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا اور انی کو کونیچے اپنے سینے کی طرف کر دیا۔ اس کا بھائی قدرے ہچکچایا، لیکن بازو پھیلا کر اس کی طرف قدم بڑھا کر آیا اور دیر تک اس سے بغل گیر رہا۔ وعدہ کیا کہ اس کی مرضی کے خلاف نہیں کرے گا۔ نیشاپور کی جاں بخشی ہوگئی، لیکن وہ رمضان کے خوفِ عظیم کو کبھی نہیں بھولے گا۔ ☆

افسانے

ادب علی الخصوص فکشن میں خارجی حقائق اور داخلی کوائف کا التباس اس قدر قوی ہوتا ہے کہ اسے انسانی اعمال اور افعال کی نمائندگی کے اظہار کا بنیادی وسیلہ متصور کیا جاتا ہے۔ کہانیوں سے دلچسپی نہ صرف فطرتِ انسانی کا ناگزیر جزو ہے بلکہ قصے، حکایتیں اور افسانے ہماری معاشرتی، تہذیبی اور تخلیقی کائنات کی تشکیل کا ابتدائی اور مستقل حوالہ بھی ہیں۔

_______پروفیسر شافع قدوائی

محمد حمید شاہد

چٹا کا شاخِ اِشتہا کا

اسے قریب نظری کا شاخسانہ کہیے یا کچھ اور کہ بعض کہانیاں لکھنے والے کے آس پاس کلبلا رہی ہوتی ہیں مگر وہ ان ہی جیسی کسی کہانی کو پا لینے کے لیے ماضی کی دھول میں دفن ہو جانے والے قصوں کو کھوجنے میں جتا رہتا ہے۔ تو یوں ہے کہ جن دنوں مجھے پرانی کہانیوں کا ہوکا لگا ہوا تھا' مارکیز کا ننھا منا نیا ناول میرے ہاتھ لگ گیا۔ پہلی بار نہیں' دوسری بار۔ اگر میرے سامنے مارکیز کا یہ مختصر ناول دوسری بار نہ آتا تو شاید میں اپنے پاس مکر مار کر پڑی ہوئی اس جنس میں لتھڑی ہوئی کہانی کو یوں لکھنے نہ بیٹھ گیا ہوتا۔

مارکیز کے ناول کو دوسری بار پڑھنے سے میری مراد میمن کے اس اردو ترجمے سے ہے جو مجھے ترجمے کا معیار آنکنے کے لیے موصول ہوا تھا۔

یہ وہی ناول تھا جس کی خبر آنے کے بعد میں انگریزی کتابوں کی دکانوں کے کئی پھیرے لگا آیا تھا۔ پھر جوں ہی اس کتاب کا انگریزی نسخہ دستیاب ہوا تو میں نے اسے ایک ہی ہلے میں پڑھ ڈالا تھا۔ میں نے اپنے تئیں اس ناول کو پڑھ کر جو نتیجہ نکالا وہ مصنف کے حق میں جاتا تھا نہ اس کتاب کے حق میں۔

خدا لگتی کہوں گا میرا فیصلہ تھا ایک بڑے لکھنے والے نے بڑھاپے میں جنس کے سستے وسیلے سے اس ننھی منی کتاب میں جھک ماری تھی۔

ممکن ہے یہی سبب ہو کہ جب میمن کا ''اپنی بیسواؤں کی یادیں'' کے عنوان سے چھپا ہوا ترجمہ ملا تو میں خود کو اسے فوری طور پر پڑھنے کے لیے تیار نہ کر پایا اور پیپر بیک میں چھپا یہ مختصر سا ناول کہیں رکھ کر بھول گیا۔ گزشتہ دنوں کسی اور کتاب کی تلاش میں' جب کہ میں بہت زیادہ اکتا چکا تھا' یہ ناول اچانک سامنے آ گیا۔ میں نے اپنی مطلوبہ کتاب کی تلاش کو معطل کر کے اکتاہٹ کو پرے دھکیلنا چاہا۔ اسی ناول کو تھامے تھامے اپنے بیڈ تک پہنچا' جسم کو پشت کے بل بستر پر دھپ سے گرنے دیا اور اسے یوں ہی یہاں وہاں سے دیکھنے لگا۔ جب میری نگاہ مارکیز کے ہاں بے باکی سے در آنے والے ان ننگے لفظوں پر پڑی جنہیں مترجم نے ایسے دلچسپ الفاظ میں ڈھال

لیا تھا جو فوری طور پر فحش نہیں لگتے تھے' تو میں نے ناول کو ڈھنگ سے پڑھنا شروع کر دیا۔

ناول کو اس طرح پڑھنے کے دو غیر متوقع نتائج نکلے۔

ایک یہ کہ میں جسے مارکیز کے کھاتے میں جھک مارنا سمجھ بیٹھا تھا اس میں سے میرے لیے معنی کی ایک مختلف جہت نکل آئی اور دوسرا یہ کہ مجھے اپنا کئی کاٹ کر نکل جانے اور پھر بھول جانے والا ایک کردار شکیل رہ رہ کر یاد آنے لگا۔ ایک ناول جس کے مرکزی کردار نے اپنی نوے ویں سالگرہ کی رات ایک باکرہ کے ساتھ گزارنے کا اہتمام کیا' میرے لیے اس میں سے زندگی کے کیا معنی برآمد ہوئے' میں ٹھیک ٹھیک بتانے سے قاصر ہوں۔ ہاں اتنا کہہ سکتا ہوں کہ بارِ دگر پڑھنے پر نہ صرف اس ناول کا جنس کا رسیا مرکزی کردار میرے لیے ایک سطح پر قابل اعتنا ہوا' میں اپنے ایک متروک کردار شکیل کے بارے میں بھی ڈھنگ سے سوچنے پر مجبور ہوا تھا......

اور یہ بات بہ جائے خود کوئی کم اہم بات نہیں تھی۔

شکیل اور مارکیز کے ناول کے مرکزی کردار میں کوئی خاص مشابہت نہیں ہے۔ بتا چکا ہوں کہ وہ نوے برس کا ہے جب کہ میرا شکیل بھرپور جوانی لیے ہوئے ہے۔ وہ مرد مجرد اپنی مثالی بدصورتی کی وجہ سے خاکہ اڑانے والوں کا مرغوب' جب کہ جس شکیل کی میں بات کر رہا ہوں وہ محض نام کا شکیل نہیں ہے اور یہ شادی شدہ اور بال بچے دار ہے۔ تاہم ایک بات دونوں میں مشترک ہے کہ دونوں جنس زدہ ہیں اور شکیل تو اسی جنس زدگی کی وجہ سے دوستوں میں تضحیک کا سامان ہو گیا ہے۔ ایک مدت کے بعد شکیل جیسے کردار کی طرف لوٹنے کا سبب مارکیز کے ناول کے بوڑھے کی وہ جنسی خرمستیاں ہیں جنہیں ناول میں بہت سہولت سے لکھ لیا گیا ہے مگر ہمارے ہاں ایسی حرکتوں کو لکھنا چوں کہ فحاشی کے زمرہ میں آتا ہے لہذا مجھے شکیل کو لکھنے کے لیے بار بار مارکیز کی طرف دیکھنا پڑ رہا ہے۔ ہاں تو میں مارکیز کے بوڑھے کی خرمستیوں کا ذکر کر رہا تھا اور بتانا چاہ رہا تھا کہ اس بوڑھے کی ہوس کاریوں کے باب میں جہاں اس کی اجڈ لارنڈی والی ملازمہ کا ذکر آتا ہے' وہی عقب سے جانے کا' وہیں مجھے اس وقت کے شکیل کا' اس کریانہ اسٹور کے مالک کا شکار بننا یاد آیا جس کے پاس اس شہر میں آکر وہ پہلے پہل ملازم ہوا تھا۔ جہاں ناول کے مرکزی کردار نے اپنے پچاس سال کی عمر کو پہنچنے پر ان پانچ سو چودہ عورتوں کا ذکر کیا ہے جن سے اس کا جنسی تعلق قائم ہوا' اور اس گنتی میں وہ بعدازاں مسلسل اضافہ کیے جا رہا تھا' تو میرے دھیان میں شکیل کی زندگی میں آنے والی وہ چٹپٹی لڑکیاں آ گئیں جن کی وجہ سے وہ شہر بھر میں جنسی بلے کے طور پر مشہور ہوا۔

تاہم جس لڑکی کی وجہ سے شکیل کو نظروں سے گرا ہوا اور بعد میں اسے شہر چھوڑتے ہوئے دکھایا جانا ہے وہ بظاہر ان چٹپٹی لڑکیوں جیسی نہ تھی۔

اوہ ٹھہرے صاحب! مارکیز کے بوڑھے بدصورت کردار کی طرح قابل قبول ہو جانے والے جواں سال شکیل کی کہانی کو یوں شروع نہیں ہونا چاہیے' جیسا کہ میں اسے آغاز دے چکا ہوں۔ اس کردار کو عجلت میں یا یہاں وہاں سے ٹکڑوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ اسے ڈھنگ سے لکھنے سے پہلے مجھے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ

آپ کو میں اپنی اس خفت سے آگاہ کرتا چلوں جو مجھے کسی جنس مارے آدمی سے مل کر اور اس کی لذت میں لتھڑی ہوئی باتیں سن کر لاحق ہو جایا کرتی ہے۔ اسی خفت کا شاخسانہ ہے کہ مجھے اپنا حوالہ جنس مارے کرداروں سے بھی کھلنے لگتا ہے۔ شکیل جیسا کردار میری دسترس میں رہا مگر اسی خفت نے ہمارے درمیان بہت سے رخنے رکھ دیئے تھے۔ حتی کہ میں نے یہ بھی بھلا دیا کہ شروع میں یہ کردار ایسا نہ تھا۔ یہ تو بہت بعد میں ہوا تھا کہ وہ نہ صرف لوگوں کی تضحیک کا سامان بنا' میری نظروں سے بھی گر گیا تھا۔

لیجئے اب مارکیز کے بوڑھے نے مجھے بہلا پھسلا کر اس مردود کہانی کے قریب کر ہی دیا ہے تو میں اسے شکیل سے اپنی پہلی ملاقات سے شروع کرنا چاہوں گا۔

شکیل سے میری پہلی ملاقات کسی تقریب میں ہوئی تھی۔ وہ وہاں دوسرے شاعروں کی طرح اپنی غزل سنانے آیا تھا۔ صاف اور گورا رنگ جو ناک کی پھنگی' کانوں کی لوؤں اور چمک لیے نرم نرم گالوں سے قدرے شہابی ہو گیا تھا۔ مجھے اس کا ٹھہر ٹھہر کر شعر پڑھنا اور پڑھے ہوئے مصرعے کو ایک ادا سے دہرانا اچھا لگا تھا۔ جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ وہ پہاڑیا ہے تو اور بھی اچھا لگا کہ وہ اس کے باوجود نہ صرف ہر مصرع میں ٹھیک ٹھیک لفظ باندھنے کا اہتمام کر لایا تھا ان کی ادائیگی میں بھی کوئی غلطی نہیں کر رہا تھا۔ جو غزل اس نے وہاں سنائی اس نے خوب سلیقے سے کہی تھی۔ اس کی فنی مہارت کا میں یوں قائل ہو گیا تھا کہ ساری غزل ایک روندی ہوئی بحر میں مگر بہت عمدگی سے کہی گئی تھی۔ اس میں ایک دو غیر شاعرانہ اور کھدرے لفظوں کو اتنا ملائم بنا کر رواں مصروں میں پیوست کر دیا گیا تھا کہ اب وہ غزل کے ہی الفاظ لگتے تھے۔ اس سب پر مستزاد یہ کہ وہ لگ بھگ ہر شعر کے مصرع اولی میں اپنے خیال کی کچھ اس طرح تجسیم کر رہا تھا کہ ہر بار لہجہ کے نئے پن کا احساس ہوتا اور ایک ایسا مقدمہ بھی بنتا تھا جس کی طرف سننے والے کا متوجہ ہونا لازم ہو جاتا۔

جب وہ شعر مکمل کر کے سانس لیتا تو بات بھی مکمل ہو جاتی تھی۔

ذرا گماں باندھیے کہ ایک نوخیز شاعر ہے۔ آپ اس سے بالکل نئے لہجے کی غزل سن رہے ہیں۔ ایک ایسا لہجہ' جس میں عصر موجود کا تناظر اس کی اپنی لفظیات کے ساتھ سامنے آ رہا ہے۔ اس غزل میں اس کا اہتمام بھی ہے کہ کوئی لفظ فن پارے کے مجموعی مزاج میں اجنبی نہیں لگتا۔ سلیقہ ایسا کہ ہر لفظ کی ادائیگی کا مخرج ضرورت شعری کی وجہ سے کہیں بھی بدلا نہیں گیا۔ ہر لفظ ٹھیک اپنی نشست پر' اور وہ بھی یوں کہ ایک لفظ کی صوتیات اگلے لفظ کو ٹھوکا دینے کی بجائے اس میں سما کر اس کی اپنی صوتیات میں منقلب ہو جاتیں۔ سچ پوچھیے تو ایسی باریکی سے غزل کہنے والے کا گمان ہی باندھا جا سکتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ میرے سامنے تھا اور پورے قرینے سے غزل کہہ رہا تھا۔

لہذا میں اس کے قریب ہو گیا۔ اتنا قریب کہ ہم دونوں کے درمیان سے سارا حجاب اٹھ گیا۔

جب وہ اسی شہر میں رہ کر خوب خوب داد' بے پناہ حسد اور بہت ساری نفرت اور تضحیک سمیٹ چکا تو بھی میں اس کے قریب رہا۔ پہلے پہل شکیل کے بارے میں شہر کے شاعروں نے یہ شوشا چھوڑا' ہو نہ ہو اسے کوئی لکھ کر

دیتا ہے۔ جب لوگ تجسس سے پوچھنے لگے کہ وہ کون ہے جو اسے لکھ کر دیتا ہوگا؟ تو ایک ایسے بزرگ شاعر کا نام چلا دیا گیا جو کہنے کو شعر خوب سلیقے سے کہتے اور عادت ایسی پائی تھی کہ خوش شکل لونڈوں میں اٹھنے بیٹھنے کو اس گئے گزرے زمانے میں بھی چلن کیے ہوئے تھے۔ کسی کو ایسی باتوں پر یوں یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ حضرت زبان کے روایتی استعمال تک محدود رہتے تھے اور اچھا اور پکا مصرعہ کہنے کے باوجود خیال کو نیا بنا لینے پر قادر نہ تھے۔ ایسا کیوں کر ہوسکتا تھا کہ کوئی خود تو فنی طور پر بے عیب مگر بوسیدگی کا احساس جگانے والا مصرعہ کہنے کو وتیرہ کیے ہو اور اپنے لونڈے کو حرف تازہ سے فیض یاب کرے۔ جب شکیل ایک سے بڑھ کر ایک تازہ غزل لانے لگا تو اس کے خلاف فضا باندھنے والوں کی جیبھیں خود بخود اپنے اپنے تالو سے بندھ گئیں۔ یہی وہ زمانہ تھا جب اس نے اپنے جیسے شاعروں سے آگے نکل کر حاسدین کا گروہ پیدا کر لیا تھا۔ جو لوگ شعر میں اسے مات نہیں دے سکتے' اس کی شخصی کمزوریوں کو اچھال کر تسکین پاتے تھے۔

مجھے شکیل سے یہ شکایت تھی کہ آخر وہ اس باب میں انہیں خوب خوب مسالا کیوں فراہم کر رہا تھا۔ وہ میری بات سنتا اور ڈھٹائی سے ہنسی میں اڑا دیتا تھا۔

وہ بارہ کہوسے پرے پہاڑوں کے ادھر جس گاؤں سے آیا تھا اس کا نام تنگ گلی تھا جو بول چال میں مختصر ہو کر تنگلی ہو گیا تھا۔ جب وہاں اس نے دس جماعتیں پڑھ لیں تو آگے کرنے کو کچھ نہ تھا۔ اس کے باپ کے پاس جو تھوڑی سی موروثی زمین تھی' اسے گزشتہ سال کی مسلسل بارشوں میں لینڈ سلائیڈ کھا گئی تھی۔ میٹرک کر لینے کے بعد اس کے لیے دو ہی راستے تھے۔ باپ کی طرح مری چلا جائے اور وہاں سیزن کھلنے پر ہوٹلوں میں بیرا گیری کرے یا ادھر شہر میں کسی دکان پر سیلز مین ہو جائے' جیسا کہ اس کے گاؤں کے کئی اور لڑکوں نے کیا تھا۔

اس نے دوسرا راستہ اختیار کیا۔

تنگلی کا ایک شخص دل محمد ادھر شہر میں ایک کریانے کے اسٹور پر ملازم تھا۔ وہ بقر عید پر گاؤں آیا تو شکیل کے باپ نے اس سے بات کی۔ اس نے فوری طور پر تو اسے یہ کہہ کر مایوس کر دیا کہ وہاں شہر میں کام کرنے کے خواہش مند لڑکے ہر روز آتے رہتے تھے جو کم اجرت پر کام کرنے کو تیار ہو جاتے لہٰذا شکیل کو وہاں بھیجنا' لڑکے کو ایک لحاظ سے ضائع کرنا ہی ہوگا۔ اس کے باپ نے دل محمد کی نصیحت کو محض ٹالنے کا بہانہ سمجھا۔ وہ اپنے مالک کو بڑا خسیس اور گھٹیا کہہ رہا تھا جو کم اجرت دیتا اور کام زیادہ لیتا تھا۔ یہ سب کچھ درست ہوسکتا تھا مگر دل محمد کے گھر والوں کی گزر بسر ٹھیک ٹھاک ہو رہی تھی لہٰذا اس نے خوب منت سماجت کر کے اسے مجبور کر لیا کہ وہ شکیل کو شہر لے جائے اور اپنے مالک سے ملا دے' آگے رہی اس کی قسمت۔ دل محمد نے جو کہا' وہ جھوٹ نہیں تھا۔ اس کا مالک نام کا گل زادہ تھا' نکلا پورا حرام زادہ۔ اسے دیکھتے ہی اس کی رالیں ٹپکنے لگی تھیں۔

شکیل نے پہلے روز اس کی رالیں نہیں دیکھی تھیں کہ وہ تو اپنی ضرورت اور اپنی مجبوریوں کو دیکھ رہا تھا۔

گل زادہ نے شکیل کی رہائش کا بندوبست دل محمد کے ساتھ دکان کے پچھواڑے میں کرنے کی بجائے

اوپر والے فلیٹ میں اپنے ساتھ کیا تھا۔ اس نے اپنے ساتھ اپنے مالک کو یوں مہربان پایا تو اس کے قریب ہوتا چلا گیا۔ دوسری تنخواہ تک وہ اس پر خوب مہربان رہا اور جب اس بار بھی تنخواہ کی رقم کا منی آڈر گھر بھیج چکا تو ایک رات وہ اس کے بستر میں گھس گیا۔ سردیوں کے دن تھے، پہلے پہل اس کا یوں لحاف میں گھس آنا شکیل کو برا نہ لگا تھا تاہم رفتہ رفتہ شکیل پر اس حرام زادے کی نیت اور وہ خود کھلتے اور اسے بھی کھولتے چلے گئے۔ بعد میں وہ یہ واقعہ اپنے آپ کو اذیت دینے کے لیے قہقہہ لگا کر سنایا کرتا۔

تاہم وہ یہ بھی کہتا تھا کہ وہ جس مشکل میں پڑ گیا تھا اس سے ہمت کر کے نکل آیا تھا۔

جب میں نے شکیل سے اس کا یہ قصہ سنا تھا تو بات ایک قہقہے پر نہیں رکی تھی۔ قہقہے کی آواز ابھی معدوم نہیں ہوئی تھی کہ فوراً بعد اس کے حلقوم میں ہچکیوں کی باڑھ امنڈ پڑی تھی۔ اس نے اپنی اس کیفیت پر قابو پانے کے لیے اپنے نچلے ہونٹ کو دانتوں تلے دے کر کاٹ ہی ڈالا تھا۔ شکیل نے ذرا سنبھلنے کے بعد یہ بھی بتایا تھا کہ اس کا مالک اس پر ایسے میں کھل رہا تھا جب وہ ان سہولتوں کا عادی ہوتا جا رہا تھا جو اس نے گاؤں میں دیکھی تک نہ تھیں۔ اس کے باپ کے پاس بھی ایک معقول رقم پہنچنے لگی تھی۔ اس مختصر سے عرصے میں اس نے اپنے باپ کو اتنی رقم بھیج دی تھی، جتنی اس نے کبھی اپنے باپ کے پاس یکمشت دیکھی ہی نہ تھی۔ اپنے ہی باپ کا کفیل بننے میں اسے لطف آنے لگا تھا۔ یہی لطف تھا کہ جس نے اسے فوری طور پر بے روزگار ہونے کے لیے تیار نہ ہونے دیا۔ بعد میں جب راتیں مسلسل لذت اور کراہت کے بیچ گزرنے لگیں تو اس کا دل شدت سے الٹنے لگا۔ وہ وہاں ٹھہرا رہا، یہاں تک کہ وہ اپنے دل کی گہرائیوں سے اس شخص سے شدید نفرت محسوس کرنے لگا۔ یہ نفرت اتنی شدید تھی کہ ایک رات، جب کہ وہ اوندھا پڑا اس کا انتظار کر رہا تھا، وہ چپکے سے باہر نکل آیا۔

جس روز وہ گل زادہ کے فلیٹ سے باہر نکلا تھا، اس روز اس نے صاف صاف ایک لذیذ سنسناہٹ کو اس کی ریڑھ کی ہڈی سے دمچی کی طرف بہتے ہوئے پایا تھا۔

مارکیز کا ناول دوسری بار پڑھنے کے بعد اب اگر میں اس دن کی بابت سوچوں، جس روز شکیل نے مجھے اپنا یہ قصہ سناتے ہوئے قہقہہ لگایا اور فوراً بعد اپنے دم کو ہچکیوں کا پھندا لگا لیا تھا تو مجھے شکیل کی جگہ مارکیز کے ناول کی وہ باکرہ لڑکی یاد آ جاتی ہے جسے نوے سالہ بوڑھے نے دیلگد ینہ کا نام دیا تھا۔ دیلگد ینہ، جو پانچ دسمبر کو محض پندرہ سال کی ہو رہی تھی مگر جسے اپنے گھر کے اخراجات چلانے کے لیے شہر سے باہر دن میں دو بار بٹن ٹانکنے جانا پڑتا تھا۔ اس لڑکی کو ایک دن میں جب سوئی اور انگشتانے سے سو سو بٹن ٹانکنا پڑتے تو وہ ادھ موئی ہو جاتی۔ دیلگد ینہ اور شکیل کو میں ایک ساتھ یوں دیکھ رہا ہوں کہ دن بھر اپنے مالک گل زادہ کا کریانہ بیچتے اور گاہکوں کے نہ ٹوٹنے والے رش سے نبٹتے نبٹتے شکیل بھی بالکل اس لڑکی کی طرح ادھ موا ہو جاتا تھا۔ تاہم ان دونوں کو کہانی کے اس مرحلہ پر ایک جیسی مشقت میں پڑا دکھانے کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ یہ دونوں کہانی کے باقی مراحل میں بھی ایک جیسے ہوں گے۔ شکیل، جو اپنے مالک کی دمچی میں سنسناہٹ چھوڑ کر نکل آیا تھا، بعد میں بہت خوار ہوا۔ تاہم ایک روز آیا کہ ایک

دوسرے شخص نے نہ صرف اسے اپنے ہاں ملازمت دی' اس کے نکاح میں اپنی بیٹی صفیہ بھی دے دی تھی۔

شکیل ملازمت کے لیے آیا اور گھر داماد ہو گیا تھا۔

وہ خوب رو تھا اور سلجھا ہوا بھی۔ ہمت کی بھی اس میں کمی نہ تھی۔ وہ ضرورت مند تھا اور ایک لحاظ سے دیکھیں تو شرف اللہ بھی ضرورت مند تھا اس کی بیٹی کنواری رہ گئی تھی۔ یہ ایسی ضرورت تھی جس کے لیے شکیل کی کسی بھی ضرورت کو پورا کیا جاسکتا تھا۔ لہذا اس نئے گھر میں اس اس کے بارے میں بھی ویسا ہی سوچا جانے لگا جیسا کہ ایک بیٹے کے بارے میں سوچا جاسکتا تھا۔ صفیہ' شرف اللہ کی اکلوتی اولاد تھی۔ اس کے پاس جو کچھ تھا اسی کا تھا۔ دونوں کے بہتر مستقبل کے لیے ضروری سمجھا گیا کہ شکیل کالج میں داخلہ لے لے۔ سال بھر کی ملازمت اور خواری کے بعد شکیل فوری طور پر مزید پڑھنے کی طرف راغب نہ ہو پایا۔ جب اسی کی بیوی نے ایک شفیق ماں کی طرح اس کا حوصلہ بڑھایا اور سسر نے یقین دلایا کہ تعلیم پر اٹھنے والے سارے اخراجات وہ خود اٹھائیں گے تو اس نے کالج میں داخلہ لے لیا۔

یہیں وہ شاعری کی طرف راغب ہوا تھا۔

جن دنوں میں شکیل کی طرف متوجہ ہوا اس نے ایم اے کر لیا تھا اور ایک غیر سرکاری کالج سے وابستہ تھا۔ شام کو وہ اسی کالج میں چلنے والی اکیڈمی میں پڑھا کر خوب کما بھی رہا تھا تاہم اس بارے میں مطمئن نہ تھا اور کچھ نیا کرنے کی بابت مسلسل سوچا کرتا۔ ان دنوں اس شہر میں پراپرٹی کا کاروبار بہت عروج پر تھا۔ اس نے دو ایک ایسے سودے کمیشن کی بجائے ٹاپ یعنی پلاٹ نقد اٹھا کر بیچنے کی بنیاد پر کئے۔ ان سودوں نے اسے اتنا مارجن دیا کہ وہ یکسوئی سے اس کاروبار میں جت گیا۔ پھر تو ٹاپے پر ٹاپا اترنے لگا اور اس کے حالات بدلتے چلے گئے۔

اس کے حالات ہی نہیں بدلے وہ خود بھی بدلتا چلا گیا۔

شہر بھر کے ان شاعروں نے سکھ کا سانس لیا جو مشاعروں میں اس کی ساری توجہ سمیٹ لینے پر اس سے نالاں رہتے تھے کہ اب وہ ادھر آتا ہی نہیں تھا۔ ایسا نہیں ہوا کہ اس نے تقاریب میں آنا یک دم موقوف کر دیا تھا۔ پہلے پہل اس میں تعطل کے وقفے پڑے۔ پھر جب کبھی وہ آتا تو مجھے بھی ساتھ اچک کر باہر لے جاتا کہ اسے سننے سنانے سے کوئی دلچسپی نہ رہی تھی۔ گاڑیاں بدلنا اس کا معمول ہوتا جارہا تھا کہ اس کاروبار میں بھی اس نے اچھی خاصی سرمایہ کاری کر رکھی تھی۔

یہ بدلا ہوا شکیل دیکھ کر میں اس شکیل کی بابت سوچنے لگتا تھا جسے پہاڑوں سے آتے ہی مجبور پا کر گل زادہ نے پچھاڑ لیا تھا۔

شروع شروع میں' میں سمجھتا رہا تھا کہ وہ سے شادی کر کے مطمئن ہو گیا تھا۔ اس کی زندگی میں جس طرح آسائشیں آرہی تھی ان کے جھانسے میں وہ خود بھی ایک مدت تک یوں ہی سمجھتا رہا تھا۔ اس عورت کے بطن سے اس نے ایک بیٹا اور دو بیٹیاں پیدا کیں۔ بقول اس کے اسے اپنے بچوں سے بہت محبت تھی۔ یہ بعد کی بات

ہے کہ اس نے گاڑیاں اور لڑکیاں بدلنا مشغلہ بنالیا تھا۔ان دنوں اس نے نہ صرف کا بلکہ ان تینوں بچوں کا ذکر بھی چھوڑ دیا تھا۔ میں نے کہا نا کہ میں شکیل کے بہت قریب تھا۔ یہ بھی بتا دوں کہ اس کے بیوی بچے مجھ سے بہت مانوس تھے تاہم کہتا چلوں کہ جس تیزی سے وہ ان سے دور ہوا تھا' میں بھی انہیں ملنے سے کترانے لگا تھا۔ میں نے اندازہ لگالیا تھا کہ وہ شکیل کے سب لچھن جان گئے ہوں گے۔ میں نے ان کے سامنے جاتا تو ممکن تھا کہ اس حوالے سے بات چھیڑ کر میری مدد مانگ لیتی ۔ میں جانتا تھا جس لذت کی دلدل میں وہ اتر چکا تھا کوئی بھی اسے نکال نہیں سکتا تھا۔حتیٰ کہ میں بھی۔ میں نے اپنے تئیں ایک آدھ بار بچوں اور کا ذکر کر کے اسے اس دلدل سے نکالنا چاہا تھا۔ بچوں کے نام پر تو وہ چپ ہو گیا مگر کا ذکر آتے ہی اس نے ویسا ہی قہقہہ لگایا جیسا کہ وہ گل زادہ کا نام آنے پر لگایا کرتا تھا۔

گل زادہ اور میں اگر کوئی مشابہت ہوسکتی تھی تو وہ دونوں کا بھاری بھرکم وجود تھا جو تھل تھل کرتا تھا۔

ایک اور بات جو مجھے ہمیشہ الجھن میں ڈالتی رہی ہے وہ شکیل کا کے ذکر پر عجب طرح کا قہقہہ لگانا تھا' ایسا قہقہہ کہ بات محض اس مشابہت تک محدود نہ رہتی تھی۔

وہ شکیل سے عمر میں نو دس سال بڑی ہوگی۔ بچوں کی پیدائش کے بعد تو وہ اس کے مقابلے میں کہیں بوڑھی دکھائی دیتی تھی۔تاہم وہ اس کے بچوں کی ماں تھی اور اس کا یوں اس کی توہین کرنا مجھے بہت کھلتا۔ جس روز وہ ایک قیمتی گاڑی پر آ کر مجھے تقریب سے اٹھا کر ایک ہوٹل لے گیا تھا' اس نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ اس کی عمر کے آدمی کے لیے ایک جوان عورت کے وجود کی کیا اہمیت تھی۔ اسی روز اس نے اپنے موبائل کے قدرے زیادہ پکسل والے کیمرے سے لے گئی پانچ مختلف لڑکیوں کی تصاویر دکھائی تھیں جن میں سے ایک تصویر تو ایسی تھی جس میں وہ خود بھی موجود تھا۔ موبائل کا ڈسپلے بڑا' اور تصویریں خوب شوخ' شفاف اور روشن تھیں۔ جس تصویر میں وہ خود موجود تھا' اس کے آگے کو جھکے ہوئے دائیں کندھے سے میں نے اندازہ لگایا کہ اسی سمت کے بازو کو آگے بڑھا کر یہ تصویر اس نے اپنے موبائل سے خود کھینچی تھی۔ اس کے ساتھ ایک ایسی لڑکی تھی جس کی عمر ہو نہ ہو اس کی اپنی بڑی بیٹی سونیا جتنی تھی۔ لڑکی اور وہ خود بھی جہاں تک تصویر میں نظر آرہے تھے لباس کی تہمت سے پاک تھے۔ اگر چہ تصویر میں سے لذت ابلی پڑ رہی تھی مگر سونیا سے اس تصویر والی لڑکی کی مشابہت قائم کرتے ہوئے میں سارا مزا کرکرا کر بیٹھا تھا۔

مجھے سونیا سے اس لڑکی کا موازنہ نہیں کرنا چاہیے تھا جس کے ساتھ بقول شکیل کے اس نے نوٹوں میں تولنے کے بعد ایک رات کی رفاقت پائی تھی۔

ماننا پڑے گا کہ مارکیز کی کہانی کا بوڑھا عورتوں کی گنتی کے بارے میں کہیں آگے تھا۔ تاہم یہ بھی تسلیم کرنا ہوگا کہ ان عورتوں پر خرچ کے معاملے میں (اگر فی کس عورت کے حساب سے خرچ کا تخمینہ لگایا جائے تو) شکیل کا کوئی مقابلہ نہ تھا۔ یہ بھی بجا کہ مارکیز کا بوڑھا صحافی' جسے چکلہ چلانے والی روسا کبرکس ''اے میرے اسکالر'' کہہ کر مخاطب کرتی تھی' جس عورت سے بھی (اس ناول کے ترجمہ کار کی اصطلاح میں جفتی کا) تعلق بنانا

چاہتا' اسے معاوضہ ضرور ادا کیا کرتا تھا' لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ وہ تھا پرلے درجے کا کنجوس۔ اگر آپ نے یہ ناول مکمل طور پر پڑھ رکھا ہے تو آپ کی نظر میں اسی مرکزی کردار کا اعترافی بیان ضرور گزرا ہو گا جس کے مطابق وہ بخیل آدمی تھا۔ اس مقام پر پہنچ کر تو ہو نہ ہو آپ کی ہنسی ضرور خطا ہو گئی ہو گی جہاں اس جنس زدہ بوڑھے نے اپنی نوے ویں سالگرہ کی رات ایک باکرہ کے ساتھ گزارنے کے لیے خرچ کا حساب چودہ پیسو لگایا تھا۔ یعنی اخبار سے ملنے والے پورے ایک ماہ کی کالم نویسی کے معاوضے کے برابر۔ پھر جس طرح اس بوڑھے نے پلنگ کے نیچے کے مخفی خانوں سے عین حساب کے مطابق ریزگاری نکالی تھی' دو پیسو کمرے کا کرایہ' چار مالکہ کے لیے' تین لڑکی کے واسطے' پانچ رات کے کھانے اور اوپر کے خرچے کے لیے' سچ پوچھیں تو یہ پڑھ کر میری ناف سے ہنسی کا گولا اٹھا اور میرے جبڑوں کو اتنا دور اچھال گیا تھا کہ وہ بہت دیر بعد واپس اپنی جگہ پر آ پائے تھے۔ میری کہانی کا شکیل ان لوگوں میں سے نہیں تھا جو اس معاملے میں بھی گن گن کر خرچ کرتے ہیں۔ یہ جو اس نے لڑکی کو نوٹوں میں تولنے کی بات کی تھی تو اس سے قطعاً اس کی یہ مراد نہیں تھی کہ اسے اپنا بہت سا روپیہ خرچ ہو جانے کا احساس تھا۔

وہ تو اس لڑکی کے دام بالا بتا کر اس کی قدر و قیمت کا احساس دلانا چاہتا تھا۔

''اپنی سوگوار بیسواؤں کی یادیں'' نامی کتاب میں عین وہاں سے کہانی جنس کا چلن چھوڑ کر محبت ڈگر پر ہو لیتی ہے جہاں یہ بتایا گیا ہے کہ قحبہ خانے کے ایک اہم گاہک کو پویلین کے پہلے کمرے میں کوئی چاقو مار کر قتل کرنے کے بعد فرار ہو گیا تھا۔ کہانی کے بوڑھے اسکالر نے جب خون سے لت پت بستر پر ابلے ہوئے مرغ کی طرح پیلے ہو جانے والے اس لحیم شحیم آدمی کی لاش کو پڑے دیکھا تھا تو اس کے جسم پر کپڑے کی ایک دھجی نہ تھی۔ کہانی کا یہ حصہ پڑھ کر پہلے تو میرے وجود میں سنسنی دوڑی مگر جب یہ بتایا گیا کہ اس ننگی لاش نے جوتے پہن رکھے تھے تو میری ایک بار پھر ہنسی چھوٹ گئی تھی۔ مارکیز نے کہانی کے اس حصے میں جنس کا میٹھا اس مردے پر مل کر اسے لذیذ بناتے ہوئے بتایا ہے کہ مقتول کا جسم ابھی اکڑا نہیں تھا۔ اس کی گردن پر ہونٹ کی شکل کے دو زخم تھے اور یہ کہ موت کے باعث اس کے سکڑے ہوئے عضو پر ایک کونڈم ہنوز چڑھا ہوا تھا۔ کہانی لکھنے والے نے یہ وضاحت کرنا بھی ضروری جانا ہے کہ کونڈم غیر استعمال شدہ دکھائی دے رہا تھا۔

یہاں مجھے مترجم سے اپنی ایک شکایت ریکارڈ پر لانی ہے اور اسے داد بھی دینی ہے۔ شکایت کا یہ موقع وہاں وہاں نکلتا رہا ہے جہاں اس نے اردو جملوں کو بھی ترجمہ کیے جانے والے متن کے قریب رکھ کر انہیں پیچیدہ بنا دیا۔ ناول کے نام کے ساتھ بھی یہی رویہ روا رکھا گیا ہے جب کہ اسے تھوڑا سا بدل کر رواں کرنے کے لیے ''اپنی بیسواؤں کی یادیں'' کر دیا جاتا تو زیادہ مناسب ہوتا۔ اور اب مجھے برملا اس جرات اور سلیقے کی داد دینی ہے جس کو روبہ عمل لا کر اس نے ان لفظوں کا ترجمہ کر لیا ہے جو بالعموم ہمارے ہاں شائستگی کے تقاضے کے پیش نظر زبان پر نہیں لائے جاتے ہیں۔ تاہم اسے کا کیا کیجئے کہ کونڈم کا ترجمہ کرنا اس نے ضروری نہیں سمجھا۔

شاید اس لفظ کا ترجمہ کرنا اس کے بس میں تھا ہی نہیں۔

یہاں شکیل سے متعلق دو واقعات کہانی میں گھسنے کو بے تاب ہیں ۔مزے کی بات یہ ہے کہ پہلا واقعہ خود بخود آگے چل کر دوسرے واقعے سے جڑ جاتا ہے ۔پہلے واقعہ کا تعلق ان دنوں سے ہے جن دنوں اس کے اسکول کے ہیڈ ماسٹر صاحب نے مڈل اسٹنڈرڈ امتحان کی تیاری کے لیے یونین کونسل مسیاڑی کے دفتر میں اضافی پڑھائی کا اہتمام کیا تھا۔امتحانوں تک اسے اور اس کے ہم جماعتوں کو وہیں رہنا' پڑھنا اور رات گئے وہیں سونا تھا۔ یہ قصہ شکیل بہت مزے لے لے کر اور خوب کھینچ تان کر سنایا کرتا مگر مختصراً یوں ہے کہ جب ماسٹر صاحب چلے جاتے اور دن بھر پڑھ پڑھ کر اکتائے ہوئے لڑکوں کو کچھ نہ سوجھتا' تو وہ ملحقہ کمرے میں منصوبہ بندی والی دواؤں کے ساتھ پڑے ہوئے چمکیلے لفافوں میں بند سفید غبارے چوری کر کے خوب پھلایا کرتے تھے۔ یہ غبارے اگرچہ اس طرح رنگین نہ تھے جیسے تنگلی میں سودے کی ہٹی پر ملتے تھے مگر ان میں ایک ایسی خوبی تھی جو ان رنگین غباروں میں بھی نہ تھی کہ یہ ہوا بھرنے پر بہت پھولتے تھے۔ وہ سب اس پر خوش تھے کہ ان کے ہاتھ بہت سے چٹے خمور غبارے لگ گئے تھے اور رات گئے ان میں اس پر مقابلہ لگا رہتا تھا کہ کون انہیں سب سے زیادہ پھلائے گا۔شکیل کے مطابق ان دنوں ان غباروں پر سفید رنگ کا سفوف ملا ہوتا تھا جس سے ان کے ہونٹ اور گال یوں ہو جاتے تھے جیسے ان پر آٹا مل دیا گیا ہو۔ اسی سفیدی نے ان کی شرارتوں کا پول ہیڈ ماسٹر صاحب پر کھول دیا تھا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب کو پہلے تو غصہ آیا پھر کچھ سوچتے ہوئے ہنس پڑے اور کہا'' نامعقولو! یہ ناپاک ہوتے ہیں کہ اس میں بیمار پیشاب کرتے ہیں۔''

اگلے روز ساتھ والے کمرے پر تالا نہ پڑ گیا ہوتا تو وہ ضرور تجربہ کرتے کہ ان غباروں کو بیمار کیسے استعمال کرتے تھے کہ ہیڈ ماسٹر صاحب کی بات انہیں مزید الجھا گئی تھی۔

اسی شکیل نے' کہ جسے ہیڈ ماسٹر صاحب نے ایک زمانے میں الجھا دیا تھا' اب اس الجھن سے پوری طرح نکل آیا تھا۔اس نے مجھے لگ بھگ ویسے ہی کھلے منہ والے غبارے کی اپنے موبائل کے قدرے زیادہ پکسل والے کیمرے سے کھینچی ہوئی تصویر تب دکھائی تھی جب میں اجلاس سے اٹھ کر اس کے ساتھ ہوٹل آ گیا تھا اور جب وہ اپنی دوست لڑکیوں کی پانچوں تصویریں دکھا چکا تھا۔ مجھے اس کا سنایا ہوا اوپر والا واقعہ عین اس موقعے پر یوں یاد آیا تھا کہ تصویر میں بھی لگ بھگ ویسا ہی غبارہ تھا۔تصویر والا غبارہ بالکل سفید نہ تھا' ایسی جلد کی رنگت لیے ہوئے تھا جس میں چمک بھی آ گئی تھی۔ میں نے کراہت کو اپنے حلقوم تک آتے پا کر اس کا موبائیل اسے لوٹانا چاہا تو نہ چاہتے ہوئے بھی پھسلتی ہوئی ایک نظر اس غبارے پر ڈال لی۔ مجھے صاف دِکھ رہا تھا کہ اس میں کسی بیمار نے پیشاب تو نہ کیا تھا تاہم کچھ تھا جس سے وہ ذرا سا پھول کر ایک طرف کو ڈھلک گیا تھا۔ پھر یوں ہوا کہ رفتہ رفتہ وہ ساری لڑکیاں جن کی اس نے تصویریں بنا رکھی تھیں یا ان جیسی دوسری لڑکیاں جو کیمرے والا موبائل دیکھتے ہی بدک جاتی تھیں' ایک ایک کر کے اس کی زندگی سے نکل گئیں اور ان سب کی جگہ عاتکہ لے لی تھی۔

بتایا جا چکا ہے کہ مارکیز کے لذت مارے بوڑھے کی دیلگد ینہ پانچ دسمبر کو پندرہ برس کی ہوئی تھی اور کہانی میں جب سالگرہ والی رات آتی ہے تو بوڑھے اسکالر کی حرکتیں پڑھ کر گمان سا ہونے لگتا ہے کہ جیسے اسے اس

لڑکی سے محبت ہوگئی ہوگی مگر واقعہ یہ ہے کہ وہ اسے پورا گانا سنا کر اور پورے بدن پر بوسے دے کر ایک بے قابو مہک جگانا چاہتا تھا۔

اس روز وہ اس بے قابو مہک کو جگا کر اور خوب تھک کر وہ سو گیا تھا۔

اس کی محبت تو تب جاگی تھی جب قتل والی رات کے بعد دیلگد ینہ اور اس کا ملنا ایک عرصے تک ممکن نہ رہا تھا۔ اس کے بعد کے صفحات بوڑھے اسکالر کی اس لڑکی کی محبت میں تڑپ کا احوال سمیٹے ہوئے ہیں۔ شکیل کی کہانی میں عاتکہ لگ بھگ اسی طرح کی تڑپا دینے والی محبت کے لیے موزوں ٹھہرتی ہے جس طرح کی محبت مارکیز کے مرکزی کردار کو اس پندرہ سالہ لڑکی سے تھی' تاہم اتنی ساری مشابہتوں کے باوجود شکیل کی کہانی بہت مختلف ہو جاتی ہے۔

عاتکہ کو لے کر شکیل نے یہ شہر چھوڑ دیا تو مجھے اس کی اس حرکت پر شدید صدمہ پہنچا۔

جس خاندان نے اس شخص کو شہر میں آسرا دیا' اس خاندان سے اس نے وفا نہ کی تھی۔ شکیل سے قربت کی وجہ سے میں جانتا ہوں کہ نے اپنی ذات مٹا کر اس کی خدمت اور محافظت کی تھی۔ جس طرح مائیں اپنی اولاد کے عیب چھپا کر اور ان کی خطاؤں کو بھول کر انہیں اپنی محبت کی چادر سے باہر نہیں نکالتیں بالکل اسی طرح کی مسلسل اور بے ریا محبت اسے سے ملی تھی۔ جب کئی روز بعد شکیل کے یوں شہر چھوڑنے کی خبر ملی تو میں بھابی کا دکھ بانٹنے اس کے گھر پہنچ گیا اس خدشے کے باوجود کہ مجھے وہ جا کر اپنے دوست کے حوالے سے ناحق خجالت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ وہاں پہنچ کر مجھے اندازہ ہوا کہ شکیل کی ساری حرکتوں کا اندازہ کو تھا۔ دونوں بچیاں مجھے دیکھتے ہی دھاڑیں مار مار کر رونے لگ گئیں تاہم یوں حوصلے میں تھی جیسے وہ شکیل سے جدائی اور بے وفائی کا وار سہہ گئی تھی۔

میں نے اندازہ لگایا کہ ہونہ ہو اس کا سبب کچھ اور تھا۔

شاید دونوں کی عمر کا وہ تفاوت جس نے عین آغاز ہی سے دونوں کے بیچ شدید اور تند جذبوں والا تعلق قائم نہ ہونے دیا تھا۔ تاہم وہ پریشان تھی' اتنا کہ جتنا کوئی اپنی بے انتہا قیمتی شے کے کھو جانے پر پریشان ہو سکتا تھا۔ اب ماں کے پیار والا سارا احساس مجھے تب محسوس ہوا تھا جب اس نے اپنے بیٹے شہباز کو دیکھا تھا۔ شہباز لگ بھگ اس عمر کو پہنچ گیا تھا جس عمر میں شکیل اس شہر آیا تھا۔ جب اس کی ماں نے یہ بتایا کہ شہباز نے کالج جانا چھوڑ دیا تھا اور کسی دکان پر کام کر کے اس گھر کی ذمہ داریاں سنبھال لی تھیں تو میں نے دیکھا شکیل کے دل گرفتہ بیٹے کا چہرہ غصے سے تمتمانے لگا تھا اور اس نے اپنی مٹھیاں اور ہونٹ سختی سے بھینچ لیے تھے۔

مارکیز نے آخری پیراگراف لکھتے ہوئے بوڑھے اسکالر کے گھر کے باورچی خانے میں دیلگد ینہ کو اپنی پوری آواز سے گاتا دکھا کر اپنی کہانی کو رومانوی جہت دے دی تھی۔ مگر میری اس کہانی کا المیہ یہ ہے کہ اپنے خاتمے پر اس سے سارا رومان اور ساری لذت منہا ہو گئی ہے۔ شکیل اپنے ساتھ بھاگ جانے والی لڑکی سے بھی اوب چکا ہے۔ جس عمر میں اسے یہ سیکھنا تھا کہ شدید اور الہڑ جذبوں کو طول کیسے دیا جاتا ہے وہ سدھائے ہوئے جذبوں سے

نبٹتا رہا تھا۔ وہ واپس آیا تو سیدھا گھر نہیں گیا میرے پاس آیا شاید وہ اپنے گھر کی دہلیز ایک ہی ہلے میں پار کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتا تھا۔ میں اسے رات بھر حوصلہ دیتا رہا اور سمجھاتا رہا کہ اس کے بیوی بچوں کو اس کی ضرورت تھی اور یہ کہ اس کے اپنے گھر میں اس کا انتظار ہو رہا تھا مگر اگلے روز جب میں اس کے ساتھ اس کے گھر گیا تو اس کے بیٹے نے اس پر پستول تان لیا تھا۔ نے واقعی اپنے شکیل کو معاف کر دیا تھا تب ہی تو اس نے یوں پستول تاننے پر اپنے بیٹے کی چھاتی پیٹ ڈالی تھی۔ شہباز نڈھال ہو کر دہلیز پر ہی بیٹھ گیا۔ نے اس کی طرف دیکھے بغیر اسے الانگھا اور اپنے شوہر کی طرف لپکی۔ دہلیز پر بیٹھے نوجوان کے ہاتھ میں جنبش ہوئی اور اگلے ہی لمحہ گولی چلنے کی آواز کے ساتھ ایک کربناک چیخ میرا وجود چیر گئی تھی۔☆

بڑی زبان کا زندہ رسالہ

ذہنِ جدید

مرتب: زبیر رضوی

C2, AB Complex, 179/8, Zakir Nagar, New Delhi - 110025

آزادی کے بعد اسٹیج ہونے والے اردو ڈراموں کی چار اہم کلیات شائع ہو گئی ہیں جن میں فل لینتھ اسٹیج ہوئے 47 ڈراموں کے Text شامل ہیں۔ منتخب اسٹیج ڈراموں کی ان کلیات کو اپنے طویل دیباچوں کے ساتھ **زبیر رضوی** نے مرتب کر کے اردو دنیا کو یہ بتا دیا ہے کہ اردو ڈراما نگار اپنی پوری تخلیقی توانائی کے ساتھ ڈراما لکھ رہا ہے، اسے اسٹیج کر رہا ہے۔

☆ **اردو ڈرامے کا سفر** (آزادی کے بعد)

ناشر: نیشنل بک ٹرسٹ، نئی دہلی

☆ **تماشا میرے آگے** (غالب پر لکھے ڈرامے)

ناشر: غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی

☆ **اردو اسٹیج ڈرامے** (انتخاب)

☆ **یک بابی ڈرامے** (انتخاب)

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو، نئی دہلی

لحاف والی لڑکی

(عصمت چغتائی کی کہانی لحاف کے نام)

عصمت چغتائی کا نام تو سنا ہی ہوگا؟ پھر آپ عصمت چغتائی کے لحاف سے بھی بخوبی واقف ہوں گے۔ ارے وہی لحاف، جہاں دیوار پر ہاتھی جھول رہا تھا اور لڑکی غڑاپ سے لحاف کے اندر ہوگئی تھی۔

وہ لحاف سے نکلی ہوئی وہی لڑکی تھی۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ لحاف میں غڑاپ ہونے کا یہ انداز اسے پسند نہیں آیا تھا۔ وہ دیر تک اپنے ہونے اور نہ ہونے کے احساس سے گزرتی رہی — جیسے، سب سے پہلے تو یہی ناگوار سا احساس، کہ وہ لحاف میں گئی ہی کیوں؟ نہ جاتی تو کون سا چاچا چاچا بڑے آ کر لے جاتے......

لیکن اس بات کا بھی سیدھا سا جواب اس کے پاس موجود تھا۔ نہیں جاتی تو کام سے نکال دی جاتی۔

بڑے لوگوں کے پاس اُترن پہننے والیوں کی کمی تھوڑے ہی ہوتی ہے۔ اور اُسے تو پہلے ہی یہاں کے سارے اصول اور قاعدے بتا دیئے گئے تھے — 'یہ لوگ جو کہیں، بس کرتے جانا ہے۔ جو بھی......اس لفظ پر زور دیا گیا تھا — 'نا' کہنے کا سوال ہی نہیں۔ اس اعتبار سے لحاف کے اندر جانا اس کو دیئے گئے گھریلو کاموں کا ہی ایک حصہ تھا۔ وہ سب کچھ دیکھ اور سن چکی تھی۔ بڑے میاں کو لونڈوں سے فرصت نہیں تھی اور بیگم صاحبہ اپنی جان لیوا تنہائی سے پریشان — اور اس رات — جب پہلی بار لحاف کو اٹھتے دیکھ کر وہ ڈر گئی تھی......اوئی ماں......لحاف میں عجب عجب صورتیں بن رہی تھیں — اور — نوجوانی کا یہ تجسس کب اسے لحاف کے اندر لے آیا، اسے پتہ بھی نہ چلا — مگر لحاف کے اندر جو کچھ بھی ہوا، اب اسے اُبکائی آ رہی تھی — یا وہ اپنے ہی احساس کے موذی کیڑوں سے زخمی ہو چکی تھی — اُف — لحاف کے اندر کی دنیا کتنی خوفناک تھی — کیسا بھیانک سنّاٹا — اور سناٹے میں رینگتے ہوئے سانپ جیسے اس کے نوخیز جسم کا زہر چوس رہے تھے — ایک لمحے کے لیے جسم گم تھا۔ اور جسم کی جگہ ہزاروں سانپ جاگ گئے تھے۔ پھنکارتے ہوئے سانپ...... اپنی زہریلی زبانوں سے اس کے جسم کو نیلا کرتے ہوئے — لیکن وہ کرتی بھی تو کیا کرتی۔ خود کو مجبور اور اپاہج محسوس کر رہی تھی۔ جیسے حویلی کے باہر مٹی کی کوٹھری میں

بندھی ہوئی گائیں— لیکن وہ ان معصوم اور بے زبان گایوں سے بھی اپنی برابری نہیں کرسکتی تھی۔اس کے پاس سینگ ہی کہاں تھی، جو منہ سے آواز بھی نکالتی— وہ ایک ایسی پالتو خادمہ تھی' جو بیگم صاحبہ کے پاؤں دبانے کے ساتھ ہی لحاف کے اندر کے گھپ اندھیرے کو دیکھ آئی تھی—

— کتنا اندھیرا تھا......؟

ہاں

—اور آوازیں......؟

ہاں

— آوازیں،ٹھنڈ کے موسم میں،جنگل میں چیختے بھیڑیوں کی آوازیں بھی شامل تھیں......'

پتہ نہیں

—لحاف میں بیگم صاحبہ کے جسم کے علاوہ بھی کچھ تھا......؟

ہاں

—خرگوش کی طرح پھدکتا ہوا......؟

ہاں

—اور گرگٹ کی طرح لہولہان کرنے والا احساس......؟

ہاں

—تم منع بھی کرسکتی تھی......؟

نہیں

—لحاف کے اندر جھانکنے کے تجسس کو روک نہیں پائی......؟

پتہ نہیں

—بیگم صاحبہ کے نرم گرم لحاف میں ہاتھی کو اچھلتے پھدکتے دیکھنے کی خواہش تھی نا......؟

پتہ نہیں۔

وہ بے حد کمزور لفظوں کے ساتھ خود سے جنگ کر رہی تھی—اور جیسے تصور کے پردے میں کتنی ہی بار، اس کے اندر ایک خواہش نے سر اٹھانا شروع کیا تھا....لحاف کو چھو کر دیکھوں؟ یہ لحاف اتنی شکلیں کیوں بدلتا ہے رات میں...؟اور لحاف کے اندر نرم، پھدکتے خرگوشوں کو دیکھنے کی یہ خواہش اسے اندر کی خوفناک دنیا میں لے گئی تھی— لیکن تب اسے کیا پتہ تھا، کہ یہ نرم، پھدکتے خرگوش تو کب کے لحاف کی اندھیری سلطنت سے باہر نکالے جا چکے ہیں....

اور یہیں وہ حادثہ ہو گیا، جب یکا یک وہ بیگم صاحبہ کے ساتھ لحاف میں 'غڑ اپ' ہو گئی تھی۔

••

رات ہوگئی تھی۔

امّاں کو حیرانی تھی — لحاف سے باہر آنے کے بعد بیٹا کے تیور بدلے ہوئے تھے۔ یہاں کی میلی، بدنما دیواروں پر بھی لحاف سے برآمد ہاتھی ڈول رہے تھے — اس نے تیزی سے اپنی دونوں روشن آنکھوں کو ہتھیلیوں سے چھپالیا — لیکن یہ کیا — ؟ جیسے لحاف آہستہ آہستہ کھل رہا تھا — اوراس کے دھاگے ایک ایک کر کے اس کے جسم سے لپٹتے جا رہے تھے — اماں کی آنکھیں مسلسل اسے دیکھے جا رہی تھیں۔ ایک لمحے کو محسوس ہوا، اماں کو بھی لحاف سے نکلے دھاگوں نے اپنی قید میں لے لیا ہو......

— ’تم جاتی تو ہوگی بیگم صاحبہ کے پاس؟ اماں بیٹی کے معصوم سوالوں کی زد میں تھیں۔

ہاں

— پاؤں دباتی ہوگی......؟

یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے......

بیٹی اب غور سے اماں کو دیکھ رہی تھی —

— سردی کے دنوں میں بھی جاتی ہوگی؟ جب لحاف میں الگ الگ طرح کی شکلیں ابھرتی ہیں......؟

تجھ پر پری یا جن کا سایہ تو نہیں ہو گیا — ہائے اللہ یہ کیا بولے جا رہی ہے......

— غصہ مت کرو۔ جو پوچھوں وہی بتاؤ۔ وہاں تم نے دیوار پر ہاتھ دیکھا کیا — ؟

باولی ہوگئی ہے۔ اب دیوار پر ہاتھی کہاں سے آئے گا؟ اماں کی چیخ نکل گئی۔

— دیوار پر ہاتھی تھے — بلکہ دو دو ہاتھی — بیٹی کی آنکھیں خلاء میں دیکھ رہی تھیں، جہاں بیگم صاحبہ کے ساتھ اماں بھی تھیں۔ لحاف کی اندھیری سلطنت میں —

— تم کیوں جاتی تھی بیگم صاحبہ کے پاس......؟ بیٹی نے پلٹ کر پوچھا۔

لو، اس کی سنو — ڈیوڑھی سے ہمارا رزق جڑا ہے۔ اس لیے۔

— رزق میں پاؤں دبانا بھی لکھا ہے — ؟

ہاں

— تم اس روایت کو توڑ نہیں سکتی تھی......؟

کوئی نہیں توڑ سکتا۔

— کیوں؟

کیونکہ بڑے لوگ قاعدے قانون توڑنے کے لیے نہیں بناتے۔

لڑکی مطمئن تھی۔ روایت ٹوٹنے کے لیے ہی ہوتی ہے۔ اور ایسا سوچتے ہی اس نے لحاف کے، جسم

سے لپٹے دھاگوں کو ایک ایک کر کے کھولنا شروع کر دیا تھا۔
جیسے اندر ہی اندر وہ کوئی فیصلہ لے چکی ہو——

••

ٹھیک ٹھیک اس پورے واقعہ کے بارے میں بتایا جانا مشکل ہے ممکن ہے یہ واقعہ اُنہیں دنوں میں پیش آیا ہو، جب سردیاں بڑھ گئی تھیں۔ اور آسمان کو دھند کی چادر نے ڈھک لیا ہو—— لیکن، بیگم صاحبہ کی عالیشان کوٹھی میں ایک بار پھر وہی کہانی دہرائی جا رہی تھی، جو کبھی ایک زمانے میں روسی مملکت میں دہرائی جا رہی تھی اور نکولائی گوگول کا ایک کردار مردہ غلاموں کی خرید کر رہا تھا۔ ایسے غلام جو سرکاری دستاویزوں میں مرنے کے باوجود زندہ تھے——اور جیسا کہ، لحاف سے نکل کر باہر آنے والی لڑکی نے ایک لمحے کے اندر غلامانہ ذہنیت کی زنجیریں توڑ دی تھیں اور ایک مضبوط فیصلہ لے لیا تھا—— وہ داسی نہیں ہے۔ وہ زرخرید لونڈی نہیں ہے——اور زندہ ہے اور اسے اپنی خواہشوں کے ساتھ زندہ رہنے کا اتنا ہی حق ہے جتنا بیگم صاحبہ کو——اور یہ...... کہ جو کچھ ہوا، غیر متوقع طور پر——اس میں لحاف کا اتنا ہی دخل تھا، جتنا اس کی برہنہ خواہشوں کے ساتھ خرگوش کے پھدکنے کا——

قارئین، اور اسی لیے صراطِ مستقیم پر چلتی ہوئی اس کہانی کے انجام کے لیے آپ مجھے معاف کریں گے—— آپ چاہیں تو پڑھیں—— نہ پڑھیں تو کوئی بات نہیں—— جیسے یہ کہ دوسرے دن اچانک کوٹھی میں ہنگامہ برپا ہو گیا کہ 'بانو' بھاگ گئی۔ لیکن بیگم صاحبہ کے لیے گہرے صدمہ کی بات یہ تھی کہ وہ اپنے ساتھ پشتینی لحاف کو بھی لے کر بھاگ گئی تھی۔

اور جیسا کہ، بیگم صاحبہ نے ایک اڑتی اڑتی خبر سنی تھی کہ ایک جنگل ہے...... جہاں بانو معصوم خرگوشوں کو پکڑتے ہوئے دیکھی گئی تھی...... ممکن تھا، لحاف بھی اس کے ساتھ ہو—— یا پھر، یہ بھی ممکن ہے کہ دونوں لحاف کے اندر رہوں......نرم گرم خرگوش اور...... بانو......

یا ممکن ہے اس نے لحاف کو جلا ہی ڈالا ہو—— موئی کیا جانے لحاف کی قدر——!

☆☆☆

صفِ اول کے ناقد **پروفیسر گوپی چند نارنگ** کے ادبی مکالمات کا مجموعہ

دیکھنا تقریر کی لذت

مرتب: مشتاق صدف

رابطہ: کرناٹک اردو اکیڈمی، کنڑ بھون، جے سی روڈ، بنگلور۔2

مکالمہ

نئے نقادوں میں سکندر احمد نے فکشن کی مبادیات اور نظری مباحث کو ایک نئی زندگی دی ہے اور ان کے معاصرین میں ہند و پاک میں ان کا ہم پلہ فکشن کا کوئی دوسرا نقاد نظر نہیں آتا۔ وہ ہندوستانی اور ہند+اسلامی شعریات سے کماحقہٗ آگاہی رکھتے ہیں اور مغرب کے تنقیدی رویے اور رجحانات بھی ان کی دلچسپی کا موضوع ہیں لہٰذا اس سنگم سے ان کی تنقید میں جو استدلالی کیفیت اور فکر میں شفافیت پیدا ہوئی ہے وہ بہت کم لوگوں کا حصہ ہے۔ اس باب میں شامل ان کا انٹرویو اردو فکشن پر ایک دلچسپ مکالمہ تو ہے ہی، اردو میں مابعد جدیدیت کے نعرہ بازوں کے لیے ایک تازیانہ بھی ہے۔ (ادارہ)

محمد عمر میمن اردو کے معروف مترجم اور مدیر ہیں جبکہ محمد حمید شاہد پاکستان کی نئی نسل کے اہم افسانہ نگار۔ ان دونوں شخصیات کے بیچ فکشن پر خطوط کے ذریعے بڑا دلچسپ مکالمہ قائم ہوا تھا۔ جسے محمد عمر میمن نے دو حصوں میں مرتب کیا ہے۔ اس کا پہلا حصّہ اس باب میں شامل کیا جا رہا ہے۔ (ادارہ)

سکندر احمد

فکشن کی انتہا یہی ہے کہ شاعری بن جائے

اسد ثنائی: فکشن سے آپ کی کیا مراد ہے اور آپ فکشن کو کس نظریہ سے دیکھتے ہیں؟

سکندر احمد: دیکھئے جہاں تک فکشن کا تعلق ہے یہ ایک انگریزی کا لفظ ہے اور اُردو میں عام طور پر فکشن کا ترجمہ افسانہ کردیا جاتا ہے جب کہ ایسا ہے نہیں۔ مغربی ادب میں جب فکشن کی بات ہوتی ہے تو عام طور پر ناول پر گفتگو ہوتی ہے۔ اُردو میں جب بات آتی ہے تو عام طور پر سارا فوکس افسانوں پر چلا جاتا ہے۔ اب اُردو کے حوالے سے آپ کہیں گے تو فکشن سے مراد ناول بھی ہوسکتا ہے۔ فکشن سے مراد افسانے ہوسکتے ہیں اور فکشن سے مراد داستانیں بھی ہوسکتی ہیں۔ پھر اگر داستانوں کو لیں تو مثنویاں بھی ہوسکتی ہیں۔ مثنویاں بھی منظوم کہانیاں ہیں۔ لیکن آج کے تناظر میں ہم بات کریں گے تو بالعموم ناول اور افسانے اور بالخصوص افسانے ہی اس زمرے میں آئیں گے۔ اُردو کے حوالے سے۔ یہ تو ایک صنف کی بات ہوئی۔ جہاں تک فکشن کا تعلق ہے اُردو کے حوالے سے تو یہ ایک آزادانہ صنف کی حیثیت رکھتی ہے مگر آپ کو یہ جان کر تعجب ہوگا کہ مغرب میں آج کے دن بھی فکشن کو دوسرے درجہ کی تخلیق سمجھا جاتا ہے۔ میں نے اپنے مضمون میں بھی اس کا ذکر کیا ہے۔ ویسے بھی اس مضمون میں جو حوالے ہیں وہ کچھ پرانے ہیں۔ میں آپ کو 2000 کا ایک حوالہ بتارہا ہوں۔ ایک صاحب ہیں J.Hartman انہوں نے فکشن کی حمایت میں سن 2000 میں ایک مضمون لکھا تھا۔ مضمون کا نام تھا Brevity is the soul of fiction یعنی ''اختصار افسانے کی روح ہے''۔ یہ مضمون Strange Horizons میں شائع ہوا تھا۔ انھوں نے اپنے مضمون میں اس بات کا ذکر کیا کہ افسانوں کو یعنی Short Stories کو ادب میں وہ مقام نہیں ملا جو انہیں ملنا چاہئے تھا۔ اور انہوں نے یہ بات بھی کہی کہ افسانے اپنے اختصار کی وجہ سے ناول پر فوقیت رکھتے ہیں اور انہوں نے بہت ساری خصوصیات گنوائیں۔ مثلاً اگر آپ ایک رسالہ نکال رہے ہیں تو آپ اگر اس میں ناول شائع کریں گے تو اس میں بہت سارے تجربات کی گنجائش نہیں رہے گی۔ لیکن آپ افسانے شائع کریں گے تو اس میں تجربات کی گنجائش بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے ہوسکتا ہے کہ دو چار افسانے لوگوں کو ناپسند آئیں۔ ہوسکتا ہے کہ دو چار افسانے لوگوں کو پسند بھی آجائیں۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ سن 2000 تک میں بھی صنفی حیثیت سے

افسانے کے لئے argument کی ضرورت پڑی کہ افسانے (Short Stories) صنفی اعتبار سے ناول سے کچھ کم نہیں ۔ یہ بات تو ہے مغرب کی لیکن اُردو کے حوالے سے فکشن میں سب سے زیادہ مرکزیت افسانوں کو ہی حاصل ہے اور پھر جب بات اور آگے بڑھے گی تو ناولٹ تک بھی جائے گی ۔

اسد ثنائی: بحیثیت مجموعی آپ افسانے اور ناول میں کیسے فرق کریں گے؟ کیا فکشن شاعری سے کمتر درجے کی صنف ہے؟

سکندر احمد: دیکھئے اگر آپ فکشن میں ناول کو لیں گے تو اس میں آپ کو فالتو باتیں کہنے کی بہت گنجائش ہوگی ۔ مثلاً آپ کی ہماری گفتگو ہو رہی ہے اس میں اگر آپ کے حلیے کی بات کروں کہ آپ دیکھنے میں کیسے لگتے ہیں اس کا براہِ راست گفتگو سے کوئی تعلق نہیں ہوگا ۔ یعنی کہ اس میں فروعات کی بہت زیادہ گنجائش ہے ۔ ایک بات تو یہ ہے دوسری بات یہ کہ فروعات کس طرح سے فکشن کی اصل میں ضم ہو جائیں ۔ یہ ایک فن ہے جس سے بہت سارے افسانہ نگار واقف نہیں جب کرشن چندر وہ کشمیر کا حسن بیان کریں گے تو ''بالکنی'' میں وہ بیان کریں گے ۔ ''شکست'' میں بھی اور ''طوفان کی کلیاں'' میں بھی بیان کریں گے ۔ تو معلوم یہ ہوا کہ یکساں منظر کشی سارے افسانوں میں یا سارے ناولوں میں یا سارے فکشن میں Common ہے ۔ تو معلوم یہ ہوا کہ فکشن کی صنفی حیثیت بہت زیادہ بلند نہیں ۔ خاص طور پر افسانوں کی ۔ شعر کے مقابلے میں فکشن واقعات سے بندھا ہوا ہے داخلی سطح پر کچھ ہو رہا ہے یا خارجی سطح پر کچھ ہو رہا ہے ۔ کچھ ہو رہا ہے یعنی کہ وقت گذر رہا ہے ۔ یہ وقت سے بندھی ہوئی صنف ہے تو ظاہر سی بات ہے کہ شاعری میں جو آفاقیت ہے وہ فکشن میں نہیں سما سکتی کیوں کہ یہ زمان و مکاں دونوں سے جڑا ہوا ہے ۔ جہاں زمان و مکان کی بات آئے گی تو بہت سارے فروعات کی گنجائش نکل آئے گی اور خواہ مخواہ آپ اسے جیسے چاہے کھینچ سکتے ہیں ۔ اب آگر آپ کوئی ناول پڑھیں اور تین چار صفحے آپ چھوڑ بھی دیں تو بھی اصل سے سرا نہیں چھوٹتا اور شعر میں ایک ایک لفظ اہمیت رکھتا ہے ۔ فکشن کی انتہا یہی ہے کہ شاعری بن جائے اور فکشن جب اپنی معراج کو پہنچ جائے گا تو یہ زمان و مکاں کی حدود سے آگے نکل جائے گا یعنی کہ ایک بیچ کی کڑی آپ ہٹائیں تو وہ گر جائے ۔ شاعری کا درجہ فکشن سے بہت بلند ہے اور فکشن میں بھی ناول کا مقام افسانوں سے بلند ہے ۔ ناول میں آپ کے پاس کہنے کو بہت کچھ ہے ناول میں آپ ایک آفاقیت پیدا کر سکتے ہیں چونکہ ضخامت اور طوالت کے اعتبار سے آپ کو یہ موقع ملتا ہے لیکن شارٹ اسٹوری میں یہ موقع نہیں ملتا اور وحدت تاثر کا چکر بھی ہے کہ صاحب وحدت تاثر ٹوٹ گیا تو فکشن بکھر گیا ۔ جیسے ایڈگر ایلن پو نے کہا کہ آپ اسے ایک نشست میں پڑھ لیں ۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے سے زیادہ نہیں جانا چاہئے وغیرہ وغیرہ ۔ یہ بات تو ہوئی جو تقابلی طور پر کہی جا سکتی ہے لیکن اپنے آپ میں آپ کسی بھی زبان کی اگر بات کریں گے تو Short Story کے بغیر اس کا ذکر مکمل نہیں ہوگا، شاعری سے کمتر سہی مگر افسانے کا مقام متعین اور مستحکم ہے ۔

اسد ثنائی: کیا اُردو میں فکشن کا متبادل لفظ نہیں ہے؟

سکندر احمد: اُردو میں اس کا متبادل کوئی لفظ نہیں ہے ۔ ہم آپ کو ایک بار اور بتا دیں آپ عربی ادب کی تاریخ پڑھ جائیے ظاہر سی بات ہے ہمارا تعلق مشرقی ادب سے ہے اور اُردو میں بھی عربی اور فارسی کے بغیر گفتگو نہیں ہو سکتی ۔ آپ عربی

ادب کی پوری تاریخ پڑھ جایئے۔ میرے پاس John Hopkins یونیورسٹی کا تاریخ عربی ادب پر پورا مکالمہ ہے۔ پورے مکالمے میں ڈھونڈ ھنے سے بھی کہیں عربی ادب میں فکشن کے متعلق کوئی بات نہیں ملتی۔ نثر کے حوالوں سے یایوں کہیئے نثری ادب کا تذکرہ ہے۔ میں نے یہ سمجھا کہ John Hopkins یونیورسٹی کا اپنا نظریہ ہوگا لیکن احمد زیادت کی ایک کتاب ہے عربی ادب پر جس کا پاکستان میں ترجمہ ہوا ہے اس کو شروع سے آخر تک پڑھ جایئے نثر کے حوالے سے، انشاپردازی پر خوب لکھا ہے۔ بیوروکریسی میں ان کے یہاں بنوامیہ میں، بنوعباس میں نوٹس جو لکھے جاتے تھے اور نوٹس پر جو حواشی لکھے جاتے تھے ان تک کا ذکر ہے۔ اور ان کی نثری حیثیت کیا ہے یا گفتگو کے دوران کوئی کوئی جملہ کسی کے منھ سے نکل جائے اُس تک کا ذکر ہے۔ اسلوب کا ذکر ہے۔ کئی بڑے بڑے ناموں ابن المقفع، رئیس جاحذ کا ذکر ہے لیکن انشاپردازی کے حوالے سے تاہم نثری افسانوں کے حوالے سے عربی ادب کی تاریخ میں کوئی ذکر نہیں ملتا۔ عربی ادب میں اگر آپ بعد کی چیزیں پڑھیں گے تو وہاں بھی نثری افسانوں کا ارتقاء لگ بھگ اُردو افسانوں کے ساتھ ہی ہوا ہے اور فارسی میں بھی یہی صورتحال ہے اس لئے آپ جب فکشن کی بات کریں گے تو آپ کو لامحالہ مغربی حوالوں سے ہی بات کرنی پڑے گی۔

اسد ثنائی : آپ اپنے حالیہ مضمون ''افسانے کے قواعد'' مطبوعہ شب خون شمارہ ۲۸۵ میں جن افسانوں اور افسانہ نگاروں کا ذکر کیا ہے اُن افسانوں میں علائم، تمثیل، تجریدیت یا اشاریاتی زبان کی مثال پیش کی جاسکتی ہے جب کہ جدیدیت میں ان کا ہونا لازمی ہے۔ میرے خیال میں انتظار حسین، انور سجاد، سمیع آہوجہ اور مظہر الزماں خاں کے ہاں کثرت سے یہ چیزیں پائی جاتی ہیں؟

سکندر احمد: آپ نے بالکل ٹھیک کہا۔ انور سجاد کا ذکر میں نے کیا اور آپ نے جو نام لیا ہیں ان کا بھی میں نے ذکر کیا۔ ان کے یہاں تمثیل، اشاریئے، علامتیں پائی جاتی ہیں۔ کوئی ضروری نہیں کہ جدید افسانوں میں یہ ہوں اور کوئی ضروری نہیں کہ جدید افسانوں میں یہ نہ ہوں۔ آپ فکشن کی اگر بات کریں گے تو ایک بندھا ٹکا فارمولہ کے کردار ہوں گے، واقعات ہوں گے، پلاٹ ہوگا، زاویہ نگاہ ہوگا لیکن جدید افسانوں نے اس فارمولہ بازی کو بالکل توڑ دیا ہے۔ جدید افسانوں نے یہ بات ثابت کردی ہے کہ بندھے ٹکے فارمولے سے روگردانی کر کے بھی کہانی لکھی جاسکتی ہے۔ بغیر پلاٹ کے بھی کہانی لکھی جاسکتی ہے۔ انتظار حسین نے بھی کہیں یہ لکھا ہے کہ یہ کب کا پرانا ہو چکا ہے۔ مشتاق احمد یوسفی کا ''آبِ گم'' آپ نے پڑھا ہوگا۔ آپ دیکھئے اس میں کہیں پلاٹ نہیں۔ واقعات کا تسلسل بھی۔ آغاز بھی ہے۔ اختتام بھی ہے لیکن کہیں بھی پلاٹ نہیں ہے۔ آبِ گم اُردو فکشن کا ایک سنگ میل ہے۔ آپ دیکھئے کہ ایک ہی کردار کو لے کر افسانے لکھے گئے۔ آپ تجربہ کر کے تو دکھا سکتے ہیں کہ میں نے ایک کردار کو لے کر پورا افسانہ لکھ دیا۔ لیکن پورا پورا ناول لکھ دیں اور اس میں کہیں کوئی پلاٹ نہیں ہے یہ بڑی بات ہے۔ سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ جدیدیت کے اسلوب میں لکھا گیا ''آب گم'' شاید اُردو میں سب سے زیادہ پڑھے جانے والے ناول کی حیثیت کا حامل ہے۔ جدیدیت سے کہانی پن غائب ہونے کا رونا رونے والوں کو ''آب گم'' پڑھنا چاہئے اور ضرور پڑھنا چاہئے۔

اسد ثنائی : آپ کو اُردو دنیا ایک ایسے شخص کی شکل میں پہنچانی ہے کہ جس نے ''مابعد جدیدیت'' کو اُردو ادب

میں داخل ہونے سے پہلے ہی باہر کا راستہ دکھا دیا۔ آپ کا کیا کہنا ہے؟

سکندر احمد : دیکھئے مابعد جدیدیت کوئی قلعہ نہیں تھا جسے میں نے منہدم کر دیا۔ یہ ایک ہوائی قلعہ تھا، ایک فریب نظر (Optical Illusion) تھا جسے چند شعبدہ باز نقادوں نے کھڑا کیا تھا۔ انہوں نے ''معمار ادب'' نام کا ایک ترجمان بھی شروع کیا تھا، جس کا اسقاط ہو گیا۔ مابعد جدید ادب کا کوئی خدوخال نہیں، کوئی ڈکشن نہیں، کوئی اسلوب نہیں۔ کسی Optical Illusion کو منہدم نہیں کیا جا سکتا صرف یہ بتایا جا سکتا ہے کہ یہ ایک فریب نظر ہے۔ میں نے صرف یہی کیا ہے۔ مابعد جدیدیت کو بے نقاب کرنے میں احمد ہمیش کا بھی اہم رول ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

اسد ثنائی: یہ تو ہمارے لئے انکشاف ہے کہ مابعد جدید ادب کی کوئی شناخت نہیں؟

سکندر احمد : یہ میری ذاتی رائے ہی نہیں، ماہرینِ مابعد جدید ادب بھی یہی فرمارہے ہیں۔ Michael Berube (مائکل بیروب) جنہیں Illinois University میں دس برسوں تک Postmodernism and American Fiction'' پڑھانے کا شرف حاصل تھا، ایک مضمون لکھا جس کا عنوان تھا "Teraching Post modern fiction without being sure that the genre exists" یعنی ''مابعد جدید فکشن کی تدریس بغیر یہ جانے ہوئے کہ آیا یہ صنف ہے بھی یا نہیں''۔ مضمون میں آگے چل کر انہوں نے اعتراف کیا کہ مابعد جدید فکشن کی کوئی صنفی حیثیت نہیں۔

اسد ثنائی: مائکل بیروب کوئی جانا پہچانا نام تو نہیں؟

سکندر احمد : بجا فرمایا، مگر کیا کیجئے کہ اہاب حسن نے اپنے اسی انٹرویو میں جسے انہوں نے پرنسٹن یونیورسٹی کے فرینک سیافی کو دیا تھا، خود کہا کہ وہ رابرٹ سٹور کے اس خیال سے متفق ہیں (اور نہیں بھی) کہ مابعد جدیدیت ذہن کو پراگندگی کی طرف دھکیل دیتی ہے۔ انہوں نے یہ بھی فرمایا کہ ان کا مشہور خاکہ جس میں انہوں نے جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے فرق کو واضح کیا تھا، پراگندگی کا شکار ہے یعنی وہ عوامل ونکات جن کے ذریعے جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے فرق کو واضح کیا تھا، آپس میں مدغم نہیں۔

اسد ثنائی: یہ چارٹ کہاں دستیاب ہے؟

سکندر احمد : یہ اہاب حسن کے مضمون Towards a concept of post modernism کا حصہ تھا، جسے انہوں نے Dismemberment of Orphens کے پس نوشت کے طور پر شامل کیا ہے۔

اسد ثنائی: آخر یہ لفظ Post modernism آیا کہاں سے؟

سکندر احمد: سب سے پہلے اسے برطانوی پینٹر John Watkins Chapman نے ۱۸۷۰ء میں استعمال کیا۔ بعد ازاں، فریڈریکو ڈی آنس، برنارڈ اسمتھ، ڈڈلی فٹس، آرنلڈ ٹائنبی، چارلس آلسن، ارونگ ہو، ہیری لیون وغیرہ نے تواتر سے استعمال کیا۔

اسد ثنائی: بعض اس کا کریڈٹ اہاب حسن کو دیتے ہیں؟

سکندر احمد: اہاب حسن کو اس سے انکار ہے۔
اسد ثنائی : آپ نے کہا کہ مابعد جدیدیت کے ادبی خدوخال واضح نہیں ہیں ایسی صورت میں بدنام زمانہ مصنف سلمان رشدی کے ناول "The Satanic Verses" کو مابعد جدید ناول کیونکر کہا جاتا ہے؟
سکندر احمد :"The Satanic Verses" کی شہرت کی وجہ مابعد جدیدیت ہی نہیں بلکہ کچھ اور بھی ہے جس سے آپ بھی واقف ہیں یہ صحیح ہے کہ اسے ایک مابعد جدید فکشن کے نمائندہ متن کی شکل میں دیکھا جاتا ہے تاہم سلمان رشدی کی کتابوں میں مابعد جدید نکات کی تلاش' شائع ہونے کے بعد کی گئی۔ میں آپ کو ایک دلچسپ بات بتاؤں کہ رشدی کی کتابوں سے پہلے پہل مابعد جدیدیت Brian Mchale نے دریافت کیا جو کبھی امریکہ اور کبھی اسرائیل میں تدریسی فرائض انجام دیتے ہیں۔ سلمان رشدی اور مابعد جدید کا ایک Vicious Circle ہے یعنی رشدی جو کچھ لکھتے ہیں مابعد جدیدیت بن جاتی ہے اور جو کچھ مابعد جدیدیت کہتی ہے وہی رشدی لکھتے ہیں۔ اگر آپ عقل مند ہیں تو آپ مابعد جدیدیت کے اغراض ومقاصد کو آسانی سے دریافت کرسکتے ہیں۔
اسد ثنائی: آواں گارد تحریک اور مابعد جدیدیت کے مابین کوئی تعلق ہے؟
سکندر احمد: ہے تو مگر دور کا۔ بریڈ ہالینڈ (Brad Holland) نے اپنے مضمون "Express yourself : It's better than you think" میں اس کا تذکرہ کیا ہے۔ آواں گارد تحریک فرانسیسی لاابالیوں (French Bohemian) کی تحریک تھی۔ ان کے نزدیک آرٹ کا مقصد ہے کہ مڈل کلاس کو چونکا دیا جائے۔ مابعد جدیدیت کچھ ایسا کرنا چاہتی ہے کہ آواں گارد خود چونک جائیں۔
اسد ثنائی: اگر ایسا ہے' تو مابعد جدیدیت کے امام گوپی چند نارنگ نے' صلاح الدین پرویز کو اُردو کا آواں گارد کیونکر کہا' ایسے میں تو پرویز مابعد جدید نہ ہوکر جدیدیت کے علم بردار ہوگئے؟ ایسا گوپی چند نارنگ نے وارجرنلس کے دیباچے میں لکھا ہے؟
سکندر احمد: میں ان حضرات کے متعلق گفتگو نہیں کرنا چاہتا' بہتر ہے آپ ان لوگوں سے ہی دریافت کریں۔
اسد ثنائی: کیا آپ کے خیال میں مابعد جدیدیت دم توڑ چکی ہے؟
سکندر احمد: دم ہی نہیں تھا۔
اسد ثنائی: مابعد جدیدیت کے حوالے سے عجیب وغریب اصطلاحات سامنے آتے ہیں جو ڈکشنری میں نہیں ملتے؟
سکندر احمد: جی ہاں ایسے اصطلاحات ہیں۔
اسد ثنائی: مثلاً ؟
سکندر احمد: اصطلاحات تو بہت ہیں' آپ کی مراد کن اصطلاحات سے ہے؟
اسد ثنائی: Deconstruction' hyper reality' hyper tex' sinulecra' metanarrative وغیرہ۔
سکندر احمد: اسد صاحب یہ اصطلاحات اپنے آپ میں کافی گنجلک ہیں تاہم میری کوشش ہوگی کہ انہیں سہل

ترین انداز میں سمجھا جائے۔ڈی کنسٹرکشن دریدا کی وضع کردہ اصطلاح ہے، مختصراً آپ یہ سمجھ لیں کہ متن جو کہ ایک لفظ پر بھی مشتمل ہوسکتا ہے کے کوئی متعین معنی نہیں ہوتے۔اب آپ اسے یوں سمجھیں کہ آئن اسٹائن نے بلیک بورڈ پر لکھا $E = mc^2$ اور ہیروشیما اور ناگاساکی آگ میں جھلس گئے۔اگر آپ ڈی کنسٹرکشن پر یقین رکھتے ہیں تو آئن اسٹائن اس المیے کی اخلاقی ذمہ داری سے بچ نکلے گا۔Hypertext کو آپ زائد از متن کہہ سکتے ہیں۔یہ ایک متن ہے جو بیک وقت تہہ بہ تہہ چلتا ہے، اس کی متعین سمت نہیں ہوتی، نہ ہی کوئی منطقی انجام ہوتا ہے۔

اسد ثنائی: یہ تو واہی تباہی ہوئی

سکندر احمد: سلمان رشدی کے ناول واہی تباہی نہیں تو اور کیا ہیں

اسد ثنائی: اور Hyperreality

سکندر احمد: آپ اسے زائد از اصل کہہ سکتے ہیں۔مثلاً کسی قوم کے پاس کوئی آثار قدیمہ نہیں ہے، مگر طاقت اور دولت ہے۔اگر وہ تاج محل کی نقل تیار کریں اور اس میں جدید ترین آلات نسب کر کے چند ایسی خصوصیات پیدا کر دیں جو اصل تاج محل میں نہیں ہوں۔وہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ اگر چہ تاج محل (Reality) ان کے پاس نہیں ہے تو کیا ہوا ان کے پاس اس کا (Hyperreality) زائد از اصل تو ہے۔

اسد ثنائی: کیا یہ صحیح ہے کہ مابعد جدیدیت اخلاقی قدروں کی قائل نہیں ہے؟

سکندر احمد: جی ہاں یہ صحیح ہے۔دراصل یہ کسی ازلی سچائی کی قائل نہیں۔ازلی سچائیاں Metanarrative ہیں۔جیسے ''مظلوم کو مت ستاؤ''۔مابعد جدیدیت لفظ مظلوم کی کچھ ایسی وضاحت پیش کرے گی کہ ظالم ہی مظلوم نظر آنے لگیں گے۔یہ Power game یعنی طاقت کا کھیل ہے۔الفاظ کے معنی کا تعین وہ کریں گے جن کے پاس طاقت ہے۔مابعد جدیدیت کے یہاں اصل کی کوئی قیمت نہیں، نقل اور اصل میں کوئی فرق نہیں۔میوزک کے سی ڈی اس کی مثال ہیں۔اس تصور کو ہی simulacra کہتے ہیں۔یہ جمع ہے واحد simulacrum ہے۔بودریار نے اس تصور کو پیش کیا۔اس نظریے کے مطابق عراق کی جنگ، جنگ نہیں تھی بلکہ جنگ کی شبیہ محض تھی جو ٹیلی ویژن کے پردوں پر ڈرائنگ روم میں لڑی گئی۔

اسد ثنائی: اگر ایسا ہے تو اُردو میں اس مخرب اقدار تصور کی کیا جگہ ہے؟

سکندر احمد: یہ تو آپ اس کے رائدین اور مبلغین سے دریافت کریں۔

اسد ثنائی: ترقی پسند ادب کے اثرات کیا اب بھی باقی ہیں؟

سکندر احمد: دیکھئے، ترقی پسند خلاء میں پیدا نہیں ہوا تھا، نہ یہ صرف اُردو کی حدود میں مقید تھا۔اشتراکیت کے دم توڑنے کے بعد تحریک کمزور تو ہوئی ختم نہیں ہوئی۔ویسے لوگ ابھی زندہ ہیں جو خود کو ترقی پسند کہتے ہیں۔بات ظاہر ہے جب تک ادیب زندہ ہے ادب زندہ ہے۔تاہم یہ تحریک قریب المرگ ہے۔

اسد ثنائی: کیا جدیدیت نے ترقی پسند ادب کو نقصان پہنچایا؟

سکندر احمد: جی نہیں، ترقی پسند ادب اپنے زوال کا ذمہ دار خود ہے۔
اسد ثنائی: جدید ادب کی ترقی میں ''شب خون'' اور ''شمس الرحمٰن فاروقی'' کا کتنا رول ہے؟
سکندر احمد: آپ، اسے یوں کہیں کہ اُردو ادب کی ترقی میں ان کا کیا رول ہے۔ دیکھئے شب خون اور فاروقی صاحب نے اُردو زبان و ادب کو ایک معروضی سمت دیا۔ فاروقی صاحب کی کتابیں ''شعر غیر شعر اور نثر''، ''شعر شور انگیز''، ''افسانے کی حمایت میں''، ''اُردو کا ابتدائی زمانہ'' اس قدر اعلیٰ معیار کی ہیں جس کی نظیر نہیں ملتی۔ شب خون کا درجہ اس قدر بلند ہے کہ لوگ اسے استناد کا اسٹامپ سمجھتے ہیں۔ اس سے فائدہ تو اُردو زبان اور اُردو ادب کو پہنچا، نقصان فاروقی صاحب کا ہوا۔ فاروقی صاحب کے مخالفین میں غالب اکثریت ان لوگوں کی ہے جن کو ''شب خون'' میں جگہ یا خاطر خواہ پذیرائی نہیں ملی۔
اسد ثنائی: وہ نسل جس کی شب خون اور شمس الرحمٰن فاروقی نے آبیاری کی تھی ان میں آج کتنے شجر ثمر آور اور تناور ہو چکے ہیں؟
سکندر احمد: شہریار، بلراج کومل، غیاث احمد گدی، شفیع جاوید، شوکت حیات، سریندر پرکاش، ظفر اقبال وغیرہ۔ نام تو کئی ہیں کن کن کا شمار کیا جائے، آج کے تقریباً تمام بڑے نام شب خون اور فاروقی کے توسط ہی سے پایۂ استناد تک پہنچے۔
اسد ثنائی: ان میں سکندر احمد بھی تو شامل ہیں؟
سکندر احمد: No comment
اسد ثنائی: بہت کم عرصہ میں آپ نے انڈو پاک کے ممتاز نقادوں میں اپنے آپ کو شمار کروالیا ہے؟
سکندر احمد: ابھی تو مجھے بہت لمبا سفر طے کرنا ہے اس لیے فی الوقت کچھ کہا نہیں جا سکتا۔
اسد ثنائی: کیا فاروقی صاحب سے اختلاف کیا جا سکتا ہے؟
سکندر احمد: جی ہاں، بالکل کیا جا سکتا ہے۔
اسد ثنائی: شب خون کے بعد ایسا کون سا رسالہ ہے جو شب خون کی کمی پوری کر سکے؟
سکندر احمد: کوئی نہیں۔
اسد ثنائی: مابعد جدید نظریات سے آپ کس حد تک غیر مطمئن ہیں۔
سکندر احمد: جس نظریے میں آسمانی صحیفوں کی کوئی حیثیت نہیں، سچ اور جھوٹ کے درمیان کوئی فرق نہیں، اخلاقی قدروں کا منبع طاقت قرار پائے، مصنوعی صارفیت کا دور دورہ ہو، اس نظریے سے کیسے متفق ہوا جا سکتا ہے؟
اسد ثنائی: مابعد جدیدیت کو آج کی نسل نے کس حد تک سمجھا ہے؟
سکندر احمد: نئی نسل ہو یا پرانی نسل، کسی نے نہیں سمجھا ہے۔ سب اپنی اپنی روٹیاں سینکنے میں مصروف ہیں۔
اسد ثنائی: مابعد جدیدیت کو اُردو میں متعارف کروانے والوں کا مقصد کیا ہے؟
سکندر احمد: نتائج آپ خود اخذ کریں۔☆☆☆

کہانی اور یوسا سے معاملہ

فکشن: تیکنیکی بھید‘فنی لوازم اور نئے مباحث

محمد حمید شاہد: محمد عمر میمن

ماریو ورگس یوسا(Mario Vergus Llosa) **کی کتاب**

Letters to a Young Novelist**اور اردو فکشن کے**

حوالے سے مکتوباتی مکالمہ

پہلا حصہ

ابتدائیہ

یوسا نے اپنی کتاب ''نوجوان ناول نگار کے نام خطوط'' میں فکشن کی فنّی عملیات سے بحث کی ہے جس کے ذریعے وہ تخیلی دنیا تخلیق ہوتی ہے جو اپنے حسنِ ترغیب (یا قوتِ تاثیر) کے باعث کاملاً غیر حقیقی یا تخیلی ہونے کے باوجود حقیقی دنیا کا التباس پیدا کرتی ہے؟ کتاب میں کل بارہ خط شامل ہیں۔

پہلے دو خطوں میں یوسا اپنے نوجوان مخاطب کو ان فنّی لوازمات سے آگاہ کرتا ہے جو اس کی دانست میں کسی اچھے ناول کی اساس ہوتے ہیں۔ تیسرے خط میں وہ ''قوّتِ ترغیب'' سے بحث کرتا ہے، جس پر فکشن کی کام یابی کا دارومدار ہوتا ہے۔ لیکن فکشن کی وہ صلاحیت جو نیرنگِ خیال پر حقیقت کا دھوکا دلاتی ہے، اس کے اجزاے ترکیبی کیا ہیں؟ اگلے آٹھ خطوں میں ان اجزا پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔ یہ اجزاے ترکیبی یا رموز، علی الترتیب، یہ ہیں: ''اسلوب''، ''راوی اور بیانیہ مکان''، ''زمان یا وقت''، ''حقیقت کی سطحیں''، ''انتقالات اور کیفی زقندیں''، ''چینی ڈبے یا روسی گڑیاں''، ''پوشیدہ حقیقت''، اور ''کمیونی کیٹنگ وَے سلز''۔

آخری خط، ''بہ طورِ پس نوشت''، میں یوسا مشورہ دیتا ہے کہ پچھلے سوا سو صفحوں میں جو کچھ کہہ چکا ہے اسے دریا برد کر دیا جائے اور ناول لکھنا شروع کر دیا جائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تنقید، چاہے کتنی ہی سخت گیر اور وجدانی کیوں نہ ہو، امرِ تخلیق کی مکمل توجیہہ کرنے کی اہل نہیں ہوتی۔ ایک کام یاب فکشن یا نظم میں ہمیشہ ہی ایک عنصر یا بُعد ایسا ہوتا ہے جو عقلی تنقیدی تجزیے کی گرفت میں نہیں آ سکتا۔

اس کتاب میں مکتبی تنقید کا جبر نہیں، رسمی زبان کا قبض بھی نہیں، اگر کچھ ہے تو یہ ایک اول درجے کے تخلیقی فن کار کی متانت، اعتماد، اور انسایئنت ساز انکساری ہے، جو تنقید کا منکر نہیں لیکن جو پاسبانِ عقل کو کبھی کبھی تنہا چھوڑ دینے کی دل نواز ضرورت سے بھی آگاہ ہے۔

یہ کتاب میں نے دو تین سال پہلے پڑھی تھی اور اسی وقت سے اس کے ترجمے کا خیال رہا تھا، جواب میں نے کر لیا ہے۔ پوری کتاب جانے کب چھپے، فرشی صاحب نے عنایتاً اسے اپنے ''سمبل'' میں قسط وار چھاپنے کی ابتدا کر دی ہے۔ پہلے دو خط وہاں چھپ چکے ہیں۔

انھیں پڑھ کر محمد حمید شاہد صاحب کو ان پر کچھ کہنے کی تحریک ہوئی اور انھوں نے فکشن کے بارے میں اپنے خیالات کا نچوڑ اپنے خطوط میں پیش کر دیا ہے۔ ان خطوں کو پڑھ کر مجھے خیال آیا کہ کیوں نہ یہ کہیں چھپ جائیں تاکہ یوسا نے جن نکات کا اظہار کیا ہے اور جس طرح شاہد صاحب نے ان پر مزید بحث کی ہے، خاص طور پر اردو کے ہمارے مقامی اور معاصر منظر نامے کی رعایت سے، اس سے ہمارے اردو داں طبقے کو بھی کچھ فائدہ پہنچے۔ سو ان کی اور میری مراسلت حاضر ہے۔ اس مراسلت کو ''مکالمے'' سے زیادہ ایک ''خود کلامیہ'' کہنا چاہیے، کیوں کہ اس میں میرا کردار بس واجبی سا ہے۔ ایک تابعِ مہمل کا۔ اس برات کے اصلی دلھا میاں تو شاہد صاحب ہیں، مجھے زیادہ سے زیادہ وہ جسے مغرب میں دلھا کا ''بیسٹ مین'' کہا جاتا ہے، بس وہی سمجھا جائے، یا نوشے کا برادرِ خورد جسے بھی، کبھی کبھی، دل رکھنے کی خاطر، گھوڑے پر بٹھا لیا جاتا ہے۔ انھیں پڑھ کر میری طرح آپ بھی شاہد صاحب کے ادب سے سنجیدہ لگاو اور تفاعل، غیر معمولی لگن اور اس کے مباحث کی بابت ان کی تیز فہمی کے قائل ہو جائیں گے۔

—— محمد عمر میمن

میڈیسن، امریکا

❁❁❁

دو

ادیب اور معاشرتی قدرومنزلت

پیارے عمر میمن:

آداب'

بھئی اتنی ساری پُرلطف باتیں تمہاری طرف سے اوپر تلے ہوگئیں کہ مزا آ گیا۔

روز سوچتا ہوں' تمہارا شکریہ ادا کروں گا؛ روز سوچتا رہ جاتا ہوں اور ڈھنگ سے فراغت نہیں پاتا کہ تفصیل سے لکھ پاؤں۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ جو میں اب روا روی میں چند سطریں گھسیٹنے بیٹھ گیا ہوں، اس سے حق ادا نہ ہوگا۔

''سمبل'، راول پنڈی، میں ماریو برگس یوسا نے درست کہا ہے:''

''جو لوگ ادبی لگن سے سرفراز ہیں وہ اس کے تخلیقی تجربے کو ہی اپنا انعام گردانتے ہیں۔''

یہ اور اس طرح کی پرلطف باتیں تم ترجمہ نہ کرتے تو میرا دِھیان اِن کی طرف کیسے جاتا؟ اور اگر جاتا بھی تو شاید بہت دیر ہو جاتی۔ رات ایک کہانی لکھنے بیٹھا تو جانتے ہو میں ماریو برگس یوسا کی اس عام سی بات کے اتنا زیر اثر تھا کہ لکھنے کے دوران عجب طرح کا لطف لیتا رہا۔ تو یوں ہے کہ جو تراجم تم نے کیے اور جس تواتر سے کیے ان کی بابت سوچتا ہوں تو تمہارا احسان ماننا پڑتا ہے۔ تم نے نہ صرف اُردو اَدب کا دامن مالا مال کیا ہمیں بھی اپنے تجربے میں شامل کیا ہے۔

ماریو برگس یوسا کے نوجوان ناول نگار کے نام خطوط پڑھتے ہوئے بار بار میں نے اپنے بارے میں سوچا ہے کہ آخر میں نے کب ڈھنگ سے کوئی خط لکھا تھا؟

کبھی نہیں۔

ہاں کبھی نہیں۔

مجھے خط لکھنا آیا ہی نہ تھا کہ ادھر ٹیلی فون پر بات کرنے کا زمانہ آ گیا۔ پھر ای میل کی سہولت نے تو میرے مزاج بگاڑ کر رکھ دیے ہیں۔ اب ایک مدت کے بعد خط لکھنے کا خیال آیا تو ڈھنگ سے اس کا مضمون سوچنے کی مہلت اور اسے ایک ترتیب سے لکھ لینے کی للک بہم نہ ہو رہی تھی۔ بھئی اب اگر اس خط کی عبارت جگہ جگہ سے اُچٹی ہوئی معلوم ہو تو مجھے معاف کر دینا۔

ماریو برگس یوسا کی یہ بات کہ:

''ادیب کی معاشرتی قدرومنزلت الل ٹپ ہوتی ہے''

مجھے بجا لگتی ہے اور یہ بھی کہ ادیب اپنے بھیتر میں اور بہت گہرائی میں چیزوں کو محسوس کرنے لگے، اسی کو طرز حیات بنا لے تو بات بنتی ہے۔ فکشن کے حوالے سے اس کی یہ بات کہ:

''یہ بغاوت کا نام ہے''

کتنی حیرت انگیز مگر کتنی مناسب اور برحق ہے۔ اگر لکھنے والا بالکل ویسی ہی زندگی پر قناعت کر لے جیسی کہ وہ دیکھتا اور برتتا ہے اور اس سے بغاوت نہ کرے تو کہانی کا اختراع ممکن نہیں رہتا۔ کم از کم میرے ہاں تو یہی ہوتا رہتا ہے۔ ایک مسلسل اضطراب نے مجھے کہانی کی طرف راغب کیا اور یہی اضطراب مجھے لکھنے کے لیے اُکساتا ہے۔

ایک اور چیز جو اِس مقام پر مجھے کہہ دینا ہوگی، یوں ہے کہ محض دِل بہلانا اور یوں ہی کسی منظر، واقعے یا حادثے کو لکھ لینا، لکھنے کے باب میں ریاض کا درجہ رکھتا ہوگا، ضرور رکھتا ہوگا مگر ایک فکشن نگار جس ڈھنگ اور اسلوب حیات کو اپنا لیتا ہے اس میں زندگی کو عمومیت اور بوسیدگی سے بچا لینے کا چلن بنیادی وتیرہ ہو جانا چاہیے۔شاید اِسی لیے لکھنے والے کا اپنے وجود کے اضطرابی آہنگ سے جڑنا لازم ہو جاتا ہے۔

اوہ بھئی ایک بار پھر — اور اس بار میلان کنڈیرا کی تحریر — تو یوں ہے پیارے کہ بہت پہلے ''وجود کی ناقابل برداشت لطافت'' کو پڑھا تھا اور اپنے ایک مضمون میں اس کی بابت کچھ لکھا بھی تھا۔اس پر بنی ہوئی فلم دیکھی تھی اور حال ہی میں اس پر ڈاکٹر ضیاء الحسن کا مضمون ''سمبل'' ہی میں پڑھا۔اب تمہارا ترجمہ پڑھتا ہوں تو مجھے اچھا لگتا ہے۔جی چاہتا ہے تم اسے مکمل چھپوادو۔کئی لوگوں سے میں نے تمہارے اِس ترجمے کی بہت تعریف سنی ہے۔

لوگ پڑھ رہے ہیں، تمہاری طرف متوجہ ہیں اور مجھے اس میں مزا آ رہا ہے۔

تم نے شاندور مارئی سے ''دنیا زاد'' میں ملاقات کروائی تھی۔ اب آصف فرخی کراچی سے آیا تو کتاب ''انگارے'' دے گیا ہے۔بھئی تم تو کمال ہمت اور مزاج رکھتے ہو۔میں تمہارے اِنتخاب کی داد دیتا ہوں۔شاندور مارئی کو جہاں پڑھنا اچھا لگا، وہیں میں اس بات کو بھی ماننے لگا ہوں جو نیر مسعود نے کہی ہے کہ پورے ناول کے لیے تم نے الگ زبان وضع کر لی ہے۔تم نے اپنے ایک گزشتہ ترجمہ کے ذریعہ مجھ سے افسانہ (''چٹا کا شاخ اِشتہا کا''، مطبوعہ ''سمبل'') لکھوا لیا تھا اور اب میرا جی چاہتا ہے کہ ایک اِعتراف تمہیں پیش کروں اور وہ یہ ہے کہ تم یہ جو ترجمہ کرتے ہوئے اپنی زبان کا محاورہ نہیں بھولتے' سچ پوچھو تو ہم جیسوں کا دِل اپنی مٹھی میں کر لیتے ہو۔نئی نئی تراکیب کا سوجھنا اور اِن ترکیب کو متن میں یوں رکھ دینا کہ اپنی نشست پر ٹھیک ٹھیک بیٹھ جائیں، تحریر کو نیا بنا دیتا ہے۔خوب بھئی خوب۔

ایک رسید اور:

یہ رسید ہے ''سالنامہ دراسات اُردو'' کی۔تف ہے مجھ پر کہ یہ تحفہ ملا تھا تو اِس پرندیدوں کی طرح جھپٹ پڑا تھا اور ایک آدھ روز میں اسے یوں چاٹ کر اُٹھا جیسے سیونک لکڑی چاٹ جاتی ہے مگر تمہیں رسید تک نہ دی۔ایک دفعہ پھر: خوب بھئی خوب۔

لو، خط لمبا ہو گیا۔ اس باب میں بہت سی بات ہونی ہیں لیکن پھر سہی کہ جس سلیقے سے بات کرنے کا ''سالنامہ دراسات اردو'' کی طرف سے تقاضا ہے وہ اب دست رس میں نہیں رہا۔ادھر کے تمام احباب کو میری طرف سے آداب ہو۔ اسلام آباد کے لیے کار لائق ہو تو بے دھڑک کہو۔

تمہارا

— محمد حمید شاہد

اسلام آباد : ۱۱اپریل، ۲۰۰۸

-x-x-x-

حمید شاہد صاحب........السلام وعلیکم

میں تو مایوس ہو چکا تھا لیکن، بہ ہر حال، آپ نے اپنی خوش گوار دل نوازی سے چونکا دیا۔حضرت، اگر آپ نے خط رواروی میں لکھا تھا، تو خدا آپ کو سلامت رکھے اور اس کا زور فزوں تر کرے۔آپ نے خط کیا لکھا ہے، داد و تحسین کا ایک

سیل رواں جاری کر دیا ہے۔ میں تو اس روانی بے دریغ میں گردن گردن نہا گیا (جی تو چاہتا ہے لکھوں: دودھوں نہا گیا)۔ بھئی مجھے نہیں معلوم تھا کہ آپ کو یہ تراجم اتنے بھا جائیں گے، ورنہ سارے کام چھوڑ کر صرف ترجمے ہی کرتا۔ مجھے کوئی خبر و بر ملتی نہیں کہ ان سے کسی کا بھلا ہو رہا ہے، ہاں ''ڈان'' دیکھنے پر اندازہ ہوتا ہے کہ ایک سے ایک عبقری جنا ہوا ہے اور آئے دن شاہ کار تولد کیے جا رہے ہیں۔ اور اب آپ رائے دینے پر آئے ہیں تو اس کے وفور کو دیکھ کر یقین نہیں آتا کہ آپ محسوس صادقہ لکھ رہے ہیں یا، جیسے یہاں کہا جاتا ہے، مجھ بے چارے کی ٹانگ گھسیٹ رہے ہیں۔

آپ کو یوسا کے خطوط پسند آئے۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ آپ ان سے اس درجہ متاثر ہوں گے۔ لیکن اچھی بات ہے کہ انھیں کم از کم ایک سنجیدہ قاری تو ملا۔ بھائی، انہیں ''سمبل'' میں چھپوانے کا یہ ہے کہ پوری کتاب، جو بارہ خطوں پر مشتمل ہے، میں نے سال بھر پہلے ترجمہ کر لی تھی۔ میں نے فرشی صاحب کو پیش کش کی تھی کہ ہر شمارے میں چند خطوط شائع کر دیا کریں۔ وہ کنڈیرا کے ناول کا ایک حصہ ہر شمارے میں چھاپنے کے لیے تیار ہو گئے لیکن لکھا کہ یوسا کو تسلسل سے ہر شمارے میں طبع کرنے کی بہ جائے کبھی کبھار چھاپنا پسند کریں گے۔ میں امریکا میں ۴۴ سال سے ہوں۔ یہاں سانس بھی انگریزی میں لینی پڑتی ہے، ورنہ حقہ پانی بند ہو جائے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اردو بھولتا جا رہا تھا۔ سوچا ترجمے ہی کرو۔ اردو کی بھی بازیافت ہو جائے گی اور وقت بھی اچھا گزر جائے گا۔ سو یہ پچھلے دو سال کتابوں اور ادیبوں کے ساتھ بڑی طویل صحبت میں گزرے ہیں۔ میں نے کوئی آٹھ دس ناول ترجمہ کر لیے ہیں، چند مضامین وغیرہ بھی۔ مصیبت یہ ہے کہ انہیں کہاں چھپواؤں۔ آصف کا بھلا ہو کہ انھوں نے چار کتابیں چھاپ دیں۔ وہ سبھی چھاپنے کو تیار ہیں۔ لیکن کیا کروں، اپنی جمالیاتی حس کا مارا ہوا ہوں۔ مجھے ان کی چھاپی ہوئی کتابیں صوری اعتبار سے پسند نہیں آئیں۔ کچھ ''بھاگتے کی لنگوٹ والا'' مضمون نظر آیا۔ وہ اتنے مصروف آدمی ہیں کہ اس سلسلے میں شاید کچھ کرنا چاہیں تو بھی کچھ نہیں کر سکتے۔ سو یہ تراجم کیبنیٹ میں پڑے خاک پھانک رہے ہیں۔ اب میں ایسا سورما بھی نہیں کہ چھپوانے کے لیے کوہ قاف جا پہنچوں، بس بساط بھر اپنے مقامی کے۔ ٹوکی ترائیوں میں چہل قدمی کر آتا ہوں۔ سوچتا ہوں، ترجمہ کرنے سے میرا مقصد تو پورا ہو گیا (خوش وقتی اور زبان کی کسی قدر بازیافت)، اب یہ چھپیں نہ چھپیں کیا فرق پڑتا ہے۔ خیر، میں جو کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اگر یہ آسانی سے اور سلیقے سے چھپ جائیں تو تھوڑی بہت دوڑ دھوپ کر سکتا ہوں ہفت اقلیم سر کرنے کا یارا اور ہمت نہیں اور نہ اپنے جسم ناتواں کو دیکھتے ہوئے اس کا بیڑا ہی اٹھایا ہے۔ اگر آپ کو کسی پبلشر کا علم ہو تو بتائیں، اس سے بھی رجوع کر کے دیکھ لیا جائے۔ لیکن میری کچھ شرطیں ہوں گی، جن میں مال وال شامل نہیں ہوگا۔ کچھ مل گیا تو ٹھیک، نہ ملا تو وہ بھی ٹھیک۔ میں نے الحمرا کی چند مطبوعات دیکھی تھیں اور وہ کم از کم صوری اعتبار سے پسند آئیں۔ میں نے شفیق ناز صاحب کو الحمرا کی ویب سائیٹ پر دیے ہوئے پتے پر ای۔میل بھیجی تو اس کا جواب نہیں آیا۔ ان کے ذاتی ای۔میل کا پتا میرے پاس ہے نہیں۔ ایک زمانے میں، جب ابھی الحمرا کا کام شروع نہیں ہوا تھا، انھوں نے مجھے کئی بار فون کیا تھا اور ای۔میل بھی بھیجے تھے۔ میں نے جواب بھی دیے تھے۔ لیکن ڈھونڈا تو پتا ملا نہیں۔ سو میں نے اپنی کر دیکھی، اس سے زیادہ کی استطاعت کی توفیق میرے خالق نے مجھے دی نہیں۔

بھائی، چوں کہ اشاعت وغیرہ کا ذکر چل نکلا ہے، آپ کو اگر چند معتبر اور معیاری جرائد کا علم ہو تو بتائیں، میں تراجم کے چند ٹکڑے انھیں بھیج دوں گا۔ اس طرح کچھ چیزیں لوگوں کے مطالعے میں آ جائیں گی۔ اس فہرست میں آپ ''بازیافت'' کو شامل نہ کیجیے گا۔ اس کے مدیر صاحب مجھ معصوم کے ساتھ بڑی اخلاق سوز ایکٹیوٹی کر چکے ہیں۔

آپ نے اپنے خط میں ''سمبل'' میں ضیا الحسن صاحب کے میلان کنڈیرا اور ''وجود'' پر کسی مضمون کا ذکر کیا ہے۔ یہ ''سمبل'' کی

کس اشاعت میں شامل ہے؟ (نئے شمارے میں تو نہیں)۔ میں بھی تو دیکھوں کہ کیا کہا گیا ہے۔ اس پر یاد آیا میں نے ''وجود'' کا جو عنوان پہلے رکھا تھا (''وجود کی نا قابل برداشت لطافت'') اب بدل دیا ہے۔ نیا عنوان ''وجود کی لطافت' جو اٹھائے نہ بنے'' ہے۔ یہی عنوان ناول کی دوسری قسط پر ہے جو ابھی حال ہی میں نے فرشی صاحب کو بھیجی ہے۔[فرشی صاحب کی رائے پر پرانا عنوان ہی رہنے دیا ہے۔] میں نے کنڈیرا کے ایک اور ناول کا ترجمہ بھی کر ڈالا ہے۔ اس کا عنوان رکھا ہے ''ہنسنے ہنسانے اور بھول جانے کی کتاب''۔

''ادھر کے تمام احباب کو میری طرف سے آداب ہو'' آپ نے لکھا ہے۔ بھئی یہ ادھر کون سے احباب ہیں جنھیں آداب بھجوا رہے ہیں؟ میڈیسن میں تو میرے سوا آپ کا کوئی ''احباب'' نہیں۔ اور اگر آپ کی مراد شمالی امریکا میں مقیم (عارضی یا تا ابد) پاکستانیوں کی آبادی سے ہے، تو میں اس ریوڑ سے نا آشنا ہوں۔ کل سے آج تک ۴۲ پاکستانی احباب کے ای ۔میل ملے کہ ذی شان ساحل اٹھ گئے۔ کیا قافلہ جاتا ہے... کیسا معصوم اور تر و تازہ شاعر تھا! غالب یاد آتا ہے:

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کیے

میرا خیال ہے یہ میرا خط بھی کچھ ضرورت سے زیادہ طویل ہو گیا ہے۔ اس کی ایک وجہ ہے۔ میں نے اسے لکھنے سے ذرا پہلے ہی دو دن لگا کر جاپانی محقق تشی ہیکو ازتسو کی کتاب Creation and the Timeless Order of Things کے چوتھے باب کا ترجمہ ختم کیا ہے، جس کا عنوان، ترجمے میں ''عین القضات ہمدانی کی فکر میں تصوف اور لسانی تشابہ کا مسئلہ'' ہے۔ یہ بڑی معرکتہ الآرا چیز ہے۔ روح ابھی تک اس سرشاری کے عالم میں ہے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ زبان بھی رواں ہو گئی ہے۔ میں نے سوچا کہ اپنی عادی چپ کے گھونگے میں لوٹنے سے پہلے ہی آپ کا قرض ادا ہو جائے، ورنہ آپ دوسطری خط پا کر مجھ پر بے مروت ہونے کا الزام دھریں گے۔ سو اپنی آبرو بچانے کی خاطر یہ لن ترانی ہو رہی ہے۔ سمع خراشی کے لیے معافی چاہتا ہوں۔

مخلص

—محمد عمر میمن

میڈیسن : ۱۳اپریل،۲۰۰۸

❁❁❁

تین

اعصاب کی تانت اور تنقیدی مباحث

پیارے عمر میمن:

آداب

بہت شکریہ بھئی کہ تحریر کی تصویر بنا لی اور یوں خط تک رسائی ہو گئی۔

نئے عہد کی ایک یہ بھی ''عطا'' ہے کہ ہم تحریر کو تصویر کی صورت دیکھنے کے عادی ہوتے جا رہے ہیں۔ یہاں تو اِن پیج سافٹ ویئر کی خرابی نے آپ کو تردد میں مبتلا کیا؛ میں بات اُس روّیے کی کر رہا ہوں جو ہمارے ہاں انٹرنیٹ کے زیرِ اثر متشکل ہو رہا ہے۔

خیر بات کہیں اور چل نکلے گی۔

پہلے تو آپ کا شکریہ ادا کرنا ہے فوری اور مفصل جواب کا۔

اور ہاں مجھے اپنے اعصاب کی تانت کے ساتھ کی بورڈ پر یوں بیٹھنا پڑا ہے کہ اس ''آپ'' کے لفظ نے چوکنا کیا ہوا ہے۔ سچ لکھوں گا: ''آپ'' کا لفظ لکھتے ہوئے میں اپنے بھیتر تک سے مودب ہو جاتا ہوں اور گھبرا کر کچھ کا کچھ لکھ جاتا ہوں۔ خیر مجھے اس کا التزام کرنا ہوگا کہ آپ کی طرف سے اس کا بطور خاص التزام ہوا ہے۔ (جی حساب تو برابر کرنا ہی پڑے گا۔) رہ گئی وہ تعریف جو مجھ سے رواں ہوگئی ہے تو بھئی یقین جانو یہاں ایسے لوگوں کی کمی نہ پاؤ گے جو مجھ سے نالاں ہیں کہ میں ان کی تعریف کرنے میں بخل سے کام لیتا ہوں۔ اس تعریف کو اس لیے سچا جان سکتے ہیں کہ مجھے آپ سے کوئی مطلب نہیں ہے۔ نہ ہی آپ نے مجھ پر اس سے قبل کوئی کرم کیا کہ بدلہ چکا رہا ہوں۔ مجھے جو چیز اچھی لگے، بے درنگ اچھی کہہ سکتا ہوں، چاہے وہ میرے دشمن کی جانب سے ہی کیوں نہ ہو۔

محبت کے ساتھ

——محمد حمید شاہد

اسلام آباد: ۱۶اپریل ۲۰۰۸

-x-x-x-

برادرم حمید شاہد،

تسلیمات۔

''آپ'' لکھ کر میں آپ کی فراوانیِ اظہار پر پابندی لگانے کا خواہش مند نہیں تھا۔ بس بچپن سے ایک عادت پڑی ہوئی ہے جسے اس عمر میں ترک کرنے کے لیے ایک نئی عادت ڈالنی پڑے گی۔ اس ''آپ'' کے پیچھے وہی محبت اور وفور تھا جو آپ کے ''تم'' سے جھانک رہا تھا۔ موجودہ خط میں آپ کچھ اس طرح سمٹ گئے ہیں کہ مجھے اپنے پر افسوس ہونے لگا۔ بھئی آپ مجھ پر یہ ظلم نہ کریں۔ میں نے کب لکھا تھا کہ مجھے ''تم'' سے مخاطب نہ کیا کریں۔ سو آپ وہی کریں جس کے عادی ہیں اور جس میں اپنا اظہار خلوص و محبت سے کر سکتے ہیں، اور میں وہی پیرایہ اختیار کروں گا جس کا عادی ہوں۔ لیکن اس کے پیچھے اپنے بارے میں نہ کوئی زعم ہے نہ زبردستی اپنی عزت کرانے کا شوقِ فضول۔ دراصل اپنی عزت آدمی خود کرتا ہے، دوسروں سے کروانے پر اصرار میرے حساب سے شوقِ خود نمائی کا ہی ایک مذموم شاخسانہ ہے۔ سو میرے بھائی، آپ بہرِ خدا مجھے شرمسار نہ کریں۔ سچ پوچھیے تو مجھے آپ کا خط بہت اچھا لگا تھا۔ آپ اپنے سے قریب نظر آئے۔ اب آپ خواہ مخواہ فاصلہ پیدا کرنے کے درپے ہو رہے ہیں۔ مجھے آپ کا میری کاوشوں کا مطالعہ اتنے انہماک سے کرنا اور ان سے عملی طور پر کچھ اخذ کرنا اتنا اچھا لگا تھا کہ میں نے سوچا کہ کیوں نہ آپ کو یوسا کے چند اور خط بھجوا دوں۔ کتاب جانے کب چھپے گی، اور یہ بھی طے نہیں کہ کبھی چھپے گی بھی۔ اور نہ یہ معلوم ہے کہ اس کی اگلی قسطیں کب اور کہاں نکلیں گی۔ اگر آپ چاہیں تو بھیج سکتا ہوں۔ اور کیا لکھوں۔ اچانک ایک تعطل کی سی کیفیت پیدا ہوگئی ہے۔ اسے بس اب آپ ہی دور کر سکتے ہیں۔

محبت کے ساتھ

آپ کا

——محمد عمر میمن

میڈیسن: ۱۶اپریل ۲۰۰۸

❁❁❁

چار

زندگی، عمومی سچ، تخلیقی عمل اور تنقید

پیارے عمر میمن:

آداب

یہ ''آپ'' والی کہانی تو میرے بچپن سے بھی جڑی ہوئی ہے مگر معاملہ یوں ہے بھائی کہ لکھتے ہوئے قلم اَپنے راستے پر چل کر آزادی خود حاصل کر لیتا ہے۔ کم از کم میرے ساتھ تو یہی ہوا ہے۔ میں شاید کسی کو ملتے ہوئے اور، سامنے آتے ہوئے، اُس کے لیے احترام کے سارے صیغے استعمال کروں گا کہ یہی میری تربیت کا تقاضا ہے مگر لکھتے ہوئے اور خصوصاً ایسے شخص کو، کہ جس سے کوئی ادبی قضیہ زیر بحث لانا مقصود ہو، قلم اپنی روش پر چل نکلتا ہے۔

چلو، اَچھا ہوا' تم نے کم از کم اِس باب میں مجھے آزادی دِے دِی۔ جب کبھی ملاقات ہوئی تو ''آپ، آپ'' کی خوب تکرار سے ''تم'' کی ناس ماردوں گا کہ شاید یوں ازالہ ہو جائے۔ (کیسا ہے؟ ایک ایسے آدمی سے آئندہ کی ملاقات کا تصور، جس سے اب تک کوئی ملاقات نہیں ہوئی۔ اوراس سے ایک وعدہ، جانتے ہوئے بھی کہ اس کا امکان زیادہ ہے' یہ ملاقات زندگی بھر نہ ہوگی۔)

تم نے یوسا کے مزید خطوط بھیجنے کی بات کی ہے۔ بھئی مجھے اِنتظار رہے گا۔ بس یوں ہے کہ انہیں ایک ایک کر کے بھیجتے رہو۔ میں لطف لے لے کر پڑھتا رہوں گا۔ رہ گئی بات ان پہلے دو خطوط کی تو یہ مجھے یوں اچھے لگے ہیں کہ ایک مدت کے بعد مجھے تخلیقی عمل کے ساتھ جڑی ہوئی تنقید پڑھنے کا موقع ملا ہے۔ تم تو جانتے ہی ہو کہ اِدھر ایک مدت سے تنقیدی تھیوریوں نے ایسا یبوست زدہ ماحول بنایا ہوا ہے' کہ تخلیقی عمل ایک پس ماندہ سی شے لگنے لگا ہے۔ جب تخلیق کا تصور محض ایک تحریر اور متن کے محدود تصور سے آگے نہ بڑھ سکے تو اس طرح کے سانحات کا ہو جانا لازم ہو جاتا ہے۔ پچھلے دنوں تنقید کی ایک کتاب جو لگ بھگ پانچ سو صفحات پر پھیلی ہوئی تھی، پڑھنے کا موقع ملا۔ اس کے مقدمہ کی پہلی سطر پڑھو گے تو خواہش ہوگی اپنے جبڑوں کو اوپر نیچے اُچھل جانے دو کہ حلقوم میں آیا ہوا قہقہہ باہر نکل سکے:

> ''تنقید کو اکثر تخلیق کے مقابل رکھ کر سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اِس کوشش کا نتیجہ تنقید کے حق میں عام طور پر اَچھا نہیں نکلا۔''

عجب ہٹ دھرمی ہے بھئی کہ معاملہ تو تم ادبی تخلیق سے کرنے چلے ہو اور اِس سے بچ نکلنے کا ارادہ بھی رکھتے ہو۔ تم یقین نہیں کرو گے مگر یہ واقعہ ہے کہ پوری کتاب پڑھ لینے کے بعد ایک تخلیق کار کی حیثیت سے مجھے شدید مایوسی ہوئی تاہم میں نے ہمت کر کے اِس موضوع کی درجنوں کتابوں کا مطالعہ کر لیا ہے اور اب اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اِس طرح کے مباحث لسانی فلسفے کی ذیل میں تو رکھے جا سکتے ہیں، حتیٰ کہ ایسی سرگرمیوں میں بھی شمار کیے جا سکتے ہیں جو ادب کی بھید بھری دنیا کے اردگرد ہوتی رہتی ہیں مگر انہیں تخلیقی عمل سے کوئی علاقہ نہیں ہوتا۔ دیکھو' وہ لوگ جو اپنی تخلیقی عمر گزار چکے ہیں' وہ اس طرح کی بانجھ مشقت میں پڑیں تو بات سمجھ میں آتی ہے کہ بے کار مباش کچھ کیا کر؛ ''نیفہ'' اُدھیڑ اور سیا کر' کے مصداق' ان کے پاس کرنے کو کچھ اور نہ ہوگا مگر تکلیف دہ بات یہ ہے کہ اس تنقیدی الجھیڑے میں پڑ کر ہمارا ایک آدھ ایسا نوجوان بھی ضائع ہو رہا ہے' جس کی صلاحیت اور محنت کو دیکھ کر

رشک آتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ بہت کچھ کر لینے پر قادر ہے مگر تنقید کے اس التباس میں پڑ کر ضائع ہوتے دیکھتا ہوں تو طبیعت پھیکی پڑتی ہے۔

میں، ان ساری کتابوں پر جو تنقیدی تھیوریوں کے بیان پر ہی تمام ہو جایا کرتی ہیں، یوسا کی باتوں کو ترجیح دینے پر خود کو مجبور پاتا ہوں تو شاید اس کا سبب یہ ہے کہ میرے لیے تخلیقی اسلوب حیات کو اپنا لینا، محض ادبی کارکن ہونے پر مقدم ہو گیا ہے۔ میں اسی اسلوب حیات کی بات کر رہا ہوں جس کی طرف یوسا نے پرلطف اشارے کیے ہیں۔ یہ اسلوب حیات کیوں کر اِختیار کیا جاتا ہے۔ یہ سوال بجاطور پر بہت اہم ہو گیا ہے۔ یعنی لکھنے کی تاہنگ اور وہ بھی ان موضوعات پر جو لکھنے والے کے اپنے لہو کے ساتھ رگوں میں گردش کر رہا ہو۔ یہ لہو میں گردش کا معاملہ سلجھانے کے لیے مجھے وہ مثال یاد آ رہی ہے جو کل ہی حلقہ ارباب ذوق، اسلام آباد، کے اجلاس میں ایک افسانے پر بات کرتے ہوئے سامنے آئی تھی۔ جو افسانہ پیش ہوا اس میں مواد کی فراوانی تھی، موضوع بھی بڑی وضاحت سے بیان ہوا تھا، وہ بیانیہ بھی برا نہ تھا مگر وہ اسلوب حیات والی بات یہاں نظر نہ آتی تھی۔ ایسے میں کہا گیا کہ اس افسانے کی مثال ایسے ہی ہے جیسے آپ میں سے کسی نے بازار کے بیچ مگر کچھ دیر پہلے چلنے والی گولی کی بابت سنا ہو۔ اور آپ کو یہ بھی بتایا گیا ہو کہ چار آدمی قتل ہو گئے تھے۔ آپ کو شدید دکھ ہو گا۔ اور چوں کہ آپ نے وہاں اپنی آنکھوں سے سڑک پر گرا ہوا خون بھی دیکھا تھا لہٰذا اس دُکھ نے آپ کو شدید متاثر بھی کیا ہو گا۔ آپ گھر آ گئے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اس واقعہ کو لکھ ڈالیں۔ یوں ایک کہانی بن جاتی ہے۔

اس طرح بننے والی کہانی کو اس کہانی سے مماثل قرار دیا گیا جو حلقہ ارباب ذوق میں تنقید کے لیے پیش کی گئی تھی اور پھر کہا گیا کہ اب ذرا قتل والے واقعہ کے آخری جملے میں تبدیلی کر لیں۔ گھر پہنچنے کے بعد آپ پر کھلتا ہے کہ مرنے والوں میں ایک آپ کا بھائی ہے۔ لیجئے اب آپ لکھنا بھی چاہیں گے تو اس پہلے والی سہولت کے ساتھ نہ لکھ پائیں گے۔ وہ سانحہ جو باہر تھا اب آپ کے بھیتر میں اُتر گیا ہے۔ جب ایک ضروری توقف کے بعد آپ اسے کہانی کی صورت لکھ پانے کے قابل ہوں گے تو موضوع آپ کے لہو میں شامل ہو جائے گا۔ میں سمجھتا ہوں فکشن اور بطور خاص افسانے میں یوں کسی موضوع کے ساتھ جڑ جانا اور اس میں ایک تخلیقی توقف کا التزام بہت اہم ہوتا ہے۔ میں اسے اس عمل سے مختلف سمجھتا ہوں جس میں لکھے جانے والے کردار کی کھال میں بیٹھ جانے کی بات کی جاتی ہے۔ اس لیے جان من کہ محض دوسروں کی کھال اوڑھ کر نظارہ کرنے والا اس کردار کی روح میں نہیں اتر سکتا۔

اب اگر ہم تخلیقی عمل کی پراسراریت سے اپنی زندگی کو جوڑنے کے لائق ہو گئے ہیں تو ہمیں یوسا کی ''ادبی ووکےشن'' والی بات سہولت سے سمجھ آ سکتی ہے۔ اس تمہید کے بعد میں یہ کہنا چاہوں گا کہ تم نے جہاں جہاں اسے ادبی ''شغل'' لکھا ہے وہاں وہاں میں اَپنے اَندر بے اِطمینانی سی پاتا رہا ہوں۔

یوسا کی یہ بات بھی مان لینے کے لائق ہے کہ ادبی ووکےشن محض انتخاب سے آدمی کا مقدر نہیں ہوتا اور نہ ہی محنت اور صرف محنت سے یہ ہاتھ آتا ہے۔ انتخاب اور محنت اس باب میں دوسری منزل میں آتے ہیں جب کہ اولیت داخلی میلان کو حاصل ہے۔ مجھے یہاں ہنری جیمس کی کہی ہوئی ایک بات یاد آتی ہے جس کے مطابق ''تجربہ کبھی محدود نہیں ہوتا اور نہ ہی یہ مکمل ہوتا ہے''۔ وہ لکھنے والے جو محنت اور تجربے سے ہی کام چلانا چاہتے ہیں اور انہیں لکھنے کو اسلوب حیات بنا لینے پر اس لیے قدرت نہیں ہے کہ ان کا داخلی میلان اس نہج پر خلق ہی نہیں ہوا؛ وہ کہانی کو محض واقعے کی سطح پر لکھنے پر قادر ہوتے ہیں۔

جب کہ داخلی میلان رکھنے والے کے لیے یہ تجربہ جو بظاہر نامکمل ہوتا ہے اس کی حسیات کے اندر دور تک تحلیل اور خوب گہرا جذب ہو جاتا ہے۔

میں جانتا ہوں کہ میری بات طول پکڑ گئی ہے مگر اس کا کیا کروں کہ مجھ پر اپنی بات مکمل کرنے کا جنون سوار ہو چکا ہے۔ میں سوچتا ہوں جن دنوں میں نئی تنقید پڑھ رہا تھا تو مجھ پر ایسا دورہ کیوں نہ پڑا تھا۔ کیوں؟ آخر کیوں؟ مجھے صاف صاف یاد بھی نہیں ہے کہ تب میں نے کیا پڑھا تھا؟ ہاں بس اُلجھنا یاد ہے۔ رولاں بارتھ کے مصنف کی موت والے مضمون نے بھی مجھے کم نہیں اُلجھایا تھا۔ ادھر دیکھو یوسا کو پڑھ کر ایسا نہیں ہوتا کہ وہ فکشن کے موضوع کے حوالے سے کتنی پرلطف اور روشن روشن باتیں کر رہا ہے۔ رولاں بارتھ نے تو سرے سے موضوع کو مانا ہی نہیں تھا۔ اس کے ہاں موضوع کے غیاب کا دعویٰ ملتا ہے۔ میں اِس مضحکہ خیز دعویٰ کو فلسفیانہ موشگافی سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتا۔ بھلا تم خود ہی کہو، ایسی بے تکی صورت حال پر کیسے ایمان لایا جا سکتا ہے جس میں ''تحریر ایسی مبہم، مخلوط اور زاویہ مستقیم سے گریزاں وسعتِ امکانی ہو جاتی ہے جہاں موضوع غائب اور پہچان ختم ہو جاتی ہے۔'' چوں کہ بارتھ نے مصنف کو مار کر اس کے تخت پر قاری کو بٹھانا تھا لہذا اس نے اس منفی بنیاد پر مصنف کو قربان کر دیا۔ (اپنے انتظار حسین نے اس حوالے سے ایک خوب تبصرہ کیا تھا۔ دُکھ جھیلیں بی فاختہ اور انڈے کوے کھائیں۔) میں نے اپنے ادبی مطالعے میں اس سے زیادہ گمراہ کن بیان نہیں پڑھا اور تکلیف دہ بات یہ ہے کہ اِس مجہول بیان نے ہمارے ہاں ایک ایسی بھیڑ کو گمراہ کیا ہے جو ہل لا لا کر کے تنقید پر ٹوٹ پڑی ہے۔ کچھ اس بے ڈھب انداز میں کہ پوری ربع صدی ہو چلی ہے اس نے مصنف کیا، تخلیق پاروں کو بھی ڈھنگ سے دیکھنا پسند نہیں کیا ہے۔ یوسا نے میرے اندر کے دُکھ اور غصے کے لاوے کو پھوٹ بہنے کا راستہ دِے دِیا ہے تو یوں ہے کہ میں رولاں بارتھ کو مندرجہ ذیل بیانات بدل دِینے کا مشورہ دِے رہا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ فکر میں اس ترمیم کے بغیر تخلیقی بھید کو سمجھا ہی نہیں جا سکتا:

رولاں بارتھ کے بیانات	مجوزہ ترمیم کی صورتیں
= لکھنا دراصل ہر نقطہ آغاز کا ختم کر دیا جانا ہے۔	= لکھنا عدم کو وجود میں لانا اور نامکمل کو تکمیل کی طرف لے جانا ہے۔
= تحریر درحقیقت وہ مبہم، مخلوط اور زاویہ مستقیم سے گریزاں وسعتِ امکانی ہے، جہاں ہمارا موضوع ختم ہو جاتا ہے اور اس منفیت کی ابتدا خود تحریر کرنے والے سے ہوتی ہے۔	= ادبی تحریر درحقیقت ابہام سے تخلیقی ابہام، اکہرے پن سے معنیاتی انضباط اور خط مستقیم سے وسعت کی جانب رواں وہ وسعت امکانی ہے جہاں ہمارا موضوع قائم ہو جاتا ہے اور اسی اثبات کی ابتدا خود تحریر کرنے والے سے ہوتی ہے۔
=مصنف اپنی موت کی طرف بڑھتا ہے، تحریر کا آغاز ہوتا ہے۔	= مصنف اپنی شناخت مستحکم کرتا ہے؛ تحریر کا آغاز ہوتا ہے۔
= یہ مصنف نہیں زبان بولتی ہے۔	= زبان گونگی ہوتی ہے یا پھر معنی کی سطح پر مڑھی ہوئی جھلی کی طرح، یہ مصنف ہی ہے جو اسے ڈھنگ سے بولنا سکھاتا اور اس پر معنیاتی امکانات کھولتا ہے۔
= تحریر چوں کہ مسلسل معنی فرض کرتی رہتی ہے لہذا اس میں سے پہلے معنی خارج/معطل ہوتے رہتے ہیں۔	=ادبی تحریر چوں کہ مسلسل معنی جذب کرتی رہتی ہے لہذا اس کے اندر معنیاتی سلسلہ قائم ہو جاتا ہے یوں پہلے سے موجود معنی خارج نہیں ہوتے ان میں توسیع اور نمو ہوتی رہتی ہے۔

= قاری وہ راس نشین ہے جو مصنف کی حیات میں توسیع اور اس کی پہلی سے موجود شناخت کی نمو کا وسیلہ بنتا ہے۔	= قاری کی پیدائش، مصنف کی موت کی قیمت پر ہونی چاہیے۔

لو، پیارے اَب لگتا ہے میرا اپھارہ کم ہوا۔ اب میں سہولت سے یوسا کی اس بات کی طرف لوٹ سکتا ہوں جو اس نے اسٹرپر کے حوالے سے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ یوسا نے کتنی سہولت سے یہ سمجھا دیا ہے کہ اسٹرپر میں تماشا گر ایک ایک کر کے اپنے کپڑے اتارتا (کاش یہاں ''اتارتی'' ہوتا) چلا جاتا ہے جب کہ ناول میں یہ تماشا معکوس شکل میں ہوتا ہے۔ میں نے اس بات کو یوں سمجھا ہے: ایک عام تحریر، جو لغاتی معنی کے جبر سے نہیں نکل سکتی اسٹرپر کی مثل ہے۔ ادھر الفاظ ادا ہوتے ہیں ادھر ایک ایک کر کے جسم پر سے کپڑے اترتے چلے جاتے ہیں۔ جملہ مکمل ہوتے ہی معنی مکمل طور پر ننگے ہو کر سامنے آجاتے ہیں۔ مجھے یہاں پشکن کا جملہ یاد آتا ہے؛ ''آہ ننگی حسین نہیں ہوتی، کھٹکتی ہے'' تو یوں ہے میرے بھائی ادب میں یہ ننگا پن نہیں چلتا۔ ننگے بدن کو ایسا مہین لباس پہنائے چلے جانا ہی وہ تخلیقی بھید ہے جس سے چھلکتے بدن کی ہر جھلک، ایک نئی اشتہا کو مہمیز کرے۔ اب تم ہی کہو یہ نئی جھلک جو تم دیکھو گے، بھئی اسی مہین لبادے سے، یا پھر جن قوسوں، گولائیوں اور گداز کو دیکھ رہے ہو کیا یہی مصنف نہیں ہے؟ بھئی یہی تو وہ جادوگر ہے جو مر کر بھی نہیں مرتا کہ اس نے تمہارے (قاری کے) اندر ایک اشتہا اور لذت رکھ دی ہے۔

جی، فکشن کے باب میں یوسا کی ایک بات سے اختلاف کا موقع نکل آیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں، اس کی بات کہ ''فکشن ایک ایسی چیز ہے جو سچی نہیں تاہم سچی ہونے کا سوانگ بھرتی ہے'' بھی لائق ترمیم ہے۔ اس باب میں ایک جملہ میں تواتر سے لکھتا آیا ہوں اسی کو نقل کر رہا ہوں۔

''فکشن وہ عظیم سچائی ہے جو زندگی کے عمومی سچ پر حاوی ہو جاتی ہے۔''

یوسا نے درست کہا تھا: خط کے لیے، جچا تلا اختصار ضروری ہوتا ہے۔ میں کہاں سے کہاں نکل گیا۔ معذرت قبول کرو۔

محبت کے ساتھ

— محمد حمید شاہد

اسلام آباد: ۱۹اپریل ۲۰۰۸

-x-x-x-x-

برادرم حمید شاہد

السلام علیکم۔

بے حد مفصل خط ملا۔ شکریہ۔ میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ جواب میں لکھوں تو کیا لکھوں۔ ہنوز آپ کے باریک بین مطالعے اور جس عقیدت اور سنجیدگی سے آپ ادب کے سامنے دوزانو ہو کر بیٹھتے ہیں اسی پر حیرت کر رہا ہوں۔ کاش ہمارے بیش تر پڑھنے اور لکھنے والوں کو آپ کا چلن آجائے! مجھ پر تو آپ کے وسیع مطالعے کا اچھا خاصا رعب جم گیا ہے۔ آپ کے مقابلے میں بہت کم پڑھا لکھا آدمی ہوں۔ اور یہ میں مشرقی کسرِ نفسی کے کسی دورے کی گرفت میں آ کر نہیں لکھ رہا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ میرا مطالعہ کافی محدود ہے۔ پھر تنقید و نقید مجھے فطری طور پر بھاتی بھی نہیں۔ خیر، اب ایسا بھی نہیں کہ تنقید سے بالکل ہی استغنا برتتا ہوں۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ تنقید بھی اسی قسم کی پسند آتی ہے جس میں تخلیقی تجربے کا نچوڑ ہو۔ یوسا کے خطوط مجھے اسی لیے پسند آئے تھے۔ رولاں بارتھ قسم کی مخلوق مجھ سے ہضم نہیں ہوتی۔ سو آپ نے اگر مجھ سے اپنے اٹھائے ہوئے نکات کے سلسلے میں کسی

وافی وشافی بحث کی توقع کی تھی تو آپ کو مایوسی ہوگی۔ مجھے اس کا افسوس ہے، لیکن میں وہی ہوں جو ہوں۔ اپنے آپ کو بدلنا چاہوں تو بھی نہیں بدل سکتا۔ اگر کوشش کی تو منہ کی کھانی پڑے گی۔ اس عمر میں آپ مجھے رسوا ہوتا ہوا دیکھ کر خوش تو نہیں ہو سکیں گے۔

مجھے خوشی اس بات کی ہے کہ آپ کو بھی یوسا کی باتیں پسند آئیں۔ اس سے بہت ہمت بندھی۔ آپ نے کردار کی روح میں اتر جانے والی بات خوب کہی ہے۔ بالکل، ایسا ہی ہونا چاہیے۔ بھائی میں خود بھی ووکیشن کے لیے ''شغل'' کے استعمال سے مطمئن نہیں ہوں۔ سلیم الرحمٰن گواہ ہیں، میں نے ان سے بھی اس سلسلے میں مدد لی تھی۔ چکر یہ ہے کہ اول تو میری اردو بے حد ناقص ہو چلی ہے، اور پھر بعض اوقات اردو میں مناسب مترادفات ملتے بھی نہیں۔ بھئی آپ مجھ سے تکلف وغیرہ نہ کیا کریں۔ اگر آپ کو کوئی بہتر لفظ معلوم ہو تو بتائیں۔ یوسا والی کتاب میں یہی ایک لفظ نہیں ہے جس نے مشکل پیدا کی، کئی اور بھی ہیں۔ میں آپ کو اس خط کے ساتھ یوسا کے اگلے تین خطوط بھیج رہا ہوں۔ آپ پڑھیے اور اگر کہیں بہتر لفظ مل جائیں تو فوراً مطلع کیجیے۔ احسان ہوگا۔ ایک بات اور: ان پر ایک اور نظرِ ثانی واجب ہے۔ جہاں جہاں دوسری زبانوں سے اسم معرفہ یا عنوانوں کے نام استعمال ہوئے ہیں، وہ اردو میں اپنے ہجوں کے لحاظ سے مستند نہیں۔ میں اس سلسلے میں ایک صاحب سے مدد لینے والا ہوں، اور پھر انھیں درست کروں گا۔ لیکن جہاں تک متن کے ترجمے کا تعلق ہے، میرے خیال میں آپ اس پر کم وبیش بھروسا کر سکتے ہیں۔

اب ایک مزے کی بات سنیے: جس دن آپ کا خط ملا اسی دن فرشی صاحب کا خط بھی آیا۔ لکھا کہ پہلے بعض وجوہ کی بنا پر انھیں یوسا کے خط ''سمبل'' میں قسط وار چھاپنے میں تامل تھا، لیکن لوگوں نے پہلے دو خطوں کو کافی پسند کیا ہے اور اب وہ تین خط اگلے شمارے میں اور چھاپنا چاہتے ہیں۔ واللہ، اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ یہی خط میں آپ کو بھیج رہا ہوں۔ آپ سب سے پہلے پڑھ لیں گے۔ دیکھا آپ نے، دوستی کام آ گئی۔ آپ کو یوسا کی اس بات سے اختلاف ہے کہ ''فکشن ایک ایسی چیز ہے جو سچی نہیں تاہم سچی ہونے کا سوانگ بھرتی ہے۔'' میرے خیال میں تو یہ اختلاف کی بات نہیں۔ جہاں تک میں اسے سمجھ سکا ہوں، وہ صرف یہ کہنا چاہتا ہے کہ فکشن تخیل کا کارخانہ ہے۔ اس لحاظ سے اسے حقیقت نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن اس کا کمال یہ ہے کہ یہ اپنی قوتِ ترغیب کے زور پر حقیقت نظر آنے لگتا ہے (یا ایک متبادل حقیقت وضع کرتا ہے جو کسی لحاظ سے بھی حقیقی حقیقت سے قدر و قیمت میں کمتر نہیں ہوتی)۔ اصل میں یہ بحث زیادہ تفصیل سے ''قوتِ ترغیب'' والے خط میں ہوئی ہے، اور وہ میں آپ کو بھیج رہا ہوں۔ آپ کا قول بھی اپنی جگہ پر درست ہے: ''فکشن وہ عظیم سچائی ہے جو زندگی کے عمومی سچ پر حاوی ہو جاتی ہے۔'' میں بس ایک لفظ کا اضافہ کروں گا: ''کام یاب'' (کام یاب فکشن الخ)۔ اگر یہ اضافہ کر لیا جائے تو پھر قوتِ ترغیب والی بات سمجھ میں آنے لگتی ہے۔

آصف فرخی صاحب لکھتے ہیں کہ تازہ ''دنیازاد'' نکل آیا ہے۔ اس میں میرا کیا ہوا ایک جاپانی محقق کا ترجمہ شامل ہے۔ ذرا پڑھیے گا۔ مجھے تصوف کی مابعد الطبیعیات سے عشق ہے۔ ہو سکتا ہے اس کی وجہ یہ ہو کہ عمر بڑھتی جا رہی ہے۔

امید ہے کہ آپ بہ خیر و عافیت ہوں گے۔

والسلام

— محمد عمر میمن

میڈیسن: ۲۴ اپریل ۲۰۰۸

❁❁❁

پانچ

فکشن میں اسلوب کا مسئلہ

پیارے عمر میمن:

آداب

تمہارا خط ملا اور بعد میں یوسا کے خطوط کی اگلی کھیپ۔

آہا، تیسرا خط پڑھتے ہی مزا آ گیا۔ اس باب میں مجھے جو کچھ سوجھ رہا ہے تمہیں بتانا چاہتا ہوں۔ پہلے تو اس مہربانی کا فوراً شکریہ قبول کرو کہ تمہاری بدولت میں یوسا کو پڑھ رہا ہوں اور پھر بتانے دو کہ مجھے واقعی پورے تخلیقی عمل کو اس ڈھب سے دیکھنے میں مزا آ رہا ہے۔ رہ گئی رُعب جمنے یا جمانے کی بات، تو خدارا مجھے اِس گھناؤنے جذبے سے الگ ہی رکھو کہ میں تو اِس سارے بھید کو سمجھنے کے جتن کر رہا ہوں جو ایک تخلیق کار کے نصیب میں لکھ دِیا گیا ہوتا ہے۔ میں اسے نصیب کے ساتھ اس لیے نتھی کر رہا ہوں کہ تخلیقی عمل کے ساتھ جڑنا جس کی سرشت میں لکھا ہوا نہیں ہوتا وہ محض مشاہدے، مشقت اور ریاض سے، اسے اس سطح پر حاصل نہیں کر سکتا جسے تخلیقی وفور کہتے ہیں۔ تخلیقی عمل جب زندگی کرنے کے آہنگ سے جڑ جاتا ہے تو یہی اس تخلیق کار کا اسلوب ہو جایا کرتا ہے۔ دوسرے معنوں میں تم کہہ سکتے ہو کہ ہر حقیقی تخلیق کار کا اُسلوب خود بہ خود اُس کی زندگی بتانے کے قرینے سے پھوٹتا ہے۔ جب کہ کوشش اور ریاض سے دوسروں کی پیروی میں اپنے لیے اسلوب گھڑنے والے اس کوّے کی مثل ہیں جو ہنس کی چال چلنا چاہتا ہے اور اَپنی چال بھی گنوا بیٹھتا ہے۔

بات رُعب جھاڑنے سے چلی اور اَسلوب کی طرف لڑھک گئی، مجھے معاف کر دینا کہ میں اِس خط کے آغاز میں ہی اِدھر اُدھر بھٹکنے لگا ہوں۔ تاہم جو بات میں کہنا چاہتا تھا وہ یوں ہے کہ ایک سچے تخلیق کار کا مسئلہ رُعب کا بوجھ دوسروں پر لادنا نہیں ہوتا۔ سچ پوچھو تو جو شخص اپنے آپ کو عالم سمجھنے لگے تخلیق کی دِیوی اُس سے رُوٹھ جایا کرتی ہے۔ یہاں معاملہ فکشن کے متن کی تعمیر کا ہے یعنی موجود سچ سے کہیں بڑے سچ کی تعمیر کا معاملہ۔ اس دِیار کے داخلی دروازے پر ''جھوٹوں کا داخلہ ممنوع'' کی تختی لگی ہوئی ہے۔

ہاں تو تم نے لکھا ہے کہ تمہیں تنقید بھی اسی قسم کی پسند آتی ہے جس میں تخلیقی تجربے کا نچوڑ ہو، کیا خوب بات کہی۔ مجھے تعجب نہیں ہوا، اچھا لگا ہے۔ جس کا یہ چلن ہو وہ تخلیقی عمل سے کٹی ہوئی تنقید کے نام پر اٹھائی گئی بانجھ فلسفیانہ اور مہمل تحریروں کو کیوں کر پسند کرے گا اور اس کارِ زیاں میں اَپنا وقت کیوں برباد کرے گا۔ مجھے یوسا کے خطوط نے مشتعل کیا تھا اور وہ تند و تیز سوالات جو مجھے بے چین رکھے ہوئے تھے، میں نے تمہاری طرف لڑھکا دِیے۔ میں اب تمہارا اور اپنا وقت اس قسم کے حوالوں اور سوالوں سے برباد نہیں کروں گا۔

ایک ہی جست میں یوسا کی طرف آتا ہوں؛ لو آ گیا۔ تم نے ''کردار کی روح میں اُتر جانے والی'' میری بات کو لائق اِعتنا جانا، مجھے حوصلہ ہوا۔ رہ گیا یہ قضیہ کہ ''ووکیشن'' کے لیے ''شغل'' نہیں تو کون سا لفظ ہونا چاہیے؟ بھئی سچ پوچھو تو میں تراجم کی طرف راغب ہوا تھا اور فوراً اِدھر سے اِس لیے بھاگ نکلا کہ مجھ میں وہ الفاظ جو بطور اصطلاح اِستعمال کیے جا رہے ہوتے ہیں، اُن کا یک لفظی یا کسی متبادل ترکیب میں ترجمہ کرنے کا سلیقہ نہیں تھا۔ میں نے دیکھا ہے کہ ہمارے ہاں ترجمہ کار اِصطلاحات کا ترجمہ کرتے وقت ترکیب سازی سے اصطلاح وضع کر لیا کرتے ہیں۔ میں نے تمہارے ہاں یہ صلاحیت دیکھی

ہے۔محمد سلیم الرحمٰن کے ہاں بھی ایسا چلن پایا گیا ہے، جو مجھے اچھا لگتا ہے۔اس باب میں، میں بہت اناڑی ہوں۔ مجھے غلط یا صحیح یہ تو سوجھ جاتا ہے کہ یہاں کوئی اور لفظ ہونا چاہیے؛ مگر کونسا؟ میں اس باب میں بُری طرح ناکام ہو جاتا ہوں۔ مثلاً یوسا کی طرف سے اِصطلاح کےطور پر برتے گئے اسی ''ووکیشن'' کو لے لو۔اس کے ایک معنی ''شغل'' کے بھی ہیں۔مگر یوسا نے جس طرح اِس اِصطلاح کے لیے فضا بنائی ہے اس میں اِس کے معنی نہ تو محض شغل کے رہتے ہیں، للک کے اور نہ ہی پیشہ اور کسب کے، کہ یہ اِصطلاح ایک ہی وقت میں لکھنے والے کی قدرت، طبعی میلان اور دھیان کے اِرتکاز کی طرف اِشارے کرتی ہے۔

یہ جان کر مجھے اچھا لگا کہ ''سمبل'' میں یوسا کے خطوط شائع ہوتے رہیں گے۔بھئی میں تو حیران تھا کہ اس باب میں پہلے تامل کیوں کیا گیا تھا۔ مجھے واقعی یوسا کی اس بات سے اِختلاف ہے کہ فکشن سچی ہونے کا سوانگ بھرتی ہے۔اِس کا جواز میں بتا چکا ہوں۔تاہم میں اس باب میں اضافہ کرنا چاہوں گا کہ فکشن کا یہ فریب بھی لگ بھگ ویسا ہی ہوتا ہے جیسا کہ حضرت غالب کے نزدیک ہستی کے فریب کا تھا:

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد

عالم تمام حلقہ ء دام خیال ہے

دیکھو! یہاں غالب نے جس حقیقت کو بیان کیا ہے وہ موجود حقیقت سے کتنی بڑی ہو گئی ہے۔ پیارے، یہی معاملہ فکشن نگار کی کائنات کا ہے۔ کہنے کو جھوٹی مگر اپنی اصل میں کہیں بڑی حقیقت سے جڑ جانے والی۔ مجھے لفظ ''سوانگ'' پر اعتراض ہے۔دیکھو کہ اتنی بڑی کائنات جسے ماہرین طبیعیات ٹھونک بجا کر حقیقی قرار دے چکے ہیں مگر جو اپنے مرزا نوشہ کو فریب لگتی ہے؛ یہ بھی تو تخیل کے ایک کارخانے سے پھوٹی ہے۔اب یہ تمہارے اور میرے سمیت' ہے بھی اور نہیں بھی۔مگر ہم اپنے وجود کو جس حد تک دریافت کرتے یا جس حد تک اس کائنات کے بارے میں اپنا گمان باندھتے چلے جاتے ہیں اتنا اتنا ہم اپنے آپ پر اور کائنات ہم پر کھلتی چلی جاتی ہے۔فکشن کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔اس کے ذریعہ واقعہ کی ایک صورت بیان ہو رہی ہوتی ہے اور معنیاتی سطح پر، متن کی باطنی ساخت میں اس سے کہیں بڑی حقیقت تخلیق ہو رہی ہوتی ہے۔ ڈیپ اسٹرکچر میں ''بڑی سچائی'' رکھے بغیر واقعہ کو فکشن میں منقلب کیا ہی نہیں جا سکتا۔

تم درست کہتے ہو اسے حقیقت نہیں کہا جا سکتا۔ہاں اسے محض حقیقت کہنا نامناسب ہو گا۔میں نے کہا نا یہ معلوم حقیقت سے بڑی حقیقت ہوتی ہے۔ بالکل یوں جیسے شجر پھوٹتا بیج ہی سے ہے مگر اس کی جڑیں زمین میں گہرائی تک اُتر جاتی ہیں اور شاخیں آسمان کی وسعتوں کو چھونے لگتی ہیں۔میں کبھی کبھی فکشن کو اسی شجر طیب سے تعبیر کرتا ہوں اور فکشن کی تخلیق کو عمل خیر سے جوڑ لیا کرتا ہوں کہ کائنات کی حقیقتوں اور سچائیوں کی تفہیم کے جتن کرنا اور فرد کو اس کی باطنی مسرت سے ہم کنار کرنا عمل خیر ہی تو ہے۔

یوسا کا یہ خط بھی پہلے دو خطوط کی طرح دل چسپ ہے۔میں ان کے نشے میں ہوں تاہم آگے بڑھنے سے پہلے جس ترکیب نے مجھے اُلجھن میں ڈالا ہوا ہے اُس کی طرف تمہارا دِھیان چاہوں گا۔ یہ ترکیب ہے ''قوّتِ ترغیب''۔ میں نہیں جانتا کہ جس لفظ سے تمہارے ہاں یہ ترجمہ ہو کر آئی ہے اس میں سے ''راسخ ہونے'' اور ''دِل نشین ہو جانے'' کے معنی نکلتے ہیں یا نہیں مگر یوسا کی تحریر سے مجھے یوں لگتا ہے اُس اصطلاح میں کہ جو فی الاصل اُس نے برتی ہوگی، فن پارے کے اندر ترغیبی قوت سے کہیں زیادہ فکشن کی وہ قوت مراد ہوگی جو قاری کو اپنے عظیم سچ پر یقین لانے پر مجبور کر دیا کرتی ہے۔ دراصل ترغیب کی قوت تخلیقی تحریروں سے کہیں زیادہ تبلیغی تحریروں یا مقصدی مضامین کا وصف ہوتی ہے۔ چوں کہ ''ترغیب'' کے لفظ

میں لالچ دینے، کسی کام پر آمادہ کرنے کے معنی شامل ہوتے ہیں جو قوت کے ساتھ جڑ کر مزید شدید ہو جاتے ہیں لہٰذا میں اس عمل کو جس میں قاری فکشن کے سچ پر ایمان لے آیا کرتا ہے، قوت ترغیب والی اصطلاح سے تعبیر کرنے میں اپنی طبعی رجحان کی وجہ سے رکاوٹ محسوس کر رہا ہوں۔اس باب میں بھی، میں وہی مثال دینا چاہوں گا جو یوسا نے دی تھی؛ یعنی وہی ''دی میٹا مورفو سِس'' والی۔ایک معمولی سے مسکین دفتری گرے گورسَمسا کی کہانی جس کی ایک نفرت انگیز لال بیگ میں کایا کلپ ہو جاتی ہے۔تم نے کاکروچ کو تل چٹے سے تعبیر دی، یقیناً اس لفظ سے رات کو نکلنے والے کئی پتنگے مراد ہو سکتے ہیں مگر لال بیگ کو دیکھتے ہی جو کراہت کا گولا پیٹ سے حلقوم کی سمت اٹھتا ہے، تل چٹا پڑھ کر نہیں اُٹھتا۔ بظاہر یہ کہانی کتنا بڑا جھوٹ ہے اور بہ قول یوسا مضحکہ خیز بھی ہے۔تاہم کافکا نے جس طلسماتی انداز میں اِسے لکھا وہ ہمیں اس پر راغب نہیں کرتا کہ ہم بھی اس تکلیف سے گزریں بل کہ ہم گرے گورسمسا کے ساتھ ساتھ اس ذِلت سے گزرنے پر (چاہتے، نہ چاہتے ہوئے بھی) مجبور ہوتے ہیں۔گویا یہ ساری واردات ایک بڑا اسچ بن کر ہمارے بھیتر میں اُتر جاتی ہے۔

دیکھو، یہاں یوسا نے بھی گرے گورسَمسا کی ہول ناک دُرگت پر تہِ دل سے ''یقین'' کرنے کی بات کی ہے۔اس سے یگانگت محسوس کرنے اور اس کے ساتھ ساتھ تکلیف اٹھانے، اسی مایوسی سے اپنا دَم گھٹنے کی بات کی ہے۔قاری کے دفاعی نظام کو یوں توڑ دینے کا معاملہ کہ ایمان لانا یا تسلیم کر لینا لازم ہو جائے قوت ترغیب کے نہیں بل کہ متن کی تاثیر کے باب میں آئے گا۔اِسی تاثیر کا اِعجاز ہے کہ ہم گرے گورسَمسا کی کہانی پر یقین کر لیتے ہیں۔یوسا نے درست لکھا ہے کہ کافکا میں کسی حقیقت یا پھر غیر حقیقی صورتحال کو ایک بڑی حقیقت میں منقلب کرنے کی صلاحیت تھی؛ لفظوں، خاموشیوں، انکشافات، تفاصیل، معلومات کی تنظیم اور بیانیہ روانی کے ذریعے، جس نے قاری کے دفاعی نظام کو منہدم کر دیا اور اس نے ایک ایسی کریہہ صورتحال کے مقابلے میں اپنے تمام ذہنی تحفّظات کو پسپا ہونے دیا۔

ایسے میں اِنتظار حسین کی کہانی ''کایا کلپ'' کا تذکرہ کرنا بے جا نہ ہوگا۔اِنتظار حسین نے اس کہانی کو ۱۹۶۷ء میں شائع ہونے والے اپنے افسانوں کے مجموعے ''آخری آدمی'' میں شامل کیا تھا۔کہانی میں کافکا کا گرے گورسمسا' شہزادہ آزاد بخت ہو گیا ہے اور کافکا کے لال بیگ کو مکھی بنالیا گیا ہے۔یاد دِلا دوں کہ اس کتاب کا دیباچہ سجاد باقر رضوی نے لکھا تھا۔اس کا دعویٰ تھا:''افسانہ نگار نے داستان کی علامت کو نئے مفاہیم دینے کی کوشش کی ہے۔''انتظار حسین کی اس کہانی میں شہزادہ آزاد بخت مکھی کی صورت صبح کرتا ہے اور کہانی جوں جوں آگے بڑھتی ہے توں توں مکھی کی جون سے واپسی کا مرحلہ شہزادہ آزاد بخت پر کٹھن ہوتا چلا جاتا ہے۔حتیٰ کہ وہ رات آجاتی ہے جب شہزادی نے اسے مکھی بنائے بغیر تہ خانے میں بند کر دیا تھا۔دیو جو پہلے آدمی کی بو پا کر ''مانس گند، مانس گند'' چلاتا قلعے میں داخل ہوتا تھا، خاموش رہا کہ اب وہاں کوئی آدمی نہیں تھا۔یہ وہی رات بنتی ہے کہ جس کے بعد کوئی بھی منتر شہزادے کو مکھی سے آدمی کی جون میں نہ لا سکا۔سجاد باقر رضوی کا یہ بھی کہنا تھا:''یہ کہانی پڑھ کر آدمی اپنے اندر کی مکھی صاف دیکھنے لگتا ہے۔'' مگر میرے ساتھ عجب حادثہ ہوا ہے کہ اسے پڑھنے کے بعد مجھے کافکا کی کہانی کا گرے گورسمسا یاد آ گیا ہے۔

انتظار حسین نے اپنے ہاں کی کہانیوں اور داستانوں سے دیو، شہزادہ اور شہزادی کو لے کر جو منظر نامہ ترتیب دیا ہے اس سے جون بدلنے والی کہانی اپنی اپنی سی لگنے لگی ہے مگر مکھی کے روپ میں کایا کلپ کے پیچھے یہاں دو نیتیں کام کر رہی ہیں: ایک خوف کہ دیو جان سے مار ڈالے گا اور دوسری اس کی نظر سے چھپے رہنے کی چال۔جب کہ کافکا کی کہانی بہت گہرا وار کرتی ہے۔ذلت کے ساتھ زندہ رہے چلے جانے کی اذیت والا معاملہ خود بہ خود ہمارے اندر گھس جاتا ہے۔اپنے انتظار حسین کے

ہاں ساری کہانی کو بیانیے کے زور پر منوانے کے جتن ملتے ہیں۔ یوسا کے خط کی روشنی میں، میں دیکھتا ہوں تو اس کی وجہ بھی سمجھ میں آ گئی ہے۔ کافکا نے اپنی کہانی کا ڈیپ اسٹرکچر بنایا تھا، انتظار حسین نے اپنی کہانی کا محض سرفس اسٹرکچر بنانے پر ساری توانائی صرف کر دی ہے۔ مجھے انتظار کی زبان بہت بھلی لگتی ہے اور اسی نے مجھ سے یہ کہانی بھی پوری توجہ سے پڑھوالی تھی مگر جوں جوں وقت گزرتا گیا اس کی چمک ماند پڑتی گئی اور میں اسے کافکا کی کہانی سے الگ کر کے دیکھنے پر قادر نہ ہو سکا۔

پیارے دوست، میں یوسا کی تائید میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ فارم، کانٹینٹ اور تھیم کو اگر اپنا بیانیہ خود وضع نہ کرنے دیا جائے تو تخلیق میں تاثیر کا جوہر اپنی پوری جولانی نہیں دکھا پاتا۔ ہمارے ہاں ساٹھ کی دہائی کے افسانہ نگاروں نے اپنا اپنا اسلوب بنانے کی باجماعت شعوری کوشش کی۔ انہوں نے ان عناصر کے بہم ہونے کا انتظار کیے بغیر علامت اور تجرید کے نام پر جو لکھا اسے لفظی کرتب بازی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس زمانے کا زیادہ تر کام ساختہ ہونے کی وجہ سے تخلیقی تاثیر سے عاری محسوس ہوتا ہے۔ تاہم بیانیہ کو مردود قرار دینے والے اس زمانے میں بھی کچھ اچھے افسانوں میں ان عناصر کو باہم پیوست کرنے کی صورتیں نکال لی گئی تھیں اور یوں ان میں تاثیر کی کرامت پیدا کر لی گئی۔ جن دنوں میرے افسانوں کا دوسرا مجموعہ ''جنم جہنم'' آیا تھا ان دنوں منشا یاد نے ان تاثیر والے افسانوں کی جتنی تعداد بتائی تھی اس کی گنتی تو بس ایک ہاتھ کی انگلیوں پر تمام ہو جاتی ہے۔

بھئی اب تو مجھے یقین ہو چلا کہ میں ادھر ادھر بھٹکتا رہوں گا اور شاید ڈھنگ سے یوسا پر بات نہ ہو پائے گی۔ تم میری اس گم راہی پر مجھے معاف کر دینا اور جو بھی باتیں تمہارے مطلب کی نہ ہوں ان سے سرسری گزر جانا۔ ہاں تو بات یوسا کی قوت ترغیب کی ہو رہی تھی جسے میں نے اپنی سہولت کے لیے فی الحال تخلیقی تاثیر سے بدل لیا ہے۔ یوسا ہمیں اطلاع دیتا ہے کہ کہانی جس قدر تجربے میں آنے والی زندگی سے قریب ہوگی اور جس قدر اس تجربے میں آنے والی زندگی سے آزاد ہوگی اس میں تاثیر کی قوت اتنی ہی زیادہ ہوگی۔ اس باب میں ہم اسی لال بیگ والا قصہ سامنے رکھ سکتے ہیں۔ دیکھو کافکا کا گرے گورسَمسا جتنی ذلتیں اٹھا رہا ہے وہ ساری ہمارے تجربے اور مشاہدے کا حصہ ہیں۔ اسی طرح کاکروچ ہم نے دیکھ رکھا ہے اور اس سے کراہت بھی ہمارے تجربے کا حصہ ہے۔ وہ جو یوسا نے کہا کہ کہانی کو ہمارے تجربے میں آنا چاہیے تو یوں ہے کہ گرے گورسَمسا اور کاکروچ کا الگ الگ وجود ہمارے تجربے سے جڑا ہوا ہے مگر ایک کردار کی دوسرے کردار میں کایا کلپ کے لیے جو باریک کام کافکا کے ہاں ہوا ہے اس کے عقب میں یوسا والی یہی بات کام کر رہی ہے کہ اس تجربے کو خود مکتفی ہو جانا چاہیے۔ تو یوں ہے کہ کس نے آدمی کو کاکروچ بنتے دیکھا ہے؟ مگر ہمیں دیکھنا پڑتا ہے اور وہ کافکا کی کہانی سے باہر کہیں نہیں ہے۔ انتظار حسین والی کہانی کا ایک المیہ یہ بھی ہے مکھی تو ہم نے دیکھ رکھی ہے مگر دیو ہمارے تجربے کا حصہ نہیں ہے۔ شہزادے اور شہزادیاں بھی قصے کہانیوں کی مخلوق ہیں۔ اچھا مکھی کے حوالے سے اس کا غلیظ ہونا بھی ہمارے تجربے کا حصہ ہے۔ جب کہ انتظار کی کہانی میں محض اسے جسمانی سطح پر حقیر بنا کر کہانی کا کام نکال لیا گیا ہے۔ یوں ہمارا تجربہ جزوی طور پر چھوا گیا ہے۔

علامتی اور تجریدی کہانی والوں کا بھی یہی المیہ رہا ہے۔ وہ جس طرح کی زندگی بیان کرنا چاہتے تھے وہ قاری کے تجربے سے کٹی ہوتی یا پھر اوجھل ہوتی تھی۔ یہی سبب ہے کہ ان کی کہانیاں اس دنیا کا عکس تک نہ پیش کر سکیں جو ان کے قارئین تجربہ کرتے رہے ہیں اور یوں ایک دور افتادہ اور گونگی چیز بن گئیں۔ بہ قول یوسا: ایک ایسی اختراع جو ہمیں باہر دھکیل کر دروازہ بند کر دیتی ہے۔ تو یوں ہے پیارے کہ تاثیر پر میرا ایمان پختہ ہے اور یوسا کو پڑھ کر تو اور پختہ ہو گیا ہے۔ یوسا کی یہ بات بھی لائق توجہ ہے کہ فکشن حیرت انگیز ابہام کا نام ہے۔ ایک طرف وہ حقیقت کی غلام ہے تو عین اسی لمحے خود مختار اور خود کفیل بھی ہے اور لطف یہ ہے کہ یہ انہی اجزا سے

مرکّب ہے۔ میں ان اجزا کو مساوی نہیں کہوں گا کہ ان کے تناسب میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ لو ابھی تک اسی خط پر بات کر پایا ہوں اب چاہتا ہوں کہ اسلوب والے خط پر توجہ مرکوز کر دوں۔ اس پر بعد میں بات ہوگی۔ ''دنیازاد'' کا نیا شمارہ مل گیا ہے جس میں تشی ہیکو ازتسو کے مضمون کا ترجمہ ''وجودیت: مشرق و مغرب'' شامل ہے میں اسے پہلی فرصت میں اور توجہ سے پڑھوں گا۔

محبت کے ساتھ
— محمد حمید شاہد

اسلام آباد: ۳ مئی ۲۰۰۸

❁❁❁

جے

اسلوب اور زبان

پیارے عمر میمن: ....آداب

لو بھئی میں اب یوسا کے اسلوب والے خط پر بات کر سکتا ہوں۔

یہ موضوع ہم اُردو والوں کو ایسا بھایا ہے کہ ہمارے ہاں ہر گلی اور ہر محلے میں صاحبانِ اسلوب جوق در جوق ملنے لگے ہیں۔ ایک زمانے میں تو آدمی لکھنا بعد میں شروع کرتا اور صاحب اسلوب پہلے ہو جایا کرتا تھا۔ بعضوں کا اسلوب مشہور ہو گیا کوئی تخلیق مشہور نہ ہو سکی؛ وہ کیا کہتے ہیں: ایتَر کے گھر تیتر باہر باندھوں کہ بھیتر۔ صاحبِ اسلوب کہلوانے کی طلب اور لوبھ نے بہت اچھا لکھنے والوں کو گمراہ کیا اور انہوں نے اپنے آپ کو چند موضوعات کے لیے کسی ''اسلوب'' کے ہاں گروی رکھ لیا۔ خیر اب یوسا کو پڑھا ہے تو ایک بار پھر اس موضوع کی نزاکت، لطافت اور اہمیت کی طرف دھیان چلا گیا ہے۔

یوسا نے یہ جو کہا ہے کہ ناول لفظوں سے بنے ہوتے ہیں تو یوں ہے کہ کسی لکھنے والے کا ڈھنگ ہی بتا دیتا ہے کہ وہ کہانی کے متن کو تشکیل دیتے ہوئے اس کو کس رُخ سے آگے بڑھائے گیا۔ اسی سے تاثیر کی قوت (اور تمہاری وضع کردہ اِصطلاح میں قوتِ ترغیب) کے متن سے پھوٹنے کا تعین ہو جاتا ہے۔ یوسا نے یہ بھی درست کہا ہے کہ فکشن کا بیانیہ زُبان اور بیان دونوں سے مل کر بنتا ہے۔ یہ کہانی کا بیانیہ ہی ہوتا ہے جو میری نظر میں تخلیق کو تخلیق کار کی زِندگی سے پھوٹ کر الگ ہو جانے اور ''خود مکتفی'' ہونے کی صورتیں بتاتا چلا جاتا ہے۔ زُبان کے حوالے پر یوسا کا خط بہت دلچسپ ہو گیا ہے۔ ہمارے ہاں اکثر مباحث میں شاعر لوگ (خصوصاً غزل کے شعرا، جو خود ایک طرف تو روایتی زبان کے اسیر ہو جاتے ہیں اور دوسری طرف متقدمین کے ہاں سے رعائتیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر لاتے ہیں کہ اپنے لیے گنجائشیں پیدا کر سکیں) افسانہ نگاروں پر پھبتی کسا کرتے ہیں کہ اُنہیں زبان لکھنا نہیں آتی۔ یہی الزام بیدی سے لے کر آج تک چلا آتا ہے۔ یہ جو یوسا نے صحت کے تصور کو حذف کرنے کی بات کی ہے اور ہر بار، ہر عیب سے پاک، ٹھیک ٹھیک صرف و نحو کے پیمانوں پر آنکی ہوئی زبان کے استعمال کرنے کی للک سے پیدا ہونے والی خرابی کا ذکر کیا ہے تو یہ بھی سمجھ میں آنے والی بات ہے۔ اپنے موضوع کے لیے موزوں زبان کا انتخاب فکشن کے باب میں بنیادی مسئلہ بنتا ہے۔ جن دو باتوں کو یوسا نے فکشن کی زبان کے باب میں کام یابی کے بیانیہ کی ضمانت قرار دیا ہے (یعنی داخلی ربط اور اس کی ناگزیریت) واقعہ یہ ہے کہ ان کے بغیر زبان اور بیان کو سلیقے سے آگے بڑھایا ہی نہیں جا سکتا۔ بیان

بے ربط ہوسکتا ہے، زبان ناہموار ہوسکتی ہے مگر بیانیہ کہانی کی تطہیر کے بعد ایک ربط میں آ جانا چاہیے۔ بھئی کتنی پرلطف بات ہے ۔''ناول جو کہانی بیان کرر ہا ہے بے ربط ہوسکتی ہے، لیکن وہ زبان جو اس کی تشکیل کرتی ہے اسے باربط ہونا چاہیے''۔

یہاں یوسا نے ''یولیسس'' کی برمحل مثال دے کر اپنی بات خوب اچھی طرح سمجھا دی ہے۔ تم نے اس حصے کو خوب ترجمہ کیا ہے۔ سیل بے اماں، فسوں ساز قوت، سرگرداں شعور کی نقالی، گھڑنت جیسے مناسب اور برمحل الفاظ ڈھونڈ لانا، کہ بات اس طرح واضح ہوتی چلی جائے جیسی کہ اصل متن میں کہی گئی ہوگی، مانتا ہوں جی، تخلیق نو والا معاملہ ہے۔ خوب بھئی خوب۔

ادھر یوسا نے بھی اپنے خط کے اس حصے میں بڑے پرلطف اشارے کیے ہیں۔ ایک طرف اکڑی ہوئی اور کسی ہوئی مکتبی زبان کو رکھا ہے اور دوسری طرف تخلیقی زبان، کہ جس میں خوب گودا ہوتا ہے۔ اس کی یہ بات بھی تسلیم کی جانی چاہیے کہ بعض موضوعات کے لیے نک سک سے درست زبان ہی مناسب ہو جایا کرتی ہے۔ یہ جو اسلوب کو نفسِ موضوع کے مطابق ڈھال لینے کی بات ہے اس کو ہمارے فکشن نگاروں کو پلو میں باندھ کر رکھنا ہوگا۔ ایک بار پھر داد وصول کرو کہ مجھے ''تحیّر سے کلبلیں'' والا جملہ لطف دے گیا۔

مفروضے کو باقاعدہ ایک تیکنیک بنانے، جذباتیت سے کنّی کاٹنے، جسم اور ہوس رانی سے کنارا کشی کرنے والے خواص کو جس طرح بورحیس کے اسلوب میں نمایاں شناخت کیا گیا ہے اور اس کی کہانیوں کو اپنے لطیف طنز کے باعث انسانی صفات اختیار کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے بھئی مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر گیا ہے۔ تم نے بورحیس اور مارکیز کے اسالیب کی وضاحت والے حصوں میں اپنے ترجمے میں خوب لطف پیدا کیا۔ لو وہ جملہ بھی آ گیا جسے ہر لکھنے والے کو ازبر کر لینا چاہیے اور اگر کوئی نسیان کے عارضے میں مبتلا ہو تو اسے اپنے سامنے لکھ کر لٹکا لینا چاہیے: ''ادب میں اخلاص یا عدم اخلاص ایک اخلاقی معاملہ نہیں ہے بل کہ جمالیاتی معاملہ ہے۔''

معاف کرنا، یوسا کی یہ بات کہ ''سچ تو یہ ہے کہ لفظ بھی وہ کہانیاں ہیں جو وہ بیان کرتے ہیں'' مجھے ادھوری لگی ہے۔ کون نہیں جانتا کہ لفظ اگر جملے سے باہر پڑا ہو تو لڑھک کر سیدھا لغات کی ٹوکری میں جا گرتا ہے یا پھر گونگا ہو جاتا ہے۔ یہ جملہ ہی ہوتا ہے جو اس کے اندر ایک کہانی داخل کرتا ہے یا اسے کچھ کہنے پر اکساتا ہے۔ ہر نئی ترتیب سے اس کہی جانے والی کہانی میں حک و اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ بل کہ یوں کہو کہ کہانی کے ٹھاٹ بدل جاتے ہیں (چاہو تو ہندی کے ''ٹھاٹ'' کو انگریزی کے ''تھاٹ (Thought)'' سے بدل لو)۔ یوسا کی یہ بات بھی یاد رکھی جانی چاہیے کہ ''جب ایک لکھنے والا کوئی اسلوب مستعار لیتا ہے، تو پیدا ہونے والا ادب نقلی محسوس ہوتا ہے، محض ایک مضحکہ خیز نقالی۔'' جب یوسا نے نئے لکھنے والوں کو ایک اسلوب کی تلاش میں نکل کھڑے ہونے کا مشورہ دینے کے ساتھ ہی مسلسل پڑھنے اور بہت اچھا پڑھے چلے جانے کا کہا تو سمجھو اس نے انہیں گمراہ ہونے سے بچا لیا ہے۔ کیا خوب بات ہے: ''ان ناول نگاروں کے اسلوب کی نقالی نہ کرو جو تمھیں بہت بھاتے ہیں اور جنھوں نے پہلے پہل تمھیں ادب سے محبت کرنا سکھایا۔''

مجھے یہاں حلقہ ارباب ذوق راول پنڈی والی ایک نشست یاد آتی ہے۔ یہی متاثر ہونے والا قضیہ چل رہا تھا۔ جلسہ کے شرکا نے لگ بھگ مجھے زچ ہی کر دیا تھا۔ سب اس پر برہم تھے کہ آخر میں کسی سے متاثر کیوں نہیں ہوں؟ اگر ہوں، تو بتاتا کیوں نہیں ہوں؟؟ گویا میں کچھ چھپا رہا تھا یا پھر جھوٹ بول رہا تھا۔ کسی اور تقریب میں جب کہ میں اگلی نشست پر بیٹھا تھا؛ ایک ستر سالہ بزرگ ناقد نے مجھ پر نظریں گاڑے گاڑے کہا تھا: 'بعض لوگ نہ جانے کیوں اس کا اعتراف کر لینے میں ہتک محسوس کرتے ہیں کہ وہ کسی سے متاثر ہیں۔' مجھے یوں لگا کہ یہ مجھے کہا گیا تھا۔ اس روز اس بزرگ ادیب کی بدگمانی اور چوٹ کرنے پر بہت دُکھ ہوا تھا۔ حلقہ کی اُس نشست میں، کہ جس کا میں ذکر کر رہا تھا اور جو دراصل میرے ساتھ سوال و جواب کی

نشست تھی، مجھ سے متاثر ہونے والا سوال پوچھا گیا تھا، تو میں نے صاف کہہ دیا تھا:

''تخلیقی عمل کے دوران ''موحد'' ہونا پڑتا ہے کہانی کو بھی اور تخلیق کار کو بھی۔''

پھر تو صاحب، شور مچ گیا تھا کہ جیسے میں لکھنے والوں کو ''وہابی'' بنانے جا رہا تھا۔ یہ وہابی والا لطیفہ تو تم نے سن ہی رکھا ہوگا۔ اجی، وہی سردار جی والا: جن کی دکان بہت چلتی تھی۔ محلے کا دوسرا دکان دار، جو مسلمان تھا، مولوی صاحب کے پاس گیا، اپنا دُکھ بیان کیا، نذرانہ دیا اور مولوی صاحب کو دُعا کے لیے کہا۔ مولوی نے کہا، فکر نہ کرو میں دعا بھی کروں گا اور اس سکھ کے بچے کا بندوبست بھی کر دوں گا۔ اگلے روز مسجد سے اعلان ہو رہا تھا: صوبہ سنگھ کریانے والا' وہابی ہو گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ان سردار جی کی دکان ٹھپ ہو گئی۔ ہاں تو، میں نے تو محض یہ کہا تھا: ''میں نے کوشش کی ہے کہ جیسا کسی اور نے لکھا ہے میں ویسا نہ لکھوں۔ میں اوروں کی طرح نہیں لکھنا چاہتا میرا اپنا تخلیقی تجربہ میری راہ متعین کرتا ہے اور یہ خرابی یا خلش میرے اندر ہے کہ مجھے سب سے بچ نکلنا ہے۔'' میں نے اسی مقام پر وضاحت بھی کر دی تھی:

''تمام اچھے افسانہ نگاروں کے مجھ پر اثرات ضرور ہوں گے کہ میں روایت کے ساتھ جڑا ہوا آدمی ہوں۔ جڑا ہوا بھی ہوں اور اس سے کٹا بھی رہتا ہوں تاہم لکھتے ہوئے میں تنہا ہو جاتا ہوں۔ اور میں اچھے تخلیق کار کے لیے ضروری سمجھتا ہوں کہ وہ ممکن حد تک دوسروں کے اثرات سے بچے اور ذاتی جوہر کو اپنی کارکردگی دکھانے دے۔''

میں نے گفتگو کا یہ حصہ ڈھونڈ کر بطور خاص یہاں ہو بہو نقل کیا ہے کہ تم تک، تخلیق کار کی حیثیت سے میرا اپنا رجحان پہنچ پائے اور شاید اس طرح تمہیں اس کا جواز بھی مل چکا ہو گا کہ میں یوسا کو کیوں چاہنے لگا ہوں۔ اب یوسا کی باتیں نہ پڑھتا تو شاید میں اپنے آپ کو ''ادب کا وہابی'' ہی سمجھتا رہتا۔ یوسا کے ایک خوب صورت جملے کو نقل کرنے کے بعد تم سے اجازت چاہوں گا۔ اگر ممکن ہو تو میری کتاب ''اردو افسانہ: صورت و معنی'' کے ابتدائی مباحث پر نگاہ ڈال لینا۔ اور ہاں جہاں کہیں میں نے ٹھوکر کھائی ہے اس کی نشاندہی کرو تو یہ احسان ہو گا۔ ہمارے ہاں یہ خرابی راسخ ہو چکی ہے کہ ہم اس طرح کے مباحث سے الگ تھلگ رہتے ہیں جو یوسا نے اُٹھائے ہیں۔ یوسا کا وہ جملہ، جو مجھے آخر میں نقل کرنا تھا یوں ہے: ''اچھی کہانیاں کہنے کے لیے تنہا الفاظ کافی نہیں ہوتے۔'' پانچویں خط پر جلد بات ہو گی۔

محبت کے ساتھ

— محمد حمید شاہد

اسلام آباد: ۳ مئی ۲۰۰۸

❀❀❀

سات

کہانی، تخلیق کار اور راوی

پیارے عمر میمن: .... آداب

میں نے سوچا تھا کہ کل اتوار ہے، چھٹی والا دن۔ سکون سے یوسا کا پانچواں خط پڑھوں گا مگر مجھے چین کہاں آ سکتا تھا؟۔ سو کمپیوٹر کھول کر بیٹھ گیا ہوں۔ جس کمرے میں، میں سوتا ہوں وہیں ایک طرف میز کرسی لگا کر میں نے لکھنے پڑھنے کی

جگہ بنالی ہے۔ دوپہر آفس سے واپس آ کر جوں ہی میں نے کمپیوٹر آن کیا، میری بیوی، جو اس وقت آرام کرنے کی عادی ہے، چڑ گئی۔ یہ بھی کیا دیوانگی ہے کہ دفتر سے گھر آتے ہی میں نے عین اس کے سرہانے دفتر لگا لیا ہے۔ تو یوں ہے بھائی کہ یوسا کے خطوط نے واقعی مجھے اپنی گرفت میں لے کر دیوانہ بنالیا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ فکشن کے مبادی مباحث اور تخلیقی عمل کے اسرار جیسے موضوعات مجھے مسلسل گھیرے ہوئے ہیں۔ اور یوسا کی طرف دیوانوں کی طرح لپکنا بھی شاید اسی وجہ سے ہوگا۔

یوسا نے پانچویں خط میں راوی کی اقسام گنوائی ہیں اور ان پر بحث کی ہے جو اپنی جگہ بہت دِل چسپ ہیں۔ یوسا کی یہ بات مانتا ہوں کہ کہانی بیان کرنے والی ذات کو مصنف سے خلط ملط نہیں کرنا چاہیے تاہم میں اس کی اس بات کو مان لینے میں تامل محسوس کر رہا ہوں کہ کہانی کا راوی لفظوں کا بنا ہوا ہوتا ہے، گوشت اور خون سے بنے ہوئے آدمی جیسا نہیں ہوتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ لکھنے والا جب تک اپنے کردار کے استخوانی ڈھانچے پر گوشت مڑھ کر اس کے سینے میں دل، رگوں میں لہو اور پھیپھڑوں میں سانسیں اور بدن میں روح نہیں بسا لیتا، اس وقت تک اس کا کردار محض لفظوں کا بنا ہوا آدمی ہی رہتا ہے، یوں جیسے لفظ اور تخیل لوہے کے ہوتے تو آدمی اور کہانی روبوٹ بن چکے ہوتے۔

ہاں، یہ بات ماننے کی ہے کہ کہانی کا راوی کہانی کی حدیں پار نہیں کرتا۔ کہانی کا مصنف بھی حد پار کرے تو سنگسار ہو جاتا ہے۔ بے شک مصنف کی اپنی زندگی بہت پُر مایہ اور بھرپور ہوتی ہوگی مگر جب وہ کہانی کے مقابل ہوتا ہے تو سچ جانو کہ وہ بہت سکڑ جاتا ہے اور کہانی کا راوی اس کو زیر کر لیا کرتا ہے۔ راوی کا فکشنی وجود اگر ساختہ لگنے لگے تو اسے مصنف کی ناکامی سمجھنا چاہیے۔

میں اس راوی کو مانتا ہوں جو یوسا کے مطابق، تمام دوسرے کرداروں کی کہانیاں بیان کرتا ہے، یوں کہ جسے ظاہر کرنا ہوتا ہے اسے ظاہر کرتا ہے اور جسے چھپانا یا لٹکائے رکھنا ہوتا ہے، اُدھر دیکھتا بھی نہیں۔ بیان ہونے والے کرداروں کو باتونی ہونا ہے یا کم آمیز ، چنچل ہونا ہے یا سنجیدہ یہی راوی سکھاتا ہے؛ بالکل اس انسان کی طرح جس کا شعور اپنی نابالغ اولاد کو سکھانے کے معاملے میں پوری طرح چوکس ہوتا ہے، تاہم ایک بار کردار بن جائے تو وہ خودسر ہو جایا کرتا ہے۔ بالغ بچوں کی طرح ان کی اپنی شخصیت، اپنا ڈھنگ اور اپنا چلن ہوتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو پائے تو یقین جانو راوی طاق پر بیٹھے اس اُلو جیسا ہو جاتا ہے، جو بھر بھر چلو مانگتا ہے۔

کہانی کون بیان کرے گا؟ اس کے لیے تین میں سے ایک کا انتخاب کیا جاتا ہے اس باب میں یوسا کی نشان دہی کتنی خوب ہے: راوی - کردار، ہمہ دان راوی، اور مبہم راوی (گول مول پڑھ کر ہنسی چھوٹ جاتی ہے؛ ہو سکے تو اسے بدل لو۔)

کاش، یوسا کی ان باتوں کو کوئی ناقد آگے بڑھائے اور اردو والوں کو بھی ایسے مباحث کی طرف راغب کرے۔ تمہارے تراجم نے اگر کسی کو اس طرف مائل کر دیا، تو سمجھو تمہاری اس کاوش کا حق ادا ہوا۔ بھئی مجھے تو اپنا گھائل ہی جانو۔

کاش میں اس خط کے سارے نکات کا احاطہ کر سکتا۔ بیگم اُکتا کر پہلو بدل رہی ہے، میرا دھیان مسلسل اُدھر رہا ہے اور اب یوں لگنے لگا ہے کہ میں زیادتی کا مرتکب ہو رہا ہوں۔ لو اجازت دو۔ تاہم بتاتا چلوں کہ اس خط کی تمام دیگر باتیں مجھے برحق لگیں اور تمہارا ترجمہ بھی خوب رہا ہے۔

محبت کے ساتھ

محمد حمید شاہد ____

اسلام آباد :۳ مئی ۲۰۰۸

-x-x-x-x-

برادرم حمید شاہد،
السلام علیکم۔
بے حد مفصل خط ملے۔ شکریہ۔

میں پھر پرانا جملہ دھراؤں گا، ''میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ جواب میں لکھوں تو کیا لکھوں۔ ہنوز آپ کے باریک بین مطالعے اور جس عقیدت اور سنجیدگی سے آپ ادب کے سامنے دوزانو ہوکر بیٹھتے ہیں اسی پر حیرت کررہا ہوں۔ کاش ہمارے بیش تر پڑھنے اور لکھنے والوں کو آپ کا چلن آجائے!''

چوں کہ آپ نے جو کچھ ان خطوط میں لکھا ہے مجھے اس سے کوئی قابلِ ذکر اختلاف نہیں، ان کا جواب دینے کے لیے کچھ بن نہیں پڑ رہا۔ سو آپ مجھے دوسری باتیں کرنے کی اجازت دیں۔ لیکن اس سے پہلے صرف ایک بات کے بارے میں اپنا خیال ظاہر کرنا چاہوں گا: میرے خیال میں یوسا کا شاید یہ مقصد نہیں ہے کہ مفرد لفظ کہانی ہوتا ہے (گو ہو سکتا ہے، اگر یہ لکھنے والے کی یاد سے مس ہو جائے، بہ شرطے کہ لکھنے والے کو بات کرنے کا سلیقہ آتا ہو) بل کہ یہ کہ کہانی اس کے بغیر کہی نہیں جاسکتی اور دورانِ روایت یہ کوئی بے جان شے نہیں رہتا بل کہ اپنی خود مختار معنویت اور انسلاکات کی ایک پوری اقلیم سنبھالے ہوئے آتا ہے۔ ویسے آپ کی بات ٹھیک ہے کہ فکشن میں ہمیں جملے کو اکائی ماننا چاہیے، مفرد لفظ کو نہیں۔

بھائی، میں کسی قدر سکتے کے عالم میں ہوں۔ ''دنیا زاد'' کی چند گزشتہ اور تازہ اشاعت میں میرے کئی تراجم چھپے۔ کسی کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ میں برا کیا مانتا (کہ تراجم سے میرا مقصد بڑی حد تک پورا ہو گیا تھا، یہی کہ اردو جسے بھولے جارہا تھا اس کی بازیافت) حیرت ضرور ہوئی۔ لیکن صاحب شمال کی طرف یہ عالم ہے کہ ''سمبل'' میں صرف دو خط پڑھ کر آپ میں کھلبلی مچ گئی۔ اور اب فرشی صاحب کا خط آیا ہے کہ آپ کے تراجم پر اتنے توصیفی خط آئے ہیں کہ آپ پڑھ کر باغ باغ ہو جائیں گے۔ عجیب بات ہے، کراچی اور اس کے انواح میں، جس کے بارے میں یہ تصور کیا جاتا ہے کہ اردو والوں کا مسکن ہے، وہاں تو میرے تراجم کا کسی نے نوٹس نہیں لیا۔ تو، برادر، ایسے میں آپ کا ملنا، اور ان تمام نادیدہ اور ناشناس قارئینِ ''سمبل'' کا ملنا میرے لیے کسی نعمتِ غیر مترقبہ سے کم نہیں۔ مجھ پر ایسی توجہ تو پہلے کبھی نہیں دی گئی۔ آپ کی دوستی کے حوالے سے ذوق یاد آتے ہیں:

اے دوست کسی ہم دمِ دیرینہ کا ملنا
بہتر ہے ملاقاتِ مسیحا و خضر سے

آپ جس توجہ سے یوسا کے خطوط کے ترجمے پڑھ رہے ہیں ان کا شکریہ کس طرح ادا کروں۔ میری محنت سپھل ہوئی۔ سچ اتنا اطمینان ہوا کہ کیا عرض کروں۔ پھر مجھے آپ کے اس دیدہ ریز مطالعے سے ایک بلا واسطہ فائدہ بھی پہنچ رہا ہے۔ آپ ان الفاظ کا بھی ذکر کر دیتے ہیں جو آپ کے اندازے کے مطابق درست ترجمہ نہیں ہوئے ہیں۔ خیر یہ کام تو دوسرے بھی کرنے میں کچھ کم ماہر نہیں۔ لیکن وہ متبادل الفاظ تجویز نہیں کرتے۔ آپ کرتے ہیں۔ جس سے مزید غور و فکر کی راہیں کھل جاتی ہیں۔ آپ کی ''قوتِ ترغیب'' اور ''پیشے'' سے بے اطمینانی کے باعث میں بڑی سنجیدگی سے سوچ رہا ہوں کہ پہلے کو ''قوتِ تاثیر'' اور دوسرے کو ''اذن'' سے بدل دوں۔ ترجمہ کرتے وقت میں بھی ان سے مطمئن نہیں تھا۔ آپ کے خطوط ملنے کے بعد تو بے اطمینانی اور بڑھ گئی ہے۔ یہ بتایئے vocation/calling کے لیے ''اذن'' مناسب رہے گا؟

اب آپ سے ایک درخواست ہے۔ آپ یہ کام اب ذرا زیادہ سختی، بل کہ میں تو کہوں گا زیادہ بے رحمی سے کیجیے۔

جہاں جہاں بہتر لفظ سوجھے بلا تکلف بتائیں۔ آپ جب بقیہ خطوط پڑھیں گے تو وہاں بھی آپ کو میری بے بسی کا اندازہ ہوگا۔ لیکن آپ کی مدد شاملِ حال رہی اور پوری کتاب چھپنے کی کبھی نوبت آئی تو اس کے رخ ورخسار کا انگھڑ پن قدرے بہتر ہوجائے گا۔ کیا حرج ہے۔

میں اگلے دو تین خط بھی جلد ہی بھیجوں گا۔ لیکن ایک بات کا خیال رکھیں۔ ان پر ابھی مزید کام کرنا باقی ہے۔

میں جب آپ کے تازہ خط پڑھ رہا تھا تو اچانک مجھے ایک خیال آیا۔ آپ نے یوسا کے ہر خط کے حوالے سے مجھے ایک خط لکھا ہے۔ ان خطوں کی اپنی حیثیت ہے۔ کیا ہی اچھا ہو کہ ان پر نظر ثانی کر کے انھیں سلسلے وار یا کتابی شکل میں چھپوا دیا جائے۔ ان کا لہجہ بے حد شگفتہ اور علم رسا ہے۔ اگر لوگوں نے یوسا کے خط پڑھ بھی لیے تو آپ کے خط پڑھ کر بات شاید زیادہ آسانی سے ذہن نشین ہوجائے۔ تکرار کی اپنی افادیت ہے۔ پھر آپ کے خطوط میں یہ بات اہم ہے کہ یہ ہمارے اردو کے حاضرہ منظر نامے کی حدود میں رہتے ہوئے کی گئی ہے، جیسے حلقے والا واقعہ جہاں آپ نے اس سوال کے جواب میں کم کم بولنے کو ترجیح دی کہ ایک باشعور لکھنے والے کے لیے اس بات کا جواب دینا کتنا مشکل ہے کہ اس پر کس کس کے اثرات ہیں، جب کہ لکھنے کا عمل شعوری طور پر ایک اچھے لکھنے والے کو ان اثرات سے کنی کٹانے کی شہ دیتا ہے، اور کہ جواب نہ دینا خودسری یا اپنی ذات پر فخرِ بے جا کی نشانی نہیں۔

بھائی، میری درخواست ہے کہ کم از کم آپ اپنا خط نمبر۴، جو یوسا کے اسلوب والے خط کے بارے میں ہے، فرشی صاحب کو بھیج دیکھیں۔ نہ چھاپیں تو نہ چھاپیں۔ کیا فرق پڑتا ہے۔ ''دنیا زاد'' کو آزما لیا جائے گا۔ ان خطوط کی شانِ نزول کے بارے میں ایک ابتدائی تعارفی پیراگراف لکھ دینے سے بات قارئین کے لیے واضح ہوجائے گی۔ یعنی انھیں آپ کے خطوط کے سیاق وسباق کا علم ہوجائے گا۔

مجھے توقع نہیں تھی کہ یوسا کہ خطوط سے ہمارے لکھنے والے کچھ اثر لیں گے۔ لیکن آپ کے اتنے زبردست اور مثبت ردعمل کو دیکھ کر خیال آیا کہ اب اس معاملے کو جھاگ کی طرح بیٹھ نہیں جانا چاہیے بل کہ اسے کچھ عرصے تک ادبی منظر پر معلق رہنا چاہیے اور لکھنے اور پڑھنے والوں کی یاد میں منڈلانا۔ پھر چاہے لکھنے والے ان خطوط کی دانش کا بالجہر اعتراف کریں نہ کریں، اس سے دامن بھی نہیں بچا سکیں گے، کیوں کہ یہ دانش قاری کے قبضے میں آ چکی ہوگی اور وہ ان سے یہ توقع کرے گی کہ اگر لکھنا ہی ہے تو ان معیاروں کو سامنے رکھ کر لکھو ورنہ ہمارا وقت نہ ضائع کرو۔ اندھا کیا چاہے، دو آنکھیں۔ میرا اور آپ کا مقصد پورا ہوگا۔ شاید اسی بہانے غیر محسوس دباو سے مجبور ہو کر ہمارے لوگ اچھا فکشن لکھنے لگیں۔ سوچیے گا۔

بس جناب، اب گاڑی میں پیٹرول ختم ہوگیا ہے، اور بیٹری بھی کم زور پڑنے لگی ہے۔

باقی باتیں آپ کا اگلا خط آنے پر، یعنی وہ باتیں جو آپ کا خط آنے سے اٹھیں گی اور مجھے تحریک دلائیں گی۔

امید ہے کہ آپ بہ خیر وعافیت ہوں گے۔

والسلام

محمد عمر میمن

میڈیسن: ۵ مئی ۲۰۰۸

❁❁❁

آٹھ

ترغیب نہیں تاثیر

پیارے عمر میمن:

آداب

بھئی شکریہ تو مجھے تمہارا اَدا کرنا ہے کہ یوسا کے خطوط میرے لیے بھادوں کی بھرن ثابت ہوئے ہیں۔ خیر بھرا ہوا تو میں پہلے سے تھا، یوسا کو پڑھا تو کناروں سے چھلک پڑا ہوں۔ اور ہاں، یہ جو تم نے کہا ہے کہ ادھر کراچی والوں پر ایسا اثر کیوں نہیں ہوتا؟ میں تو اس باب میں اتنا ہی جانتا ہوں کہ صاحب، یہ ہے بھادوں کا جھلا، ایک سینگ سوکھا ایک ہو گلا۔ ایسے میں ایک طرف تالاب کناروں تک بھر جائے اور دوسری طرف ڈھیلا ہی نہ گلے تو اس پر تعجب کیسا اور ہمارا تپنا کیا؟

لو میں تمہاری تفہیم درست مانتا ہوں کہ یوسا کی مراد مفرد ''لفظ'' نہیں تھا۔ سچ پوچھو تو ہونا بھی نہیں چاہیے تھا۔ یہ بھی درست ہے کہ '' لفظ دورانِ روایت کوئی بے جان شے نہیں رہتا، اپنی خود مختار معنویت اور انسلاکات کی ایک پوری اقلیم سنبھالے ہوئے آتا ہے۔''

''قوتِ ترغیب'' اور ''پیشے'' سے میری بے اطمینانی کی وجہ تمہارے ہاں لائق اِعتنا ہوئی، ٹھیک ہے انہیں بدل ڈالو۔ تم نے اس باب میں درست سوچا ہے۔ ویسے آپس کی بات ہے تم ہو بہت بھلے مانس، سہولت سے ''بہکاوے'' میں آجاتے ہو۔ اپنے کام پر دوسری اور تیسری نظر ڈالنے کو پہلے سے تیار بیٹھے ہو۔ ادھر تو یار لوگ ایک دفعہ لکھ کر قلم توڑ دیا کرتے ہیں۔ اب تم خود سمجھ سکتے ہو ایسی بے چاری تحریروں کو چھپتے ہی کھنگر کیوں لگ جاتی ہے۔

بھئی سچ پوچھو تو مجھے vocation/calling کے لیے تمہارا مجوزہ لفظ ''اِذن'' اچھا لگا۔ تاہم اس پر ایک دفعہ پھر سوچنا ہوگا کہ ''اِذن'' تصوف کی اِصطلاح میں مرشد کی طرف سے سالک کو دی جانے والی اِجازت کے معنوں میں معروف ہے۔ سوال یہ ہے کہ جس لفظ کو پڑھتے ہی سر پر ٹوپی اوڑھ لینے کو جی چاہے وہ فکشن کی اِصطلاح بن کر کس حد تک مختلف شیڈز دے سکتا ہے۔ میرے ذہن میں اسی قبیل کا ایک اور لفظ ''توفیق'' آیا تھا۔ یہ دو سطحوں پر معنی دے سکتا تھا، ایک یہ کہ لکھنے والے کو فطرت کی طرف سے کیا توفیق عطا ہوئی گویا میلان کیا ہے اور دوسری، اس لکھنے والے کی اِس باب میں توفیق کیا ہے؛ یعنی اس کی صلاحیت لپک کر کس حد کو چھو سکتی ہے۔ تاہم وہی ٹوپی والی پھبتی اس لفظ پر بھی چپتی ہے۔

تم نے اپنے خط میں کہا ہے کہ تمہیں میری باتیں اردو کے حاضرہ منظر نامے کی حدود میں رہنے کی وجہ سے اچھی لگی ہیں ۔شکریہ پیارے شکریہ۔ یہاں ایک اور وضاحت کی گنجائش نکل آئی ہے کہ یوسا نے تو اپنے خطوط میں ناول اور فکشن کے ڈھنگ بتائے ہیں اور میں انہیں افسانے کے حوالے سے سمجھنے کی کوشش کرتا رہا ہوں۔ تمہیں معترض ہونا چاہیے تھا اور پوچھنا چاہیے تھا کہ میں ادھر سے اُدھر کیوں کدکڑے مارے پھرتا ہوں؟ شیشے اور سیخ میں فرق تو ہونا چاہیے؟ اُدھر کی شراب ادھر کیوں ڈالتا پھرتا ہوں؟ لو، بھئی تم نہ پوچھو گے تو کیا میں اتنے اہم معاملے کی وضاحت نہ کروں گا؟ ہمارے ہاں یہ قضیہ اُٹھتا رہا ہے۔ ایک حضرت نے تو Edgar Allen Poe کا حوالہ دے کر یہ تک دعوا فرما دیا تھا کہ وہ تو اَفسانے کو فکشن ہی نہ مانتا تھا۔ جو مانتا ہوتا تو اپنے شہرہ آفاق مضمون ''Art of Fiction'' میں Short Story کا ذکر ضرور کرتا۔ تم ہی کہو

پیارے، Poe نے اَفسانے کا ذکر اپنے مضمون میں نہیں کیا اور اب یوسا بھی اپنے خطوں میں افسانے کا حوالہ نہیں دے رہا تو یہ کیوں کر ثابت ہو گیا کہ اَفسانہ اور فکشن الگ الگ ہیں۔یعنی ناول تو فکشن ہے اور افسانہ؟ بھئی یہ درفنطنی بھی عجب ہے۔ وارث علوی اَفسانے کی تنقید لکھتے ہوئے اسے'' فکشن کی تنقید'' کہہ چکا ہے ۔شمس الرحمٰن فاروقی نے اَفسانے اور کہانی، دونوں کو اپنی کتاب (افسانے کی حمایت میں) میں مختلف مقامات پر فکشن کے مترادف کے طور پر لکھا ہے۔اب اگر میرے ہاں بھی ایسا ہی ہو رہا ہے تو غُل نہیں مچنا چاہیے۔ میں اس باب میں پہلے بھی وضاحت کر چکا ہوں کہ ہمارے ہاں short story کا عین مین ترجمہ'' مختصر اَفسانہ'' ہو گیا تھا اور short fiction کہتے ہوئے، یہ خیال کیا جانے لگا کہ اَفسانہ تو ناول کا منی ایچر ہوتا ہے۔یہیں سے خرابی شروع ہوتی ہے۔میری نظر میں شارٹ اسٹوری کا اُردو میں متبادل '' اَفسانہ'' ہے'' مختصر اَفسانہ'' نہیں۔ یہ لفظ پہلے سے ہی ہمارے ہاں موجود تھا اور یہ کہ ہمارے ہاں کا اَفسانہ ناول کی قطعاً تصغیری صورت نہیں ہے۔

میں Poe کی یہ بات بھی ماننے کو تیار نہیں ہوں' جس کے مطابق شارٹ اسٹوری کو ایسی صنف بتایا گیا تھا جو ایک گھنٹے میں پڑھی جا سکتی تھی۔ ہمارے ہاں ناولٹ کو ایک آدمی کی زندگی بتایا گیا تو ناول کو اسی فرد کی تہذیبی زندگی ہے جب کہ افسانہ زندگی کی ایک قاش قرار پایا۔میرا دل تو اس تقسیم پر بھی نہیں ٹھکتا کہ تم نے ایسے کامیاب ناول دیکھ رکھے ہوں گے جو زندگی کے اِنتہائی مختصر دورانیے اور گنتی کے چند کرداروں کو خاطر میں لاتے رہے ہیں مگر انہیں ناول مانا گیا؛ کوئی انہیں شارٹ اسٹوری یا اَفسانہ کہنے کو بہ ضد نہیں ہے۔تم نے ایک سے ایک بڑھیا افسانہ ترجمہ کر رکھا ہے تم ہی بتاؤ کیا اس میں تہذیبی زندگی کی پوری ہما ہمی نہیں آتی رہی ہے۔میں نے تو کئی افسانوں کو یوں پایا ہے جیسے وہ پوری کائنات کو گھیر لینے کی کوشش میں ہوتے ہیں۔

مغرب میں ناول اور اَفسانے کے درمیان تیکنیک کے فرق کی وضاحت تو ہوتی رہی مگر ان کو الگ الگ صنفی منصب کا درجہ نہیں دیا گیا جب کہ اُردو فکشن کے مجموعی تجربے کو سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو جو منظر نامہ بنتا ہے اس میں اَفسانہ ہو یا ناول فی الاصل اَفسانے ہی کی ذیل میں شمار ہوتے ہیں۔ گویا تم کہہ سکتے ہو کہ ہمارے ہاں اَفسانے نے ایک صدی سے زاید کے عرصے میں کئی صدیوں کی مسافت طے کی ہے اور فکشن کی کوئی بھی فرع ہو اَفسانے کی مستحکم ہو چکی رَوایت سے اس کا بچ نکلنا ممکن نہیں رہا ہے۔☆

رہ گیا تمہارا یہ خیال کہ ہماری آپس کی خط بازی کی کوئی ادبی حیثیت ہو گئی ہے؛ تو پیارے یقین جانو میں نے یا تو اپنے جی کا بخار نکالا ہے یا پھر ادب کے ایک ادنی طالب علم کی حیثیت سے تخلیقی بھیدوں کے بھنوروں کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ ہاں اگر یہ خطوط یوسا کی اُٹھائی ہوئی بحث کو آگے بڑھانے کا سبب بنیں تو ان کے چھپنے میں کوئی مضائقہ نہ ہوگا۔ممکن ہے کوئی '' صاحب ایمان'' پھڑک کر قلم اُٹھالے اور جو میں نے کہا اس کا تیا پانچا کر کے نئے نئے نکتے اُجالتا چلا جائے۔آہا مزا ہی تو آجائے گا۔

تو یوں ہے کہ میں انہیں ایک نظر دیکھ لوں گا اور تم بھی دیکھ لو، تاہم مناسب یہ رہے گا کہ یہ جیسے ہیں ویسے ہی رہیں اور تمہارے خطوط بھی ساتھ ہی چھپیں اسی ترتیب سے جس میں ان کا تبادلہ ہوتا رہا۔ان خطوط کی'' شانِ نزول'' کے بارے میں ابتدائی تعارفی پیرا گراف تمہیں لکھنا ہوگا جس میں یوسا کا تعارف بنیادی حوالہ ہونا چاہیے۔میرا خیال ہے یوسا کے خطوط '' سمبل''

کو چھاپنے دیں اور ہو سکے تو ''دنیازاد'' (یا کسی دوسرے) کو ہمارا مکالمہ چھاپنے کی طرف راغب کریں تا کہ ذرا مختلف سرکل میں اس بحث کو پھیلایا جا سکے۔

یوسا کے نئے خطوط مل گئے ہیں۔ مجھے کچھ وقت درکار ہوگا کہ توجہ سے پڑھ سکوں تاہم میں اس کا نام ''ماریو ورگس یوسا'' پڑھ کر چونک گیا ہوں پہلے تم ''ورگس'' کی جگہ ''برگس'' لکھتے رہے ہو۔کیا یہ مناسب نہیں ہوگا کہ یہ برگس ہی رہے؟ اور ہاں فائل کا نام Llosa رکھا ہے تو بھئی کیا اسی کو تم نے اردو میں منقلب کرتے ہوئے یوسا لکھا؟ اس بابت بھی تو کچھ لکھو۔ اجازت دو۔

محبت کے ساتھ

___ محمد حمید شاہد

اسلام آباد :٦مئی ٢٠٠٨ء

☆میمن: عبارتِ بالا کے بیش تر مفاہیم کی صحت سے کسی کافر کو ہی انکار ہوسکتا ہے۔ بہ ہر حال، مجھے نہیں ہے، اور یوسا کو بھی نہیں ہونا چاہیے۔ چوں کہ اُس کے خطوط ایک نوجوان ''ناول نگار'' کے نام ہیں، اسی لیے وہ یہاں ''فکشن'' میں صرف صنفِ ناول کی داخلی عملیات (یا انجر پنجر) پر گفتگو کر رہا ہے۔''شورٹ اسٹوری'' کے لوازمات ناول کے لوازمات سے مختلف تو ہو سکتے ہیں، لیکن یہ اتنے فیصلہ کن نہیں ہو سکتے کہ خود ''شورٹ اسٹوری'' کو ''فکشن'' کی اقلیم سے بے دخل کر دیں۔ میرا خیال ہے کہ آپ نکتے کو خوب سمجھتے ہیں لیکن بعض اردو نقادوں کی غلط فہمی یا تنگ نظری کا حساب بے باق کر رہے ہیں، یا، آپ ہی کے لفظوں میں، اپنے ''جی کا بخار'' نکال رہے ہیں۔

میں نے اوپر ''بیش تر'' اس لیے کہا ہے کہ مجھے آپ کی ساری باتوں سے اتفاق نہیں ہے۔ ان دو باتوں میں کہ ''مغرب میں ناول اور اَفسانے کے درمیان تیکنیک کے فرق کی وضاحت تو ہوتی رہی مگر ان کو الگ الگ صنفی منصب کا درجہ نہیں دیا گیا'' اور ''جب کہ اُردو فکشن کے مجموعی تجربے کو سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو جو منظر نامہ بنتا ہے اس میں اَفسانہ ہو یا ناول فی الاصل اَفسانے ہی کی ذیل میں شمار ہوتے ہیں'' میں ایک دھیما سا باہمی اختلاف ہے۔ ممکن ہے نہ ہو، لیکن مجھے یہ اس لیے محسوس ہو رہا ہے کہ ایک طرف تو مغرب میں ''الگ الگ صنفی منصب'' نہ ملنے کا ذکر ہے اور دوسری طرف اردو کے فکشنی منظر نامے میں ''افسانہ'' اور ''ناول'' دونوں ہی ''افسانے کی ذیل میں شمار ہوتے ہیں'' کا۔ میرا خیال ہے ان بیانات کی روشنی میں ہمیں سب سے پہلے یہ تعین کرنا ہوگا کہ اردو میں ''افسانے'' کی صنف کا مابہ الامتیاز کیا ہے اور ''ناول'' کی صنف کا کیا، تا کہ واضح ہو سکے کہ اردو ''ناول'' کو ''فی الاصل'' اردو ''افسانے کی ذیل'' میں کیوں اور کیسے شمار کیا جائے۔ ایک ضمنی سی چیز یہ بھی ہے کہ جب دو اصناف کی تیکنیک کے فرق کو ظاہر کر دیا گیا اور یہ تسلیم کر لیا گیا کہ یہ دونوں ہی ایک تصور کی زائیدہ ہیں جسے ''فکشن'' کہا جاتا ہے، تو پھر ''الگ الگ صنفی منصب'' ملنے سے کیا مراد لیا جا سکتا ہے؟ خیر یہ تو ہے سو ہے، لیکن آپ کی باتوں پر یقیناً غل نہیں مچنا چاہیے۔ اگر اس قسم کی ادبی دھینگا مشتی ہوتی رہے تو لوگ عادی ہو جائیں گے کہ ایسے مباحث سے فکر کو نئی راہیں سوجھتی ہیں اور بعض نیم روشن گوشے زیادہ روشن ہو جاتے ہیں۔

❁❁❁

نو

راوی، کرداراورمکان

پیارے عمر میمن:

آداب

گذشتہ خط میں راوی، کرداراورمکان کی بات ہو رہی تھی اور یوسا نے راوی کی جو تین قسمیں بتائی تھیں ان کو سامنے رکھ کر لگ بھگ ہم متفق ہو چلے تھے کہ راوی کہانی کے اندر کا کوئی کردار ہوسکتا ہے اور دوسرے کرداروں کے ساتھ مل کر اپنے لیے جگہ اور جواز بناتا ہے۔ وہ راوی جو کہانی میں بہ ظاہر کہیں نہیں ہوتا مگر ہر کہیں ہوتا ہے، وہ کہانی میں خدائی آنکھ لے کر آتا ہے، ہر رخ سے دیکھتے ہوئے مگر خدا کے لہجے میں بولتا نہیں ہے۔ تیسری قسم کے مطابق راوی اپنے تئیں قاری کو غچہ دے سکتا تھا، کبھی اندر، کبھی باہر، کبھی یہاں کبھی وہاں۔ اسے راوی نہ کہیں چھلاوا کہہ لیں مگر اسی سے کہانی کا مکان اور رفتار بدلتی ہے۔ میں نے لگ بھگ یوسا کی بات کی تلخیص کر دی۔ کہنا مجھے یہ تھا کہ ان ساری صورتوں میں کہانی کے اندر کرداروں کا دائرہ کار متعین اور مرتب ہوتا ہے۔ کردار چاہے کتنے ہی خیالی کیوں نہ ہوں اپنے وجود کو ساتھ لے کر کہانی میں وارد ہوتے ہیں لہذا وہ علاقہ جہاں کرداروں کی چلت پھرت ہوتی ہے، وہ نمایاں ہوتا چلا جاتا ہے۔ اگر تم میری بات کے ساتھ ساتھ چل رہے ہو تو جان گئے ہو گے کہ یہی راوی بڑی حد تک نہ صرف کہانی کی ساخت بنا دیتا ہے، مکانی تعین بھی کر دیتا ہے۔ پیارے یہ بھی کوئی نئی بات نہ ہوئی، تاہم میں تمہیں جس بات کی طرف گھیر گھار کر لانا چاہتا ہوں اس کے لیے ماحول بن چکا ہے۔

دیکھو، مکان کے ساتھ زندگی کی مہملیت جڑی ہوئی ہے۔ گویا جہاں ہم ہیں ہمارا راوی ہے اور ہمارے کردار کی چلت پھرت ہے، اس مکان سے مہملیت کو نکالا نہیں جا سکتا ہے۔ اب لکھنے والا، اپنے راوی کو کس حد تک اس کی اجازت دیتا ہے کہ مہملیت سے معاملہ کرے اور کہانی کو ''صراط مستقیم'' پر چلانے کی بہ جائے اس میں اسی مہملیت کے سہارے شاخ تازہ کی سی لچک پیدا کر لے یا یوں کہہ لو کہ نیک آدمی کو وہ تھوڑا سا گناہ جو بہت زیادہ لذت دیتا ہے، اس کی گنجائش پیدا کرے۔ خیر اس معاملے میں لکھنے والے کا حد درجہ کایاں ہونا بہت ضروری ہے۔ بھئی یہاں تو کوّے کا دماغ چاہیے کہ ادھر آئے، مطلب کی چیز اُچک، اپنے منظر نامے میں اُتر گئے۔ (ویسے آپس کی بات ہے کوا بہت سیانا ہو جائے تو گو کھاتا ہے۔ میں اس سیان پنے کو ایسی معصومیت کے تابع رکھنا چاہوں گا جو معصیت کو بھی ادائے دل رُبا بنا دیا کرتی ہے)۔ یوں (یہی مہملیت جو انسانی زندگی کا بھی ایک لازمی عنصر ہوتی ہے) کہانی کو گمراہ نہیں کرتی اسے گداز بنا دیتی ہے۔ اب تم کہو گے کہ معنویت اور مہملیت دونوں ساتھ ساتھ کیسے چل رہے ہوتے ہیں؟ لو جی ان کے بیچ تو اینٹ کتّے کا بیر ہے؟ تو یوں ہے پیارے کہ دن کی روشنی اور رات کی تاریکی دونوں سے مل کر ہماری زندگی کی کہانی معتبر ہوتی ہے۔ حالاں کہ ایک کی آمد دوسری کی رخصت کا اعلامیہ ہے۔ ہم اس پر قادر نہیں ہیں کہ وقت کے اس دورانیہ کو، کہ جس میں ہم ایک متحرک مکان میں رہتے ہوئے بھی اپنے حواس معطل کر کے ساکت ہو جاتے ہیں، زندگی سے کاٹ پھینکیں۔ اگر ہم یہ نہیں کر سکتے تو دوسری طرف ہم یہ بھی تو نہیں چاہتے کہ مہملیت کے پنگھوڑے میں ہمیشہ پڑے رہیں۔ حتیٰ کہ ہمیں یہ بھی گوارا نہ ہوگا کہ مہملیت کا عرصہ، عین مین اپنی حقیقی مقدار

میں لے لیا جائے۔ پلٹ کر دیکھیں تو اس کا بہت کم حصہ ہمارے شعور سے لاشعور میں منتقل ہوتا ہے۔ بس اتنا ہی مکان پر زندہ رہ جاتا ہے۔ میں تو کہوں گا آٹے میں نمک جتنا؛ تم چاہو تو اس کی مقدار کو حسب ذائقہ (حسب توفیق) کم زیادہ کر سکتے ہو۔

زندگی کی معنویت، لغویت اور مہملیت مل کر کہانی کے کرداروں کی رفتار متعین کرتی ہیں۔ ممکن ہے، جن معاملات میں میں اُلجھ گیا ہوں آگے چل کر یوسا نے ان پر بات کی ہو۔ خیر یہیں مجھے التباسیت اور سرابیت کا ذکر بھی کر دینا ہوگا کہ بعد میں معلوم نہیں اِس کا محل نکلتا ہے یا نہیں۔ کہنا یہ ہے جان من کہ ہم اپنے راوی اور کرداروں کے ساتھ illusion اور disillusion کی آنکھ مچولی کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ التباس کا عمل کبھی تو زندگی کی معنویت سے جڑ جاتا ہے اور کبھی اس کی لغویت یا مہملیت سے۔ معاملہ الٹا کر فریب نظر کے ٹوٹنے کو بھی انہی دو صورتوں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ بھئی غالب بھی کیا کمال آدمی ہے، مجھے مشکل میں دیکھتے ہی میری مدد کو لپک آیا ہے:

جب تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

کہانی کے خدا کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہوتا ہے وہ اپنی کائنات میں ظاہر ہو جائے تو کائنات منہا ہو جاتی ہے، سارا ہنگامہ دھوکا نکلتا ہے، سب کچھ مہمل ہو جاتا ہے اور وہ اپنا خدائی کردار کہانی کے کرداروں کے بھیتر میں اتار کر الگ ہو جائے تو اس کا اپنا وجود التباس ہو جاتا ہے۔ یہی التباس اس حقیقی زندگی کے حوالے سے بھی قائم ہوتا ہے جو پڑھنے والا کہانی کے اندر سے پھوٹتی ہوئی محسوس کرتا ہے۔ اب تم ہی کہو کہ جب ہم راوی، کردار اور مکان کی بات کریں گے تو پیارے، ان امور سے خود کو کیسے الگ رکھ پائیں گے؟

اب تک کی گفتگو سے تم قیافہ لگا چکے ہو گے کہ میں جس راوی کی بات کر رہا ہوں وہ تخلیق کار نہیں ہوتا مگر اُس سے جدا بھی نہیں ہوتا۔ اگر اس بنیادی نکتہ اور اس کی تمام نزاکتوں کی تفہیم کر لی جائے تو کرداروں کی تشکیل کے وقت ان کی آزادی اور خود مختاری یقینی ہو جائے گی۔ بیانیہ کے اندر کرداروں کو اس راوی کے زیر اثر کر لینا جو تخلیق کار کے سائے میں چل رہا ہو ان کی فطری نمو اور بالیدگی میں مزاحم ہو جاتا ہے۔ جس طرح ہر انسان کے اندر بڑھنے اور پھلنے پھولنے کی خواہش ہوتی ہے اور یہ خواہش ایک دائرے سے دوسرے مگر قدرے وسیع دائرے کی سمت مسلسل لپک کی صورت ظاہر ہوتی رہتی ہے۔ راوی کے دائرۂ عمل سے کرداروں کا باہر کی جانب زور کرنا بھی اسی زمرہ میں آتا ہے۔ یوں وہ کردار کہانی کے اندر ارتقائی ذمہ داریاں سنبھالنے کے لیے تیار ہو جایا کرتے ہیں۔ اب تم کہو گے کہ لکھنے والا بہر حال انسان ہوتا ہے، سوچنے والا، سمجھنے الجھنے اور طیش میں آنے والا۔ وہ کسی سے نفرت کرتا ہے اور کسی سے محبت۔ اسی کی وساطت سے وہ اپنے تعصّبات اپنے راوی اور کرداروں کو منتقل کرنے سے کیسے باز رہ سکتا ہے؟ یقیناً نہیں، مگر وہ جو یوسا نے کہا ہے کہ اسے تشریحی رائے زنی، ترجمانی، اور فیصلہ دہی سے اجتناب کرنا ہوگا تو اس پر دھیان دینا ہوگا۔

میں سمجھتا ہوں، ایک عام لکھنے والے میں اور فکشن نگار میں بنیادی فرق ہی یہی ہوتا ہے۔ اوّل الذکر کا سارا زور اس پر ہوتا ہے کہ اسے جو لکھنا ہے وہ لکھتا چلا جائے جب کہ فکشن نگار کو خبر ہو جاتی ہے کہ اس لکھنے کی جھونک میں جو نہیں لکھنا تھا وہ نوک قلم پر آیا چاہتا ہے، لہذا وہ اسے روک دیتا ہے۔ اسے روک دینا ہوتا ہے کہ بہر حال اسے اپنے کرداروں کی آزادی عزیز

ہوتی ہے اور اس مکان کی حرمت بھی جس میں اس کے کردار موجود ہوتے ہیں۔

کردار سازی کا قضیہ یہیں تمام نہیں ہو جاتا، تخلیق کار کا اپنا اسلوب حیات جس تخلیقی ساخت سے قریب ہوتا ہے اسی وضع کے کردار بنے چلے جاتے ہیں۔ وہ فکشن نگار جو زندگی کو جزیات کے ساتھ دیکھنے کے عادی ہوتے ہیں اور بغیر کوئی اکھاڑ پچھاڑ کیے، بیانہ لکھنے کی طرف راغب رہتے ہیں، ان کے کرداروں کا مزاج، اُن تخلیق کاروں سے مختلف ہو جاتا ہے جو راست بیانیے کو ذرا سا الٹ پلٹ کر جدید حسیات کے لیے گنجائشیں نکال لیا کرتے ہیں۔ اجتماعی زندگی کی علامت بننے والے کرداروں کی دھج، وجودیت کے مظہر کرداروں سے جدا ہوتی ہے؛ بالکل اسی طرح، جس طرح زندگی کہ باطنی جہات سے جڑنے والا تخلیق کار، مظاہر فطرت کو چوپٹ آنکھ سے دیکھنے والے تخلیق کار کی طرح کردار سازی نہیں کرتا اور نہ ہی کر سکتا ہے۔ یہ بات بھی ایک بار پھر دہرا دینے کے لائق ہے کہ کرداروں کا منصب محض حقیقی زندگی (اگر کوئی ہے؟) (ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے: غالب) کی نمائندگی نہیں ہوتا بل کہ انہیں تو ایسی حقیقت کا مظہر ہو جانا ہوتا ہے جو تجربے میں آنے والی زندگی سے کہیں وسیع اور بسا اوقات لامحدود ہو جاتی ہے۔ ابھی میں بھی کن اُلجھنوں کا اسیر ہوا کہ مجھے تو یوسا کے زمان والے خط کے حوالے سے بات کرنا تھی۔ بھئی اگلے خط میں اپنے آپ کو اسی تک محدود رکھنے کی کوشش کروں گا۔

امید کہ تم بہت مزے میں ہو گے۔

محبت کے ساتھ

— محمد حمید شاہد

اسلام آباد: ٦ مئی ٢٠٠٨ء

❀❀❀

دس

ایک ڈیڑھ بات زمان کے باب میں

پیارے عمر میمن:

آداب

میں نے تم سے وعدہ نہ کر رکھا ہوتا کہ اس بار یوسا کے ''زمان'' والے خط پر بات کروں گا، اب تک فکشن کے ان ہی مباحث میں الجھا ہوتا جو یوسا نے گزشتہ خطوط میں اُٹھائے تھے کہ میں اُن سے سرسری گزرتا آگے نکل آیا تھا۔

خیر اَب کیا ہو سکتا ہے کہ وعدہ بھی تو میں نے کیا تھا' آئی موج فقیر کی، دِی اَپنی جھونپڑی پھونک۔ سو وعدہ نبھاتا ہوں۔

زمان کا معاملہ یہ ہے پیارے کہ یہ شروع ہی سے مکان کے ساتھ پیوست رہا ہے۔ کہتے ہیں ١٩٥٠ میں فریڈ ہال نے جو Steady State Universe (یعنی ٹھہری ہوئی کائنات والا) نظریہ گھڑا تھا تو اُسے خوب پذیرائی ملی۔ جارج گامو (George Gamove) نے Big Bang کا شوشا چھوڑا تو سب اُسے چھوڑ، اس کے پیچھے ہو لیے اور ابھی تک اس نظریے کا خوب ڈھنڈورا پیٹ رہا ہے۔ مجھ بے علم صیرفی کو دیکھو کہ ایک کو ''گھڑت'' کہہ گیا، دوسرے کو ''شوشا'' اور

دونوں کو گُھورے پر ڈالنے کو کمر بستہ ہوں ۔ بھئی گراں خاطر نہ ہو تو میں اس پر اٹکا ہوا ہوں کہ ان دونوں کی اوقات محض مفروضوں سے نہ پہلے کچھ زیادہ تھی، نہ اَب ہے۔ سائنسی تجربات/ مشاہدات کا المیہ یہ ہے کہ یہ بہ ہر حال ناقص/ نامکمل ہوتے ہیں۔ یہی سبب ہے ان میں سے ایک نظریہ کب کا مسترد ہو چکا اور دوسرے کو جلد یا بہ دیر اسی انجام سے دوچار ہونا ہے۔

لگ بھگ چالیس سال پہلے تک ہمیں یہی بتایا جاتا رہا کہ کائنات ہمیشہ رہے گی۔ اب بتایا جا رہا ہے کہ جس طرح عظیم دھماکے سے کائنات Nothingness سے وجود میں آئی تھی، اور مسلسل پھیل رہی تھی، سکڑ کر پہلی حالت میں چلی جائے گی؛ پھر ایک دھماکہ ہوگا، اپنے انجام کو پہنچ جائے گی۔ او ہو میں نے درست کہاں کہا، اپنے انجام کو پہنچ کر بھی بالکل ختم نہیں ہوگی، ایک بار پھر کائنات تخلیق ہوگی؛ پہلی سے بھی بڑی ۔ اس میں پہلے والی کا مادہ بھی شامل ہوگا اور کچھ مزید Nothingness سے بھی پا لے گی۔ یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ وہ کائنات ہمیشہ کے لیے ہوگی۔

واہ کیا خوب کہا سائنسی بھائی لوگو، میرا مذہب کے زیر اثر پالا ہوا ذہن فوراً قیامت اور جنت دوزخ کے تصور میں کھو گیا ہے۔ میرے تہذیبی ذہن میں بھی کائناتی چکر بسا ہوا ہے کہ آخر ایک مدت ہندوازم اور بدھ مت والوں کا ساتھ رہا مگر اس کا کیا کیجیے کہ معروف سائنس دان Hezen Burq نے بھی اپنا ایک نظریہ پیش کر رکھا ہے، وہی Uncertainity والا مشہور نظریہ جس میں بتایا گیا ہے کہ جدید سائنسی تحقیق اپنے وسیع کائناتی علم کی وجہ سے اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ اس کے نتائج عمومی سطح پر تو ٹھیک بیٹھتے ہیں پیچیدہ معاملات میں ہمیشہ ناقص رہ جاتے ہیں یا بعض معاملات میں اِنہیں کچھ سوجھتا ہی نہیں ہے۔

اگر چہ اوپر والی بحث یوسا کی تحریر کا عنوان پڑھتے ہی مجھے اپنی طرف کھینچ لے گئی ہے مگر دیکھو یہ باتیں بالکل غیر متعلق نہیں ہیں۔ تم نے یہ کرنا ہے کہ میں نے جہاں جہاں کائنات کا لفظ استعمال کیا ہے، وہاں وہاں اپنے ذہن میں ایک مساوات بنا لینی ہے، لو لکھ دیتا ہوں: مکان+زمان= کائنات۔ میں ایسا نہیں کر سکتا کہ کائنات جسے اس مساوات میں زمان و مکان کے مساوی دکھایا گیا ہے، فی الاصل وہ زمان و مکان کے اندر مقید ہے اور صرف لکھی ہوئی مساوات میں ہی برابر ہو سکتی ہے۔ کہو، اب اگر میں اس تمہید کے بعد یہ کہوں کہ زمان اور مکان کا تناظر بیچ میں لائے بغیر فکشنی واقعے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تو کیا تم یقین کر لو گے؟ بھئی میرا تو اس باب میں پورا ایقان ہے اور طبیعت اس پر بھی ٹھکتی ہے کہ فکشن سے باہر کی زندگی بھی جو ہمارے تجربے میں آ کر میلی اور استعمال میں آ کر بوسیدہ ہو چکی ہے اس کا کوئی واقعہ اس تناظر سے باہر نہیں ہے۔ مجھے یہ بات کہہ ڈالنے کا یوں حوصلہ ہوا کہ یوسا نے بھی اس باب میں اپنی بات کا آغاز اِسی نکتے سے کیا ہے۔ یعنی اس نے زمانی نقطۂ نظر کو مکانی نقطۂ نظر سے جوڑنا ضروری گردانا ہے۔

یوسا نے ایک تسلسل میں بہنے والے وقت کو حقیقی وقت کہا ہے اور اسے اُس وقت سے الگ کر کے دِکھانے کی کوشش کی ہے جو بہ قول اس کے فکشنی وقت ہوتا ہے۔ ایسا وقت جس میں خوب اُکھاڑ پچھاڑ ہوتی ہے۔ ایسی اکھاڑ پچھاڑ جو فن کار کو ایک تسلسل میں چلنے والے وقت سے آزاد کر دِیا کرتی ہے۔ آگے چل کر یوسا نے وقت کی اِس تقسیم کو سلسلے وار اور نفسیاتی قرار دیا۔ ایک جو معروضی وجود رکھتا ہے اور دوسرا جو ہمارے اندر ہی اندر کروٹیں لیتا رہتا ہے۔ فکشن میں آنے والے وقت کو یوسا نے بجا طور پر اس وقت کے مماثل قرار دیا ہے جس کی چال خوشی، دُکھ اور خوف کے لمحات میں تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ اس ضمن میں ایم بروز بیئرس کی کہانی ''این اَکرینس اَیٹ آ وَل کرِیک برج'' برمحل ہے۔ پُل سے پھانسی دیے جانے والے لمحے سے

لے کر کہ اس کی گردن کے گرد رسی تنگ ہو رہی تھی اور رسی ٹوٹنے سے پہلے تک وقت ایک ڈھج سے چلتا ہے۔ رسّی ٹوٹنے، دریا میں گرنے، تیر کر کنارے پر پہنچنے سے لے کر گھر میں گھسنے تک وقت کی چال مختلف ہو گئی ہے۔ محبت کرنے والی عورت کی طرف بڑھنے والے لمحات میں یہ پھیلا ہوا وقت پھر سکڑ جاتا ہے اور گردن کے گرد تنگ ہوتی رسّی اس کا دم گھونٹ دیتی ہے۔ گُنتر گراث کی ''دی ٹِن ڈرم'' والی کہانی میں نے پڑھ رکھی ہے۔ یوسا کی بتائی ہوئی عام رفتار اور آسکر کے لیے ناگزیر زوال سے کنّی کترا کر نکل جانے والے وقت کو بھی تم اسی ذیل میں رکھ کر دیکھ سکتے ہو۔

اب اگر میں ان مثالوں کو لے کر یہ کہوں کہ اوپر جو یوسا نے وقت کی حقیقی اور نفسیاتی کی تقسیم کی تھی اور فکشن کے وقت کو گھڑا ہوا وقت بتایا تھا تو کیا وہ غیر حقیقی نہیں ہو جاتا؟ دیکھو جس عمومی وقت کو ہم نے اپنے خارج سے اُچک، کاٹ پیٹ کر برابر حصوں میں بانٹا اور اس کے سیکنڈ، منٹ، گھنٹے، سال اور صدیاں بنالی ہیں اس کی تصدیق ہمارا باطن نہیں کرتا ہے۔ لہٰذا مجھے کہنے دو کہ یہی گھڑا ہوا دھوکا ہے۔ اصل وقت تو وہی ہے جو ہر فرد کے اندر اس کے دِل کی دھڑکنوں کے ساتھ چلتا ہے، اُس کی سانسوں میں بسا ہوا ہے یا اُس کے ذہن میں سے ایک کوندے کی طرح سے نکلتا اور سارے زمانوں کو روشن کرتا چلا جاتا ہے۔ اپنی پہلی بات دہرانا چاہوں گا کہ فکشن کی حقیقت، عام زندگی کی حقیقت سے کہیں عظمت والی ہوتی ہے۔ تو یوں ہے جگر جی، کہ جب یہی عظمت ''فکشن کے زمان'' کی دستار کا پنکھ ہو گئی ہے تو اسے ٹیڑھے میڑھے ہو کر یوں سمجھنے کے جتن کیوں کیے جائیں جیسے یہ قضیہ بھی ٹیڑھے توے کی روٹی ہو۔

میں نے جو کہا اور یوسا نے جو کہہ رکھا ہے بظاہر ایک سی باتیں ہیں مگر جب تم اپنے دیکھنے کے زاویے کو بدل لو گے تو تم پر زندگی کے حسن کا ایک اور دریچہ کھل جائے گا۔ کم از کم میرے ساتھ تو یہی ہوا ہے اور میں جوں جوں اِس راہ پر آگے جاتا ہوں، ایک سے ایک نیا منظر، نظر کے سامنے کھلتا اور روح تک کو سرشار کرتا چلا جاتا ہے؛ بالکل یوں، جیسے کوئی لپٹا ہوا جادوئی قالین آگے ہی آگے کُھلتا چلا جائے۔ میں نے بورحیس کی کہانی ''دی سِیکریٹ مِرکل'' کو بھی اسی تناظر میں دیکھا ہے۔ فائیرنگ اسکواڈ کے سربراہ کے حکم ''فائیر'' سے لے کر گولیوں کے جسم کو چھلنی کر دینے تک، میں اِسی وقت کے تصور کی گرفت میں رہا ہوں، جو فی الاصل ہے؛ تب ہی تو فن کار کی گرفت میں آ گیا ہے۔ ''ڈائنا سور'' اور وقت کو جوڑ کر یہ جو یوسا نے ماضی، حال اور مستقبل کے صیغے استعمال کیے ہیں، کہانی میں آ کر اپنی حیثیت کس سہولت سے بدل لیا کرتے ہیں تم اِس سے خوب آگاہ ہو گے۔ بس یوں ہے کہ فکشن کا جملہ لکھنے کی اِبتدائی تربیت کے باب میں یہ باتیں بہت اہم سہی مگر جو بھی لکھنے والا کہانی سے اس کی گییا (GYA) سے جڑ جاتا ہے اس پر وقت کو سیمابی بنالینا لازم ہو جاتا ہے۔ اور ہاں یہ گییا کا لفظ جو میں یہاں لکھ گیا ہوں اگر تمھیں چونکائے تو لغات میں مت تلاش کرنا کہ یہ مجھے بھی کہیں نہیں ملا ہے۔ کہتے ہیں یہ بھی سائنسی اِصطلاح ہے۔ میں نے کہیں پڑھی تھی؛ کہاں؟ اب یاد نہیں، مگر ذہن سے چپکی ہوئی ہے۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، اس کی تشریح میں بتایا گیا تھا کہ ہر شے کا ایک نفس/mind ہوتا ہے جس کی وہ پابند ہوتی ہے۔ تو یوں ہے پیارے کہ کہانی کے اِس نفس سے جڑ کر لکھنے والا اُس اصل وقت کو گرفت میں لے لیتا ہے جس میں تجربے میں آنے والی ترتیب تباہ ہو جاتی ہے اور وجود کے آہنگ اور اس کی تاہنگ میں آیا ہوا وقت رواں ہو جاتا ہے۔

یوسا کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ مثالیں چن چن کر لاتا ہے؛ اگر تو قاری نے فکشن کی اِن مثالوں کو پہلے سے پڑھ رکھا ہو تو سارا فن پارہ اپنی جزیات سمیت دمکنے لگتا ہے اور اگر نظر سے نہ گزری ہوں تو بھی اُس کا مدعا واضح ہو جاتا ہے۔ ''بستہ وقت''، ''گاڑھا وقت''، ''زندہ وقت''، ''مردہ وقت''، ''عبوری وقت''، وغیرہ والی اصطلاحات کے تراجم خوب رہے۔ اس تقسیم کو پڑھتے ہی فوراً دِھیان اپنے ہاں کی موسیقی کے/ کی مختلف راگ/ راگنیوں کی طرف چلا گیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اِن کی اَپنی بھی ایک کہانی ہے۔ ہم نے مشرقی موسیقی کے اس نظام سے بہت اثر قبول کیا ہے اور نتیجہ یہ نکلا کہ جاری وقت کے حوالے سے بھی ہماری حسیں کچھ فیصلے دِے دِیا کرتی ہیں۔ آخر یہ جو ایمن، بھوپالی، ہمیر، کامود، شام کلیان، شدہ کلیان کے گانے کا وقت رات کا پہلا پہر ہے تو اس کا بھی کوئی مطلب ہوگا۔ میاں کی ٹوڈی، گوجری ٹوڈی، سوہا کو آخر دن کے دوسرے پہر میں، جب کہ باگیشری کو رات کے دوسرے پہر میں ہی کیوں گایا جانا چاہیے؟ بات ان تہذیبی یا ثقافتی مظاہر تک آ کر رُک نہیں جاتی، ہم دعاؤں اور عبادتوں کے لیے بھی اوقات کا لحاظ رکھتے ہیں۔ جادو ٹونا کرنا ہو یا تعویذ دھاگہ ہر کہیں وقت دھیان میں رہتا ہے۔ دِھیان میں رہنے والا یہ وقت کہانی لکھتے ہوئے ہماری نفسیات پر غالب رہتا ہے لہذا اِسے بھی نفسیاتی تقسیم کی ذیل میں رکھنا ہوگا۔ ایک اور پُر لطف حوالہ تو میں بھولے جا رہا ہوں اور وہ ہے تصوف کا۔ اردو کہانی کا صوفی ٹائم مشین والے سائنس دان سے کہیں بہتر طریقے سے ایک وقت سے دوسرے وقت میں منتقل ہو سکتا ہے۔ اور اسے اردو فکشن میں موضوع بنا کر قابل اِعتنا کہانیاں لکھی گئی ہیں۔

میمن جی، کیا مناسب نہ ہوگا کہ ''خصوصی نقطے'' کو ''خاص یا مرکزی نقطے'' سے بدل لیا جائے۔ خیر، ''خصوصی'' میں بھی کوئی برائی نہیں ہے؛ مجھے بدل لینے سے ادائی میں سہولت ہو رہی تھی، اس لیے تجویز دے دی۔ میں ان ''خاص نقاط'' کو ''ثقلی نقاط'' بھی کہہ سکتا ہوں کہ انہیں پر کہانی کا سارا بوجھ لدا ہوتا ہے۔ اور آخر میں مجھے بھی یوسا کی طرح کہہ لینے دو کہ تم نے مجھے رواں کر دیا ہے۔

اگلی بار حقیقت کی سطحیں زیرِ بحث آئیں گی۔ یہ بھی میرا پسندیدہ موضوع ہے۔ دیکھتے ہیں اس باب میں یوسا کا کہنا کیا ہے؟

محبت کے ساتھ

_ محمد حمید شاہد

اسلام آباد: ۷ مئی ۲۰۰۸

-x-x-x-x-

برادرم حمید شاہد

السلام علیکم۔

آپ کے دو بے حد مفصل خط ملے۔ شکریہ۔ گزشتہ ہفتہ یہاں کلاسوں کا آخری ہفتہ تھا اور اب امتحانات کی ریل پیل ہے۔ جواب دینے میں تاخیر کا سبب یہی پیشہ ورانہ مصروفیات رہیں۔

اس سے پہلے کہ بات میرے ذہن سے نکل جائے، میں اسی برقی خط کے ساتھ ایک فائل منسلک کر رہا ہوں۔ اسے پڑھ کر اس کی اشاعت کے لیے کوئی مناسب جریدہ تجویز کریں۔ اس کا موضوع ایسا ہے جس سے آپ کو اور مجھے تو دل چسپی ہو سکتی ہے، ہمارے ادبی رسائل کے عام قارئین کو مشکل ہی سے ہو۔ ان میں سے بیش تر تو اسلاف کے ذہنی ورثے کو مدتیں ہوئیں دریا برد

کر چکے ہیں۔ ویسے اس مضمون کا صحیح مقام تو یہی ادبی رسائل ہیں کہ وہاں اسے پڑھ کر ہمارے یہاں کے عبقریوں میں جو بے حسی پیدا ہوگئی ہے اس میں تحریک کی رمق پیدا ہو۔ یہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ ازتسو کا جو مضمون ''دنیازاد'' کے تازہ شمارے میں شامل ہے، اس کی اشاعت کے سلسلے میں بھی آصف صاحب کو پس وپیش سی تھی۔ اور منسلکہ مضمون تو لوگوں کو شاید اور بھی دقیانوسی نظر آئے۔

منجملہ دیگر مضامین کے مجھے اسلامی فلسفے اور تصوف کی مابعد الطبیعیات سے بھی دل چسپی ہے۔ بڑے دنوں سے میری خواہش چند مضامین کا ترجمہ کرنے کی تھی۔ اب کہیں جا کر ان میں سے بعض کا ترجمہ کرلیا ہے، اور انھیں میں کا ایک آپ کو بھیج رہا ہوں۔ میری خاطر اسے پورے کا پورا پڑھ جائیے۔

ایک بات اور پوچھتا چلوں: ''دنیازاد'' کے تازہ شمارے میں، جس میں ازتسو کا مضمون شامل ہے، کیا میرے کچھ اور تراجم بھی ہیں؟ پرچہ میرے پاس ہنوز نہیں پہنچا ہے اور خدا جانے کب پہنچے۔ میں نے چند اور تراجم بھی آصف صاحب کی فرمائش پر بھیجے تھے۔ پتا نہیں وہ انھوں نے شامل کیے یا نہیں۔

بھائی، آپ کے ساتویں خط نے مجھے جس الجھن میں ڈال دیا ہے وہ آپ کے ''مہملیت'' سے متعلق خیالات ہیں۔ بل کہ یوں کہنا چاہیے کہ آپ کی بات کی معنویت یا اس کی ضرورت میری سمجھ میں نہیں آ رہے ہی۔ ناول میں زندگی کی ''مہملیت'' کوئی مجرد شے نہیں ہوتی کہ جس پر صرف نظریاتی اعتبار سے گفتگو کی جا سکے۔ ہوسکتی ہے، لیکن اس پر بحث صرف فلسفے کے نقطۂ نظر سے ہوسکتی ہے۔ ناول میں زندگی کی ''مہملیت'' کوئی مجرد شے نہیں ہوتی بل کہ لکھنے والے کی ناولی تیکنیک یا تعمیری آلات کا جز۔ اسے یوں سمجھیں، کوئی واقعہ فی نفسہٖ مہمل ہوسکتا ہے لیکن ناول میں اس کی مہملیت سے کچھ اور اجاگر ہوتا ہے، سو آپ چاہیں تو اسے فی نفسہٖ مہمل لیکن بالفعل فائدہ مند یا پر معنیٰ کہہ لیں، کیوں کہ موخر الذکر صورت میں یہ ناول (کردار، موضوع، وغیرہ) کی معنویت کا جزِ لاینفک ہوتا ہے۔ اگر آپ بھی یہی کہہ رہے ہیں تو میں آپ سے متفق ہوں، اگر کچھ اور، تو بھائی، میں موٹی عقل کا آدمی ہوں، ذرا اور اختصار سے سمجھا دیں۔

راوی ان معنیٰ میں ضرور آزاد ہے کہ اچھا لکھنے والا یہ ظاہر نہیں ہونے دیتا کہ اس کا راوی آزاد نہیں، وہ اس کے آزاد ہونے کا صرف التباس ہی پیدا کرتا ہے۔ ''میں جس راوی کی بات کر رہا ہوں وہ تخلیق کار نہیں ہوتا مگر اُس سے جدا بھی نہیں ہوتا۔'' یہ تو ٹھیک ہے، لیکن یہاں یہ ذہن میں رہنا چاہیے کے یوسا کے مطابق ایسے ''راوی'' یا ''راوی-کردار'' کا وجود تخلیق کے باہر نہیں ہوتا، صرف ناولی زمان ومکان یا ناول کے دورانیے ہی میں ہوتا ہے۔ تخلیق کار کا، بہ ہر حال، اپنا ذاتی وجود ہے جو تخلیق کے باہر خارجی دنیا میں اس کے طول العمر برقرار رہتا ہے جس میں وہ چاہے تو دوسرے ناولی زمان ومکان میں دوسرے راوی اور راوی-کردار تخلیق کرسکتا ہے، جو خود اس ناول کے دورانیے کے باہر زندہ نہیں رہ سکتے۔

آٹھویں خط میں بھی میری مشکل یہی ہے کہ میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ آپ یوسا سے اختلاف کر رہے ہیں یا اتفاق۔ جہاں تک میں یوسا کو سمجھ پایا ہوں، وہ صرف یہ کہہ رہا ہے کہ physical وقت (زمان)، جو یہی گھڑی کا وقت ہے جو آگے کی طرف حرکت کرتا ہے، جسے ہم حقیقی وقت کہتے ہیں، اس وقت سے مختلف ہے جو ناولوں میں استعمال ہوتا ہے یا ہوسکتا ہے؛ وہاں اس کی مختلف قسمیں اور شاخ سانے ہیں، جن میں سے ایک ''نفسیاتی'' بھی ہے۔ ''یوسا نے وقت کی

حقیقی اور نفسیاتی تقسیم کی تھی اور فکشن کے وقت کو گھڑا ہوا وقت بتایا تھا تو کیا وہ غیر حقیقی نہیں ہو جاتا؟'' میرے خیال میں تو نہیں۔ وہ وقت کی ''ماہیت'' (quiddity) کی بات نہیں کر رہا، یعنی وقت کا ''بہ حیثیت وقت یا ماہیت'' حقیقت یا حقیقی ہونا۔ مابعد الطبیعیاتی (اور خاص طور ہمارے تصوف کی مابعد الطبیعیات میں) وقت کا ویسے بھی کوئی وجود نہیں۔ یہ زیادہ سے زیادہ ایک نسبت ہے جو (وجود کے اعتبار سے) اس غیر حقیقی دنیا میں اشیا کے تعین کا کام انجام دیتی ہے۔ فکشن کا وقت اتنا ہی ''حقیقی'' یا ''غیر حقیقی'' ہے جتنا وجود کے اعتبار سے ''وقت'' بذاتہٖ۔ میرا خیال ہے کہ اگر آپ اس ''غیر حقیقی'' کہنا چاہیں تو اس پر نہ یوسا کو کوئی اعتراض ہوسکتا ہے نہ مجھے، کیوں کہ یہ یوسا کی بحث کا حصہ نہیں۔ وہ تو صرف وقت کی مختلف نوعیّتوں کی بات کر رہا ہے۔ اور اس اعتبار سے ''ناولی وقت'' ایک غیر حقیقی یا گھڑنت وقت ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ یہ کوئی منفی چیز ہے۔ جب ناول خود پورے کا پورا ایک گھڑنت ہے تو اس میں مستعمل وقت کیسے حقیقی ہوسکتا ہے۔ لیکن یہ ناول کے کرداروں کے حوالے سے ضرور حقیقی ہوتا ہے، اتنا ہی جتنے وہ کردار حقیقی ہوتے ہیں۔

آپ نے لکھا ہے: ''ایک اور پر لطف حوالہ تو میں بھولے جا رہا ہوں اور وہ ہے تصوف کا۔ اردو کہانی کا صوفی ٹائم مشین والے سائنس دان سے کہیں بہتر طریقے سے ایک وقت سے دوسرے وقت میں منتقل ہوسکتا ہے۔ اور اسے اردو فکشن میں موضوع بنا کر قابل اعتنا کہانیاں لکھی گئی ہیں۔''

مجھے کرید ہو رہی ہے کہ یہ کون سی کہانیاں ہیں۔ بھائی ان کے مصنفین اور کہانیوں کے نام لکھیں۔ شکریہ۔ قبل اس کے بھول جاؤں، ''مرکزی نقطے'' اور ''ثقلی نقاط'' تجویز کرنے کا بے حد شکریہ۔ مجھے اچھے لگے۔ کچھ غور کر کے شاید انھیں ہی استعمال کروں۔

والسلام

— محمد عمر میمن

میڈیسن: ۱۳ مئی ۲۰۰۸

❀❀❀

گیارہ

تصوف، کہانی اور حقیقت

پیارے عمر میمن:

آداب

بھئی تمہارے طرف سے یک دم خاموشی نے مجھے پہلے تو اُلجھایا اور پھر دوسرے دھندوں کی طرف مائل کر دیا۔ مجھے اندیشہ ہو چلا تھا کہ جس موضوع کو ہم لے کر چل رہے ہیں اس سے تمہاری طبیعت سیر ہو چکی ہے۔ خیر اگر ایسا ہو گیا ہوتا تو بھی یہ کوئی نئی بات نہ ہوتی۔ تاہم میں پھر سے یکسو ہونے کے جتن کروں گا اور خدا کا شکر بھی ادا کروں گا کہ ایسا نہیں ہوا۔

''دنیا زاد'' کے تازہ شمارے میں ''وجودیت: مشرق و مغرب'' والا ترجمہ ہی شامل کیا گیا ہے اور اطلاعاً عرض ہے کہ میں نے اسے توجہ سے پڑھا ہے۔ اس پر بات ہوگی مگر اب ادھر نکل گیا تو سہولت سے واپسی ممکن نہ ہوگی۔ اور ہاں تمہارا مضمون ''نقاط''

کو چھپنے کے لیے بھیج رہا ہوں۔ (تاہم ابھی یہ پڑھنا باقی ہے۔ بھئی معاف کرنا میں ذرا پڑھنے کے معاملے سست رفتار ہوں کہ اَدھک پڑھوں تو اُدھل جاتا ہوں۔ اوہ میں کیا جھل مار رہا ہوں، اُدھلتی تو عورتیں ہیں۔ بجا، مگر تم ہی کہو کہ جو آدمی اپنی معشوق کی بہ جائے کتابوں کے ساتھ بھاگ نکلے اور آوارہ خرامی میں آس پاس کو بھول جائے تو وہ عرف عام میں کیا عورت/ مرد ہو سکتا ہے؟)

میمن جی، مجھے خوشی ہے کہ تم اب باقاعدہ ان نقاط پر بحث کرنے لگے ہو جو مجھے الجھاتے، مشتعل کرتے یا پسند آتے رہے ہیں۔ تمہارا یوں الجھنا مجھے اچھا لگنے لگا ہے۔ مہملیت کے حوالے سے تمہاری بات سمجھ میں آتی ہے اور میں تمہارے اس نقطہ نظر سے کہاں دور تھا کہ ''فکشن میں زندگی کی 'مہملیت' کوئی مجرد شے نہیں ہوتی اس سے کچھ اور اجاگر ہوتا ہے اور یہ فی نفسہ مہمل ہو کر بھی بالفعل فائدہ مند/ پر از معنی ہوتی ہے۔'' فی الاصل میں جو کہنا چاہتا تھا تم نے اسے اپنے ڈھنگ سے اور ذرا قرینے سے بیان کر دیا ہے۔ شکریہ۔

یوسا کے حوالے سے تم نے ''یہ ٹھیک ہے'' کہہ کر ایک بات مانی اور اگلے جملوں میں لگ بھگ مانی ہوئی بات کو لپیٹ کر ایک طرف پھینک دیا۔ کیا میں تم سے درخواست کر سکتا ہوں کہ میرے خط کے مذکورہ حصے پر ایک نظر اور ڈال لو۔ مانتا ہوں کہ میں ذرا اناڑی واقع ہوا ہوں۔ ڈھنگ سے بات کہنا ہو تو ہکلا کر مات کھا جاتا ہوں۔ اس باب میں، اپنی بات دہراؤں گا نہیں کہ جب ہم حقیقت کے حوالے سے آگے چل کر مزید بات کریں گے تو اس پر کچھ اور کہنے کے ضرور مواقع نکل آئیں گے۔ آٹھویں خط میں جو میں نے کہا اس نے تمہیں مشکل میں ڈال دیا تم فیصلہ نہیں کر پا رہے کہ میں یوسا سے اختلاف کر رہا ہوں یا اتفاق؟ (آہا، یہ بھی خوب رہا۔ مجھے ایک دفعہ پھر تم اپنی اُلجھن کی جھن جھن کا لطف لینے دو۔) لو مزے کی بات سنو، میں یوسا سے اتفاق کر رہا تھا نہ اختلاف، میں تو اپنی بات کہہ رہا تھا۔ کیا وقت کو سمجھنے کا ایک قرینہ یہ نہیں ہو سکتا۔ اچھا اب تم یوں تو نہ کہو کہ مابعد الطبیعیات میں وقت کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔ بھئی وجود اور موجود کے الجھیڑے سے نمٹ لیں گے تو اِس نگوڑے وقت کی لپک کی طرف بھی دھیان چلا جائے گا۔ ہاں میں تسلیم کرتا ہوں کہ کچھ باتیں جو یوسا کی بحث کا حصہ نہیں تھیں ہم ان کی طرف نکلتے رہے ہیں۔ اجی یہی تو یوسا کی خوبی ہے کہ وہ ہمیں مختلف موضوعات کی طرف جانے دے رہا ہے۔

تم نے کہا: تصوف تمہارا پسندیدہ موضوع ہے، اور میرا معاملہ یہ ہے کہ یہ مجھے ایک ہی وقت میں الجھاتا اور کئی الجھنوں سے نکالتا بھی ہے۔ اردو والوں کو اس موضوع سے خاص دلچسپی رہی ہے۔ تم نے انتظار حسین کو بہت پڑھ رکھا ہے۔ ایک زمانہ تھا جب انتظار کے سامنے ہند مسلم تہذیب اور وہ انسان تھا جو پاؤں کی مٹی جھاڑ کر تاریخی اور تہذیبی روایت میں دور کی زمینوں اور زمانوں کا سفر کرتا تھا۔ جب میں نے ''آخری آدمی'' کی کہانیوں کو پڑھا تھا کہ جن میں صوفیائے کرام کے ملفوظات تھے، عہد نامہ عتیق کی خاص فضا تھی اور داستانوی کردار کہانیوں کے متن کا حصہ ہو کر انسان کو برتر سطح وجود پر جینے کا چلن سجھا رہے تھے۔ ''آخری آدمی''، ''زرد کتا'' اور ''ہڈیوں کا ڈھانچ'' جیسے افسانوں میں، کہ جن میں مادی اور جسمانی خواہشات ہیچ ہو جاتی تھیں، آدمی لالچ اور حرص و ہوس سے بلند ہونے کی طرف راغب ہو جاتا تو اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ ان میں وقت اپنی عمومی رفتار سے نہیں چل سکتا تھا۔ اور جس رفتار سے چل رہا تھا وہ غیر حقیقی نہیں تھی۔ ادھر ہماری نسل کا ایک اور افسانہ نگار ہے، جمیل احمد عدیل، اس نے کچھ سال پہلے ''نروان'' کے نام سے ''منتخب روحانی افسانے'' چھاپ دیے تھے جس میں اس نے کل بیس

افسانے جمع کیے ہوں گے اور ساتھ ہی اعلان کیا تھا کہ وہ ایک اور جلد بھی چھاپنے کا ارادہ رکھتا ہے۔

جن افسانہ نگاروں کے افسانے اس میں شامل ہیں' (مجھے الگ رکھو' باقی) سب معروف لکھنے والے ہیں۔ ان افسانوں کی بابت دعوی کیا گیا تھا کہ ان میں افسانہ نگاروں کا ''صوفیانہ شعور'' کام کر رہا تھا۔ لو، یہ فہرست تم خود دیکھ لو:

۱۔ ممتاز مفتی، ''سیڑھی سرکار''

۲۔ احمد ندیم قاسمی، ''عاجز بندہ''

۳۔ عزیز احمد، ''تصور شیخ''

۴۔ قدرت اللہ شہاب، ''بملہ کماری کی بےچین روح''

۵۔ محمد خالد اختر، ''فورتھ ڈائمنشن''

۶۔ اشفاق احمد، ''بیا جاناں''

۷۔ انتظار حسین، ''زرد کتا''

۸۔ ڈاکٹر سلیم اختر، ''تیرھواں برج''

۹۔ جیلانی بی اے، ''اذان''

۱۰۔ بانو قدسیہ، ''کعبہ میرے پیچھے''

۱۱۔ محمد منشا یاد، ''رکی ہوئی آوازیں''

۱۲۔ رشید امجد، ''لمحہ جو صدیاں ہوا''

۱۳۔ خالدہ حسین، ''مکڑی''

۱۴۔ مرزا حامد بیگ، ''ایک خاکی کا معراج نامہ''

۱۵۔ اعجاز احمد فاروقی، ''ایک غیر مرئی الہ آباد''

۱۶۔ مظہر الاسلام، ''می رقصم''

۱۷۔ سراج منیر ''نالہ نے''

۱۸۔ محمد حمید شاہد، ''ماخوذ تاثر کی کہانی''

۱۹۔ ابدال بیلا، ''بند مٹھی''

۲۰۔ جمیل احمد عدیل، ''رتن مالا اور کاتب کلام''۔

ان بیس کہانیوں کے بارے میں شاید میں مرتب کے دعوی کی تائید نہ کر پاؤں مگر ان میں چند افسانے واقعی ایسے ہیں کہ وقت کو اپنی عمومی ڈگر سے چلنا یاد ہی نہیں رہتا۔ اگر یہ کتاب تمہیں کہیں سے مل جائے تو ایک نظر دیکھ لینا۔

ڈاکٹر رشید امجد کے کل افسانوں کا مجموعہ ''عام آدمی کے خواب'' حال ہی میں چھپا ہے۔ اس کی کئی کہانیاں ایسی ہیں کہ جہاں کہانی بند گلی میں داخل ہو جاتی ہے مرشد، وقت کی چادر کاٹ کر برآمد ہوتا ہے اور آدمی کے سامنے سارے راستے کھل جاتے

ہیں۔آصف کی کہانی ''بودلو'' بھی ذہن میں تازہ کرو کہ جس میں بکھرے ہوئے بدن کی بوٹی بوٹی اور ریشہ ریشہ مرشد کی پکار پر پھر سے مجتمع ہو جاتا ہے۔لو آصف کا ذکر آیا تو ''دنیازاد'' میں شائع ہونے والے تشی ہیکو ازتسو کے مضمون کی طرف اشارے کا موقع بھی نکل آیا ہے۔اس نے بھی تو ہائڈ یگر کے حوالے سے،حقیقت اور واقعی حقیقت کی بحث کو ایرانیوں کی جانب سے اصالت الوجود کے باب میں جوہر اور وجود سے جوڑ کر دکھانے کی کوشش کی ہے۔اب تم ہی کہو ہائڈ یگر، سارتر اور سبزواری کا تصور وقت کیوں کر ایک ہو سکتا ہے۔

اجازت دو۔آج طبیعت ذرا اُلجھی اور اُدھڑی ہوئی ہے۔فشار خون بلند ہے، اتنا کہ سر میں مسلسل دباؤ سا محسوس ہوتا ہے۔ یوسا کے اگلے خط پر بات ہوگی مگر ایک توقف کے بعد۔

محبت کے ساتھ

___ محمد حمید شاہد

اسلام آباد :١٦مئی ٢٠٠٨

-x-x-x-x-

برادرم حمید شاہد

السلام علیکم

خط ملا۔جواب میں بس دو تین جملے ہی ہوں گے۔خدا کرے آپ نے میرا مضمون ''نقاط'' کو ہنوز نہ بھیجا ہوگا۔اگر بھیجا ہو تو اسے رکوا دیں۔اس کی دو وجہیں ہیں:

= اس پر ابھی نظر ثالث و رابع کرنا باقی ہے۔بعض الفاظ کی بابت میرا ذہن صاف نہیں ہے اور میں ہنوز ان کے مناسب مترادفات ڈھونڈ رہا ہوں۔یہ ابھی اشاعت کے قابل نہیں۔بھائی، یہ میں نے آپ کو صرف رائے دینے کے لیے بھیجا تھا۔

= دوسری بات یہ ہے کہ میں نے ایک خط محمد سہیل عمر صاحب کو بھی لکھا تھا جس میں ان تراجم کے سلسلے میں ان سے مشورہ لیا تھا۔انھوں نے انھیں چھاپنے کی پیشکش کر دی، جو میں نے قبول کر لی ہے۔وہ ازتسو کی پوری کتاب چھاپنے پر بھی راضی ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ کوئی پیچیدگی پیدا ہو، اور یہ بات اخلاقی اعتبار سے بھی مناسب نہیں۔

میں پہلے ''نقاط'' کا ایک شمارہ دیکھنا چاہتا ہوں۔بعد میں انھیں کوئی اور مضمون بھیج دوں گا۔

بس اب میرا قلم انھیں موضوعات کی طرف چل پڑا ہے۔

والسلام،

___ محمد عمر میمن

میڈیسن:١٦مئی ٢٠٠٨

❁❁❁

غزلیں

''غزل داخلی شاعری ہے۔ اس میں پراگندگی بھی ہے اور پریشاں نظری بھی۔ ایسی حالت میں اس صنف میں دلچسپی اور وابستگی پیدا کرنا آسان کام نہیں ہے۔ قاموس ولغات یا بہت بڑے فن کا استعمال ہی عظمت منوا سکتا ہے اور جب یہ فن عوام کے دلوں کو دکھ درد اور ذوق سلیم کے ساتھ چھو لیتا ہے تو جگ بیتی بیان کر کے لوگوں کے دلوں میں ایک نشتریت کے ساتھ اتر جاتا ہے۔''

__________پروفیسر سیّد محمد عقیل

احمد مشتاق

مل ہی آتے ہیں اسے ایسا بھی کیا ہوجائے گا
بس یہی نہ ، درد کچھ دل کا سوا ہوجائے گا

وہ مرے دل کی پریشانی سے افسردہ ہو کیوں
دل کا کیا ہے کل کو پھر اچھا بھلا ہوجائے گا

گھر سے، کچھ خوابوں سے ملنے کے لیے نکلے تھے ہم
کیا خبر تھی زندگی سے سامنا ہوجائے گا

رونے لگتا ہوں محبت میں تو کہتا ہے کوئی
کیا ترے اشکوں سے یہ جنگل ہرا ہوجائے گا

کیسے آسکتی ہے ایسی دل نشیں دنیا کی موت
کون کہتا ہے کہ یہ سب کچھ فنا ہوجائے گا

مظفر حنفی

ہر ایک نوکِ پلک میں شرر لگائے ہوئے
چلا گیا میں نظر چاند پر لگائے ہوئے

ادھر بھی دیکھ کہ ہم موج موج بہتے ہیں
شکستہ کشتی کے تختے پہ سر لگائے ہوئے

تمام شہر کو لاحق ہے کس سے خطرۂ جاں
یہاں تو جو بھی ملا وہ سپر لگائے ہوئے

عجب نہیں ہے کہ ڈھل جائیں اگلی بارش میں
یہ گھر کے نقشے پہ دیوار و در لگائے ہوئے

لطیفہ یہ ہے کہ اب دھوپ کو ترستے ہیں
سروں سے آن لگے ہیں شجر لگائے ہوئے

پروں کو اپنے وہ پھیلائیں تو مزہ آجائے
کٹی پتنگ پہ ہیں کیوں نظر لگائے ہوئے

پڑا ہوا ہے پچھتر برس سے اک ہم زاد
ہماری گور سے اپنی کمر لگائے ہوئے

ناصر شہزاد

ان لہلہاتی صبحوں میں کچھ دن گذار لے
منظر مری کے ساجنا دل میں اتار لے

ان جنگلوں کی جیتی جواں خوشبوؤں میں جاگ
ان مست وادیوں میں وجود اپنا مار لے

بٹھلا کے اس کو لفٹ کے جھولے میں اپنے ساتھ
مُکھ موسموں کے چوم ، خنک رُت کا پیار لے

ہمجولیوں کے سنگ بتا وقت ''سیمز'' میں
چائے کی اٹھتی بھاپ سے شامیں سنوار لے

پربت کی اونچی نیچی ڈھلانوں پہ کر سفر
اٹھ جی' پی' او' سے جاکے کرائے پہ کار لے

سُن تاڑ کے درخت پہ جھینگر کو نغمہ زن
جھرنے کے پاس بیٹھ کے پاؤں پسار لے

شب ، دھند ، مال روڈ ، ہوا ، روشنی ، گھٹا
پھر یہ سمے ملے نہ ملے پران ہار لے

بشر نواز

سلگتے جنگلوں میں کچھ تو مثلِ آب دیکھا تھا
خیال آتا ہے ان آنکھوں نے کوئی خواب دیکھا تھا

بہت ملتی ہوئی تم سے کوئی تصویر تھی شاید
پگھلتا موم کی صورت کوئی مہتاب دیکھا تھا

پھر اس کے بعد کیا بیتی ، تمھیں سے پوچھنا ہوگا
مجھے بس یاد آتا ہے کہ اک گرداب دیکھا تھا

پلک جھپکی نہ تھی اور خشک صحرا بن گئے وہ بھی
لہکتے دھان کی صورت جنھیں شاداب دیکھا تھا

وہ کشتی ہوں ، کھلونا ہے جو اب اندھی ہواؤں کا
کبھی اُمڈے ہوئے دریا کو بھی پایاب دیکھا تھا

منور رانا

اے عشق ہم نے تیری اطاعت میں کاٹ دی
اس سے بچھڑ کے عمر ہی عدت میں کاٹ دی

کچھ دیر اور تیرتے رہتے فضا میں ہم
تونے پتنگِ غم ذرا عجلت میں کاٹ دی

آیا ہی تھا خیال کہ آلِ رسولؐ ہیں
شہ رگ ہی ہم نے جوشِ سخاوت میں کاٹ دی

اس فاختہ کی کُوک سے زخمی ہوں آج تک
وہ فاختہ جو آپ نے دعوت میں کاٹ دی

جو زندگی گزرنی تھی زلفوں کی چھاؤں میں
میں نے وہ عمر دشتِ اذیت میں کاٹ دی

بس اتنی زندگی کا ہمارا حساب ہو
وہ زندگی جو تیری عبادت میں کاٹ دی

جس طرح اس نے رکھا ، رہے ہم اسی طرح
دوزخ میں کاٹ دی ، کبھی جنت میں کاٹ دی

منور رانا

چلے مقتل کی جانب اور چھاتی کھول دی ہم نے
بڑھانے پر پتنگ آئے تو چرخی کھول دی ہم نے

پڑا رہنے دو اپنے بوریئے پر ہم فقیروں کو
پھٹی رہ جائیں گی آنکھیں جو مٹھی کھول دی ہم نے

کہاں تک بوجھ بیساکھی کا ساری زندگی ڈھوتے
اترتے ہی کنوئیں میں آج رسّی کھول دی ہم نے

فرشتوں تم کہاں تک نامۂ اعمال دیکھو گے
چلو تم نیکیاں گن لو کہ گٹھری کھول دی ہم نے

تمھارا نام آیا اور ہم تکنے لگے رستہ
تمھاری یاد آئی اور کھڑکی کھول دی ہم نے

پرانے ہو چلے تھے زخم سارے آرزوؤں کے
کہو چارہ گروں سے آج پٹّی کھول دی ہم نے

تمھارے دکھ اٹھاتے اس لیے پھرتے ہیں مدت سے
تمھارے نام آئی تھی جو چٹھی کھول دی ہم نے

مہدی جعفر

فتنہ شعار دور ہے جعفر میاں بچو
سینگوں کے ساتھ طور ہے جعفر میاں بچو

راحت ملی جہاں کی تنگ آسانیوں کے ساتھ
یہ پر فریب طور ہے جعفر میاں بچو

کم تر رہو جو خود سے اسی میں نجات ہے
عظمت گری کا دور ہے جعفر میاں بچو

نعمت جہاں کی آئے تمھارے نہ آس پاس
یہ بات زیر غور ہے جعفر میاں بچو

تم کو گماں ہوا وہ رفیق شباب ہے
شاید یہ کوئی اور ہے جعفر میاں بچو

اس کی عطائے خاص بھی حق میں اسی کے ہے
احسان کے بطور ہے جعفر میاں بچو

صنعت کدے میں دہر کے ڈھالی گئی وفا
پیدا جفا و جور ہے جعفر میاں بچو

نصیر احمر

جب رنگِ بہارِ گل شاخوں پہ اتر آیا
رعنائیِ موسم کا کردار نظر آیا

اک شور سا اٹھّا ہے شہروں کی فصیلوں سے
جب ہار گیا بادل ، جب چاند ابھر آیا

آنکھوں پہ یقیں کرلوں ، یا دل میں دھواں بھرلوں
تم مجھ کو نظر آئے یا خواب نظر آیا

پھر نیند کی خوشبو سے بوجھل نہ ہوئی آنکھیں
جب رات کی سولی پر اک چاند نظر آیا

آئینہ تو سچا ہے ، آئینہ چھپاتا کیوں
جو کچھ تھا مرے دل میں ، چہرے پہ ابھر آیا

میں کون ہوں ؟ میں کیا ہوں ؟ یہ ارض و سما کیا ہیں؟
جب غور کیا میں نے ، اپنے سے بھی ڈر آیا

احمر یہ تماشا بھی دیکھا مری آنکھوں نے
ملتے ہی نظر مجھ سے ، وہ دل میں اتر آیا

کرشن کمار طور

کبھی کبھی مجھ سے دل نے یہ کہا ہے
یہ زندگی کسی جرم کی سزا ہے

کسے سنائیں اس غم کا ماجرا اب
یہاں جو ہونا تھا اب وہی ہوا ہے

ہے کفر لیکن یہ کہنا ہی پڑے گا
کہ مجھ سے بے پروا اب مرا خدا ہے

یہ کیوں میں خود سرسبز ہورہا ہوں
جدا نہیں جو مجھ سے وہی جدا ہے

قریب تر تھا جو میری شاہ رگ سے
قیامتوں کا اب اس سے فاصلا ہے

سنو نہ مجھ سے احوال عاشقی کا
یہ میرے کاندھوں پہ پیر تسمہ پا ہے

پڑھیں گے ہم بھی اے طورؔ اسم اعظم
ہمارا اس سے بھی ایک واسطا ہے

کرشن کمار طور

نمود ، صبح ذرا سی نظر تو آئی ہے
وہ آنکھ میرے خدا سی نظر تو آئی ہے

یہ انکشاف مجھے دم نہ لینے دے گا ، کہیں
کہ حبس دم کو ہوا سی نظر تو آئی ہے

گرفت جو نہیں ہوتی ہمارے خون سے اب
وہ رات نقش ، انا سی نظر تو آئی ہے

تمام رشتے ہیں دنیا میں میرے ہونے تک
بساطِ زیست ذرا سی نظر تو آئی ہے

چٹک رہے ہیں یہ غنچے اب اپنی مستی میں
اسی بہانے صدا سی نظر تو آئی ہے

یہاں پہ سنتا ہوں میں اپنے ہونے کی آواز
یہاں پہ سانس جدا سی نظر تو آئی ہے

وصالِ یار میں اے طورؔ یہ مری ہستی
ہے شکر مجھ سے خفا سی نظر تو آئی ہے

یاسمین حمید

ترا عکس ندامت چاہتا ہے
دل آئینہ ہے ، حیرت چاہتا ہے

برسنے دو وہیں پر بادلوں کو
سمندر اور وسعت چاہتا ہے

اندھیری رات سے ماہِ تمنا
چمکنے کی اجازت چاہتا ہے

مرے اعصاب کو اک بوجھ دے کر
ترا احسان قیمت چاہتا ہے

مرے اندر کوئی مجھ سے سوا بھی
ترے غم کی حفاظت چاہتا ہے

سماعت کے دریچے کھل نہ جائیں
بیاں شورِ قیامت چاہتا ہے

غلام حسین ساجد

نہائے خبث کا اظہار کردیا اُس نے
مرے وجود سے انکار کردیا اُس نے

جھلک دکھا کے کسی اجنبی ستارے کی
نظر کو مطلعِ انوار کردیا اُس نے

کسی طلسم کی تاثیر میں اضافہ کیا
کسی طلسم کو بے کار کردیا اُس نے

نہیں کُھلے گی اندھیرے میں اب ہنسی اُس کی
مرے چراغ کو بیمار کردیا اُس نے

بس ایک میں تھا جہاں بھر میں خیر کا داعی
مجھے بھی درپئے آزار کردیا اُس نے

کئی دنوں سے مجھے نیند آ نہیں پائی !
کہ میرے خواب کو دیوار کردیا اُس نے

ذرا سا طیش دلانے کی دیر تھی ساجدؔ
تمام شہر کو مسمار کردیا اُس نے

عرفان ستّار

کہاں نجانے چلا گیا انتظار کرکے
یہاں بھی ہوتا تھا ایک موسم بہار کرکے
جو ہم پہ ایسا نہ کارِ دنیا کا جبر ہوتا
تو ہم بھی رہتے یہاں جنوں اختیار کرکے
نجانے کس سمت جا بسی بادِ یاد پرور
ہمارے اطراف خوشبوؤں کا حصار کرکے
کٹیں گی کس دن مدار و محور کی یہ طنابیں؟
کہ تھک گئے ہم حسابِ لیل و نہار کرکے
تری حقیقت پسند دنیا میں آبسے ہیں
ہم اپنے خوابوں کی ساری رونق نثار کرکے
یہ دل تو سینے میں کس قرینے سے گونجتا تھا
عجیب ہنگامہ کردیا بے قرار کرکے
ہر ایک منظر، ہر ایک خلوت گنوا چکے ہیں
ہم ایک محفل کی یاد پر انحصار کرکے
تمام لمحے وضاحتوں میں گزر گئے ہیں
ہماری آنکھوں میں اک سخن کو غبار کرکے
یہ کھلا ہے، کہ اُس میں موتی بھی ڈھونڈنے تھے
کہ ہم تو بس آگئے ہیں دریا کو پار کرکے
بقدرِ خوابِ طلب لہو ہے، نہ زندگی ہے
ادا کرو گے کہاں سے اتنا ادھار کرکے

عرفان ستّار

تری نسبت سے زمانے میں عیاں تھے ہم بھی
تو جو موجود نہ ہوتا، تو کہاں تھے ہم بھی
حرمتِ حرف نہیں ہے سو یہ ارزانی ہے
ورنہ وہ دن بھی تھے جب خوابِ گراں تھے ہم بھی
ہم بھی حیراں ہیں بہت خود سے بچھڑ جانے پر
مستقل اپنی ہی جانب نگراں تھے ہم بھی
اب کہیں کیا، کہ وہ سب قصۂ پارینہ ہوا
رونقِ محفلِ شیریں سخناں تھے ہم بھی
وقت کا جبر ہی ایسا کہ خاموش ہیں اب
ورنہ تردیدِ صفِ کجکلاہاں تھے ہم بھی
رنج مت کر کہ تجھے ضبط کا یارانہ رہا
کس قدر واقفِ آدابِ فغاں تھے ہم بھی
تو بھی کردار کہانی سے الگ تھا کوئی
اپنے قصے میں حدیثِ دگراں تھے ہم بھی
کیسی حیرت، جو کہیں ذکر بھی باقی نہ رہا
تو بھی تحریر نہ تھا، حرفِ بیاں تھے ہم بھی
ہم کہ رکھتے تھے یقیں اپنی حقیقت سے سوا
اب گماں کرنے لگے ہیں کہ گماں تھے ہم بھی
رائگاں ہوتا رہا تو بھی پئے کم نظراں
ناشناسوں کے سبب اپنا زیاں تھے ہم بھی
تو بھی کس کس کے لیے گوش بر آواز رہا
ہم کو سنتا تو سہی نغمۂ جاں تھے ہم بھی
ہم نہیں ہیں تو یہاں کس نے یہ محسوس کیا؟
ہم یہاں تھے بھی تو ایسے، کہ یہاں تھے ہم بھی

عرفان ستّار

بام پر جمع: ہوا ، ابر ، ستارے ہوئے ہیں
یعنی وہ سب جو ترا ہجر گزارے ہوئے ہیں

زندگی ہم سے ہی روشن ہے یہ آئینہ ترا
ہم جو مشاطۂ وحشت کے سنوارے ہوئے ہیں

حوصلہ دینے جو آئے ہیں ، بتائیں انھیں کیا؟
ہم تو ہمت ہی نہیں ، خواب بھی ہارے ہوئے ہیں

شوقِ واماندہ کو درکار تھی کوئی تو پناہ
سو تمھیں خلق کیا ، اور تمھارے ہوئے ہیں

خود شناسی کے ، محبت کے ، کمالِ فن کے
سارے امکان اسی رنج پہ وارے ہوئے ہیں

روزنِ چشم تک آپہنچا ہے اب شعلۂ دل
اشک پلکوں سے چھلکتے ہی شرارے ہوئے ہیں

ڈر کے رہ جاتے ہیں جب کوتاہِ اظہار سے جب
ہم جو یک رنگیِ احساس کے مارے ہوئے ہیں

ہم کہاں ہیں ، سرِ دیوار عدم ، نقشِ وجود
ان نگاہوں کی توجہ نے ابھارے ہوئے ہیں

بڑھ کے آغوش میں بھر لے ہمیں اے روحِ وصال
آج ہم پیرہنِ خاک اتارے ہوئے ہیں

ڈاکٹر شعور اعظمی

بگویمش حال قلب سوزاں، کہ آگ دل میں لگائے راکھوں
بترسم اومی شود پریشاں ، کہوں سکھی یا چھپائے راکھوں

کنم چہ تدبیر خیر مقدم ، مفر ازیں کشمکش نیابم
میں اُس کے رستے میں پھول رکھوں کہ اپنی انکھیاں بچھائے راکھوں

پیام شام وصال آید ، شنیدہ ام خوش جمال آید
نہ جانے کب آئے آنے والا، میں دیپ دوارے جرائے راکھوں

دلش چہ گو نہ قرار یابد ، اگر نہ پیغام یار یابد
وہ بھیجے خط یا نہ بھیجے مجھ کو ، میں اپنی پتیاں لکھائے راکھوں

چو پیش من روئے دلبر آید ، بگو چہ شاید چہ کردہ باید
نظر سے میں آرتی اتاروں کہ اپنے نیناں دُرائے راکھوں

ز سوزِ ہجراں نمی توانم کہ محو فکر وصال خوابم
جو نیند آئے سکھی ری نیناں تو اس کے سپنے سجائے راکھوں

اگر بہ آغوش خود بگیرد ، دلم ز فرط حیا بمیرد
اتاؤلی ہے کہے نہ کوئی میں لاج کیسے بچائے راکھوں

نثار پروانہ می کند دل ، شود فروزاں چون شمع محفل
سکھی وہ آیا جو سب کے ہوتے تو پیت کیسے نبھائے راکھوں

عذاب ہجراں دگر نہ خواہم کہ درد قلب و جگر نہ خواہم
نہ لے وہ جانے کا نام پھر سے میں واکو ایسے رجھائے راکھوں

اسیر زلف و دوتا بسازم ، جدا نخواہم کن از کنارم
کہیں نہ جانے دوں پھر سکھی ری، پیو کو جیو ماں لُکائے راکھوں

بطرز خسرو غزل سرایم ، شعورؔ فکر و ہنر نمایم
ہر ایک مصرع پہ سوچتا ہوں، کہ ساکھ اپنی بنائے راکھوں

عالم خورشید

کن سرابوں نے کیا اب کے گرفتار ہمیں
یاد بھی آتے نہیں ہیں در و دیوار ہمیں

اک عجب خواب کی آغوش میں مدہوش ہیں ہم
کوئی تعبیر بھی کرتی نہیں بیدار ہمیں

سب سجائے ہوئے بیٹھے ہیں دکانیں اپنی
ساری دنیا ہی نظر آتی ہے بازار ہمیں

کچھ نظر آتا نہیں اپنی ضرورت کے سوا
زندگی لگتی ہے اب درہم و دینار ہمیں

ہم کمر باندھ کے ساحل پہ چلے آئے مگر
اب صدا کوئی بلاتی نہیں اس پار ہمیں

ڈوبنے لگتی ہے کشتی جو بھنور میں عالؔم
ناخدا سونپ دیا کرتا ہے پتوار ہمیں

خورشید اکبر

نہ کوئی اتنا ہواؤں سے انحرافی ہو
کہ آتی جاتی ہوئی سانس اختلافی ہو

فرشتے ہونے کو نکلے تھے آدمی نہ رہے
خدا سے کہہ دو تمنّاؤں کی معافی ہو

ملا ہے موسمِ محبوب پیرہن کی طرح
حصارِ تکیۂ جاں ریشمی غلافی ہو

چمن ہزار قصیدے سنائے پھولوں کے
ترا وصال مرے ہجر کی تلافی ہو

تجھے میں روح کی سرشار ساعتوں میں بُنوں
پھر اس کے آگے نہ معراجِ نوربافی ہو

یہ کیسی رات ہے ٹھہری ہوئی ہے صدیوں سے
جو کہہ رہی ہے کہ ردِّ سحر خلافی ہو

یہ ایک شہر ہمارے لہو کا منکر ہے
اب اس کے ہونٹ کی سرخی تو اعترافی ہو

کبھی تو اپنے سمندر کو ہوش آجائے
کبھی تو کشتیِ عمرِ رواں اضافی ہو

پہنچ گیا ہے جنوں اس مقام پر خورشیؔد
جہاں دوا نہیں دستِ دعا ہی کافی ہو

خواجہ جاوید اختر

سائے مجبور ہیں پیڑوں سے اترنے کے لیے
کیوں خزاں کہتی ہے پتوں سے بکھرنے کے لیے

بھر کے مٹھی میں تو لے جائے گی بادل کو ہوا
کوئی شب آئے گی تاروں سے سنورنے کے لیے

اس کو دو پل بھی مرا ساتھ گوارا نہ ہوا
ساتھ میں جس کے میں تیار تھا مرنے کے لیے

کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ ہوا روٹھ گئی
منتظر دھول ہیں باغوں میں بکھرنے کے لیے

کس بہانے سے تجھے دیکھنے آئے جاوید
کوئی رستہ ہو ترے در سے گزرنے کے لیے

خوشبیر سنگھ شاد

اگر سورج ذرا سا دھوپ کو سفاک کردے
تو ممکن ہے کہ ہر سائے کا دامن چاک کردے

ہوا کے دوش پر اٹکھیلیاں تو کر رہے ہو
خبر کیا کب بگولے سے تمھیں پھر خاک کردے

جسے دل میں چھپائے اب تلک خاموش ہے تو
یہ ممکن ہے وہی وحشت تجھے بے باک کردے

تبھی ہر خواب سے پہلے وضو کرتی ہیں آنکھیں
کوئی تعبیر اندیشوں سے ان کو پاک کردے

یہ ہر چہرے میں اک بے لوث چہرہ دیکھتی ہے
بڑی معصوم خواہش ہے اسے چالاک کردے

خزاں کے دل میں بھی اک نرم گوشہ ہے وگرنہ
یہ چاہے تو درختوں کو خش و خاشاک کردے

پھر اس کے بعد تو اک شادؔ چہرہ بھی بنانا
مری مٹی کو خدا گر سپردِ خاک کردے

ذاکر خان ذاکر

کبھی عذابوں میں بس رہی ہے، کبھی یہ خوابوں میں کٹ رہی ہے
یہ مختصر سی ہے ندگی جو ہزاروں خانوں میں بٹ رہی ہے

کہیں پہ خوشیوں کی بارشیں ہیں، کہیں پہ نغماتِ عیش و مستی
مگر غریبوں کے گلشنوں سے خزاں ہی بڑھ کر لپٹ رہی ہے

کہاں ہیں جذبے محبتوں کے ، کہاں ہے رسمِ وفا پرستی
جو بڑھ رہی تھی شروع شروع وہی محبت تو گھٹ رہی ہے

جو سن رسیدہ شجر تھے سارے جڑوں سے اپنی اکھڑ رہے ہیں
زمیں کے رشتوں کی چھاؤں یاروسروں سے اپنے بھی چھٹ رہی ہے

کسے سنائیں گے اب وہ ذاکر کہ چاہتوں میں کشش نہیں ہے
نظر سے اوجھل میں ہو رہا ہوں نگاہ سے وہ بھی تو ہٹ رہی ہے

قمر صدیقی

یہ کھیت ، سبزہ ، شجر ، رہگزار ، سنّاٹا
اُگا ہے دور تلک بے شمار سنّاٹا

ہمارے خواب کوئی اور دیکھ لیتا ہے
ہماری آنکھ خلاء ، انتظار ، سنّاٹا

یہ لفظ لفظ میں بجھتے مکالموں کا دھواں
سکوتِ عشق ہے یا بے کنار سنّاٹا

کبھی تو چھیڑ کوئی ساز ، کوئی نغمۂ جاں
کبھی تو اپنے بدن سے اُتار سنّاٹا

نظمیں

نظم میں عام طور سے ایک طرح کا ربط اور تسلسل ضرور ہوتا ہے، لیکن نظم چونکہ کلام ہے، اس لیے یہ ربط اور تسلسل ہر نظم میں گھٹتا بڑھتا رہتا ہے اور اس کی نوعیت بھی بدلتی رہتی ہے۔ ہر نظم میں ایک ہی طرح کا ربط و تسلسل نہیں ہوتا اور مختلف اقسام کی نظم میں بھی اس صفت کی کیفیت اور کمیت مختلف ہوتی ہے۔ قصیدے کا تسلسل اور طرح کا ہے، مثنوی کا اور طرح کا، نئی نظم کا اور طرح کا۔ اور ربط و تسلسل کا وہ اقلیدسی تصور جو مغربی شعریات کے غلط مطالعے پر مبنی غلط نتائج نکال کر بعض لوگوں نے عام کرنا چاہا، وہ بہر حال ناقص اور نا کافی ہے۔

_______ شمس الرحمٰن فاروقی

زبیر رضوی

یہ جہاں تصادم کا

(ایک اور طویل نظم کا آغاز)

میں جہاں بھی گیا
میں نے دیکھا وہاں
سب نے قرطاسِ مقسوم پر
اپنے اپنے ضمیروں کے نوحے لکھے
اور اپنی ہزیمت کے کتبے لکھے
تم بھی اپنے اساطیر کے مسخروں کی طرح
اہلِ تحسین کی صف کا حصہ بنے
بادشاہِ زماں کی خرافات کی
داد دیتے رہے
اور تم!
تم نے انکار کی سب صلیبوں کو
آتش بجاں ہو کے سہہ تو لیا
سچ کہو کیا ملا؟
تم صلیبوں پہ وارے گئے
تم مگر وہ خدا ساز کردار کب بن سکے
جن کا حرفِ شہادت ہمارے لئے قولِ فیصل بنا
تم زمیں اور سمندر کے مخفی خزانوں کے
قزاق بن کر
جہازوں کو غرقاب کرتے رہے
اپنی آنکھوں کے پردوں پہ تم
ان گنت چہروں اور رنگتوں کے ہیولے
بناتے مٹاتے رہے

ٹیوب بچوں کا جشنِ ولادت مناتے ہوئے
تم نے بنجر زمینوں کو نَم کر دیا
اور فیشن کے اسٹیج پر
نیم عریاں لباسوں میں
سج دھج کے اٹھلا کے چلتی ہوئی ریم پر
گلبدن نسل کو آسماں کر دیا
نسل بردار گھوڑوں نے جب اصطبل چھوڑ کے
ریس میدان میں
اپنے اعلیٰ نتائج کی فہرست سونپی تو تم
دیر تک اس کو پڑھتے رہے
لکّی نمبر ہتھیلی پہ لکھتے رہے
تم نے اچھا کیا خود کو پھولوں میں
چاندی کے سکوں میں تلنے دیا
شب کے عشرت کدوں میں
جواں سال جسموں کی بولی لگاتے رہے
تم امارت کدوں کے عقوبت گھروں کو
نہ اندر سے جانے نہ باہر سے جانے
کہ تم تو سدا صف پسندوں میں شامل رہے
اور صفوں کے مراتب پہ مجھ تجھ سے اصرار کرتے رہے
تم نے سوچا کبھی تم نے کیا کیا کیا
بابل و نینوا کے اَبد گیر آثارِ تہذیب کو
خاک و مسمار کرتے ہوئے
تم نے دیوارِ گریہ کی حد سے ذرا دور پر
بے خطا آنکھ کے سیلِ گریہ کو
مٹی کے بے جاں خرابے پہ گرنے دیا
تم جو آلِ فلسطین کی ارضِ موعود پر حملہ آور ہوئے

اور انھیں بے زمیں بے مکاں کر دیا
تم نے یہ بھی کیا اپنے بحری جہازوں پہ تم
اسلحہ لاد کر پانی پانی پھرے
ساحلوں ساحلوں فوجی اڈوں کی تعمیر کی
ہر سمندر کی گہرائیاں آبدوزوں سے پامال کیں
تم نے سب کچھ کیا
سارے عالم کو لب بستہ کرتے رہے
اور ہماری زمینوں پہ بے مقصدی جنگیں لڑتے رہے
ایک ہم تھے کہ ہم آسماں سے اتاری ہوئی نعمتیں
سارے تحفے تحائف اور
انواع واقسام کے میوے پھل
اس کے سجدہ گزاروں کو انعام میں دے کے
رخصت ہوئے
ہم نے الجھے ہوئے سوت کی
کچے دھاگے کی جو ساعتیں پائی تھیں
اُن میں جیتے رہے
کالے طاقوں میں لَو دیتی پیلی ضیاؤں کو
ہر رات ہی اپنی آنکھوں کے انجم دیئے
آسماں پہ گھٹاؤں نے انگڑائی لی
بادلوں کے گرجنے برسنے کے موسم چلے آئے تھے
سرد جنگوں کا موسم تو کب کا چلا بھی گیا
ایٹمی اسلحے کو سمندر میں غرقاب کرنے کے
سب عہد و پیماں فراموش تھے
اک تصادم تھا جو دائرہ دائرہ
منبروں، مندروں اور کلیسا سے ہوتا ہوا
وجہِ پیکار تھا / حرفِ انکار تھا!

محمود شام

بیٹیاں پھول ہیں

پھول جب شاخ سے کٹتا ہے بکھر جاتا ہے
پتیاں سوکھتی ہیں ، ٹوٹ کے اڑ جاتی ہیں

بیٹیاں پھول ہیں

ماں باپ کی شاخوں پہ جنم لیتی ہیں
ماں کی آنکھوں کی چمک بنتی ہیں
باپ کے دل کا سکوں ہوتی ہیں
گھر کو جنت سا بنا دیتی ہیں
ہر قدم پیار بچھا دیتی ہیں
جب بچھڑنے کی گھڑی آتی ہے
غم کے رنگوں میں خوشی آتی ہے
ایک گھر میں تو اترتی ہے اداسی لیکن
دوسرے گھر کے سنورنے کا یقیں ہوتا ہے

بیٹیاں پھول ہیں

اک شاخ سے کٹتی ہیں مگر
سوکھتی ہیں نہ کبھی ٹوٹتی ہیں
اک نئی شاخ پر کچھ اور نئے پھول کھلا دیتی ہیں

صبا اکرام

سایہ ڈھونڈتا ہوں

عجب ویران سی
گرمی گزیدہ دوپہر کی
روح میں اتری اداسی
زہر میں ڈوبے ہوئے
ترشول کی صورت
مرے اندر ہی اندر
مجھ کو جیسے کاٹتی ہے
کہ ہر پل
میں یہاں اب ٹکڑے ٹکڑے
ہو رہا ہوں
سلگتی دھوپ کا موسم
بسائے آتما میں
وقت کی لمبی ڈگر پر
ٹھوکروں کی رہنمائی میں چلا جاتا ہوں
رستے میں کہیں جو چھوڑ آیا تھا
اسی برگد کا سایہ ڈھونڈتا ہوں!!

ش ک نظام

چاند سا پیار

جانے کتنے لمحے بیتے
جانے کتنے سال ہوئے
تم سے بچھڑے
جانے کتنے
سمجھوتوں کے داغ لگے ہیں
روح پہ میری!
جانے کیا کیا سوچا میں نے
کھویا، پایا/ کھویا میں نے
زخموں کے جنگل پر لیکن
آج
ابھی تک ہریالی ہے
تم نے ٹھیک کہا تھا
اس دن
'چاند' چاند سا ہی ہوتا ہے
اور نہیں بڑھنے پاتا تو
دھیرے دھیرے
خود ہی
گھٹنے لگ جاتا ہے

عبد الاحد ساز

اے دیارِ دلی!

اے دیارِ شوق ، اے ذوقِ نظر کے خلد زار
آج آیا ہوں تری گلیوں میں میں دیوانہ وار
میں ، کہ تیری ارضِ کہنہ ، گو نہیں میرا وطن
میرے ورثے میں نہیں گو تیرا تہذیبی شعار
میرا سرمایہ نہیں گو صحبتِ علم و ادب
میں کہ تاجر پیشہ و رہنِ معاش و روزگار
ہاں اب وجد سے ملا ہے پر جو ذوقِ شاعری
ہے اسی کی راہ سے تجھ سے تعلق استوار
دفن وہ گوہر تری خاکِ صدف باطن میں ہیں
تاب سے جن کی خزف ریزے ہیں میرے آشکار
وہ خیاباں ہو ترا ، یا گلستانِ لکھنؤ
روزنوں تک میرے آتی ہے نسیمِ مشکبار
سامنے منظر ہیں تیری عظمتِ پارینہ کے
"یہ عمارات و مقابر ، یہ فصیلیں ، یہ حصار"
سنگ میں حل ہوگئی ہے نرمئ ذوقِ جمال
یا مشکّل ہے نشاطِ دید و کربِ انتظار
تیرے ویرانوں کی خاموشی میں وہ سوزِ کلام
ہم نوائی کو ہے جس کی اب بھی دنیا بے قرار
کوئی گم گشتہ صدا سی ہے فضا میں مضطرب
یا غمِ رفتہ میں نالہ زن دلِ لیل و نہار
گنبد و مینار ساکت شب میں جوں دستِ دعا
آسماں سے وقت کے بھولے ہوئے قول و قرار
جب تری گلیوں میں آوارہ پھرائیں دیر تک
ساتھ سا چلنے لگا میرے ترا عہدِ بہار
گونج اٹھے خامشی میں شب کی نغماتِ جنوں
سیم پیکر مطربوں نے جھوم کر چھیڑا ستار
ہوگئی آراستہ شعر و سخن کی انجمن
بندشِ الفاظ کے گلشن ، معانی کی بہار
کیف میں ناز و حیا کے گم کہیں مستِ خرام
کالے برقعوں میں نظر آئے پری چہرہ نگار
لوٹ آئیں کوچہ در کوچہ پرانی رونقیں
خوش کلامی ، شوخیاں ، آداب ، حسنِ روزگار
دیر تک کھنچتا رہا آنکھوں میں نادیدہ سماں
دید کو رہتی تھی جس کی چشمِ شاعر بے قرار
سر زمیں تھی یہ کبھی گہوارۂ تہذیبِ حسن
جس کے شاہد ہیں ترے دامن پہ یہ نقش و نگار
تھے انہی کوچوں میں ساکن میرؔ و غالبؔ ، داغؔ و ذوقؔ
روح سے جن کی مرے انفاسِ فن ہیں مستعار
آہ! گو اِن میں وہ اگلی رونقیں باقی نہیں
دل ہوا ہوا جاتا ہے دلی! تیری گلیوں پر نثار

☆☆☆

اورنگ آباد ، دکن

ایلوؔرا کے پیکر ، اجنتؔا کے عکس
ابد کی خموشی ، ازل کی ہنسی
کہستاں کے سینے میں سوزِ حیات
محبت ، عبادت ، جنوں ، آگہی
جمالِ خیال و جلالِ کمال
یمِ فکر و فن ، موجۂ زندگی
دکن - اس کی تاریخ عظمت ، شکوہ
خم و پیچ ، نیرنگیاں ، زندگی
دکھاتی ہوئی وقت کے نقشِ پا

رہِ تغلق و خلجی و آصفی
مقابر ہوں ، روضے ہوں یا خانقاہ
شکستہ محل یا پرانی گلی
کوئی گمشدہ ساز چھیڑے ہوئے
عجب بازگشت آفریں خامشی
جہاں سوگیا آکے اورنگ زیب
سہانی خنک چھاؤں میں خلدؔ کی
جہاں جگمگایا سخن کا سراجؔ
جہاں سے ولیؔ کو ولایت ملی
پڑے حسنِ شیراز(۱) جس پیش ماند
دکن کی و سنوری ہوئی سانوری(۲)
حسیں سلسلے وادی و کوہ کے
مناظر میں قدرت کی جادو گری
سجل ناک نقشے جواں قامتیں
سلونی حیا ، سانولی دلبری
رواداریاں ، نرم لہجے ، خلوص
قدیمانہ اطوارِ شائستگی
اثر سے حکایاتِ پارینہ کے
فضا میں پراسرار سی نغمگی
دکن اور تاریخ و تہذیبِ فن
مقامات و آثار کی دلکشی
اور ان سب سے کرتی ہوئی کسبِ حسن
سکندر علی وجدؔ کی شاعری

بصد اشتیاق و بصد اعتقاد
مجھے کھینچ لائی ہے اورنگ آباد

☆☆☆

(۱)حسن شیراز: فارسی (۲)دکن کی سانوری: اردو

فاضل جمیلی

درختوں کے لیے ایک نظم

اے درختو! تمھیں جب کاٹ دیا جائے گا
اور تم سوکھ کے لکڑی میں بدل جاؤ گے
ایسے عالم بہت پیش کشیں ہوں گی تمھیں
تم مگر اپنی روایت سے نہ پھرنا ہرگز

شاہ کی کرسی میں ڈھلنے سے کہیں بہتر ہے
کسی فٹ پاتھ کے ہوٹل کا وہ ٹوٹا ہوا تختہ بننا
میلے کپڑے میں سہی
لوگ محبت سے جہاں بیٹھتے ہیں

کسی بندوق کا دستہ بھی نہیں ہونا تمھیں
چاقو چھریوں کو خدمات نہ اپنی دینا
ایسے دروازے کی چوکھٹ بھی نہ بننا ہرگز
جو محبت بھری دستک پہ کبھی کھل نہ سکے

اے درختو! تمھیں جب کاٹ دیا جائے گا

اور تم سوکھ کے لکڑی میں بدل جاؤ گے
کوئی بیساکھی بنائے تو سہارا دینا
اور کشتی کے لیے اتنی محبت سے تم آگے بڑھنا
کہ سمندر کی فراخی بھی بہت کم پڑ جائے

اپنے پتوار مرے بازوؤں جیسے رکھنا
جو کسی اور کی طاقت کے سوا زندہ ہیں
مری دنیا کہ ابھی واقفِ الفت ہی نہیں
مرے بازو بھی محبت کے سوا زندہ ہیں

راشد انور راشد

گزارش

بہت دنوں سے کوئی نظم ہی نہیں لکھی
نہ کوئی شعر قلم سے وجود میں آیا
یہاں تلک کہ تخیل بھی ساتھ چھوڑ گیا
ہزار چاہا کہ کچھ تو مری گرفت میں آئے
مگر نہ کچھ بھی تصور کی زد میں آپایا
ہزار سوچا کہ جو کچھ نظر کے سامنے ہے
اسی کو کیوں نہ قلمبند کرلیا جائے
مگر شعور کے قابو میں کب ہے ذہن و دل
نگہہ میں چھائی ہوئی ہے عجب سی بے کیفی
طرح طرح کے مسائل ہیں سر اٹھائے ہوئے
سکوں محال ہے ، ہر پل دماغ الجھا ہوا
کوئی بھی سمت نہیں جس طرف اجالا ہو
جدھر بھی جائے نظر ، تیرگی کا ماتم ہے
بہت دنوں سے اگر کچھ نہیں لکھا میں نے
تو اس میں دنیا کا نقصان کچھ نہیں ہوگا
مگر میں روز کئی قسطوں میں مروں گا اے دوست
اگر تو میرے لیے ہے ذرا بھی سنجیدہ
مرے لیے بھی کہیں کچھ جگہ ہے دل میں ترے
تو ایسے دردِ محبت سے اب نواز مجھے
کہ جس کی ٹھیس ، تڑپ اور کسک کبھی نہ ہو کم
تبھی تو نظم کے سانچے میں درد ابھرے گا
تبھی بہار کا موسم پلٹ کے آئے گا
تبھی تو دل جا ہراک زخم گنگنائے گا

راشد انور راشد

تیری آواز

راہ میں چلتے ہوئے ، بھیڑ سے اکتائے ہوئے
تیری آواز سنی میں نے کئی سال کے بعد
سوچ کر ذہن پریشان رہا دیر تلک
شہر کے شور ، خرافات کے ہنگاموں میں
تیری آواز جو آئی تو کہاں سے آئی
پھر کسی وہم کے نرغے میں تو میں آ نہ گیا
تیری آواز کا سرگم کہیں دھوکہ تو نہیں
دیر تک ذہن سوالات میں الجھا ہی رہا
کوئی امیّد نہ جس بات کی تھی کیسے ہوئی
کیسے پتھرائی ہوئی آنکھوں میں آنسو آئے
کیسے پھر بھولا ہوا قصہ تجھے یاد آیا
راہ میں چلتے ہوئے ، بھیڑ سے اکتائے ہوئے
تیری آواز سنی میں نے کئی سال کے بعد
تیری آواز کا دھوکہ ہے اگر وہم مرا
مجھ کو رہنا ہے اسی وہم کی سرشاری میں
تیری آواز کے دھوکے سے یہ محسوس ہوا
کوئی خواہش ہو ، تمنا ہو ، بھٹکتی ہے ضرور
اب بھی سینے میں کوئی چیز دھڑکتی ہے ضرور

فرحان حنیف

جمالیاتی حس کا المیہ

ہر حسین شئے
میری کمزوری ہے
بدصورتی سے نفرت
میرا مزاج--!
شاید اسی لیے مجھے
آئینوں سے بھی نفرت ہے

عزت

اپنے حالات سے
میں اس طرح جوجھ رہا ہوں
جیسے
کوئی اپنے پیروں سے بھی
لمبا، چوڑی موری کا پاجامہ پہنے
دوڑنے کی کوشش کرتا ہے
اور پاجامے کے میلے پائینچے
اس کے پیروں میں پھنس پھنس کر
بار بار اسے گرادیتے ہیں

تضاد

جب
غریبی کی دھوپ
عالیشان فلیٹوں میں
گھسنے کی کوشش کرتی ہے تو
کھڑکیوں پر لگے
وسائل کے پردے کھینچ دیئے جاتے ہیں

پرویز عارض

ہم نے بھی شبِ غم کاٹی ہے ......

آنکھوں میں شرارے یوں ہی نہیں، چہرے پہ سیاہی یوں ہی نہیں
جلتے ہوئے آنسو یوں ہی نہیں ، گفتار میں تلخی ہوں ہی نہیں
دنیا سے گریزاں یوں ہی نہیں اور کرب شناسی یوں ہی نہیں

ہم نے بھی شبِ غم کاٹی ہے ، ہم پہ بھی قیامت گزری ہے

طوفاں کی تباہی دیکھی ہے ، موجوں کو اترتے دیکھا ہے
صحرا کی سلگتی راہوں سے خوابوں کو گزرتے دیکھا ہے
رشتوں کو سنورتے دیکھا ہے ، رشتوں کو بکھرتے دیکھا ہے

ہم نے بھی شبِ غم کاٹی ہے ، ہم پہ بھی قیامت گزری ہے

امید کے گلشن میں ہے خزاں ، ویران سی دل کی محفل ہے
افسردہ فضائیں چاروں طرف اور سرد ہوا بھی قاتل ہے
ہر سمت ستمگر لہریں ہیں اور کھوئی ہوئی ہر منزل ہے

ہم نے بھی شبِ گم کاٹی ہے ، ہم پر بھی قیامت گزری ہے

اپنوں نے سیاست کی ہے یہاں ، اخلاص و وفا کی لاشوں پر
چاہت کے تقاضے کھو ہی گئے وعدوں کی کنٹیلی راہوں پر
افسوس نہیں ہے اب ہم کو تنہائی کی لمبی راتوں پر

ہم نے بھی شبِ غم کاٹی ہے ، ہم پہ قیامت گزری ہے

ماضی کی سنہری یادوں نے راتوں کو جگایا ہے اکثر
دشمن کی تو باتیں جانے دیں یاروں نے رُلایا ہے اکثر
اس رنگ بدلتی دنیا نے نظروں سے گرایا ہے اکثر

ہم نے بھی شبِ گم کاٹی ہے ، ہم پہ بھی قیامت گزری ہے

کلاسک

اردو شعر و ادب کی تاریخ میں شفیقؔ کی شہرت ایک عمدہ شاعر کی بہ نسبت ایک تذکرہ نگار کی وجہ سے زیادہ ہے۔ شفیقؔ کا یہ کمال ہے کہ صرف 18 ؍سال کی عمر میں انھوں نے 213 ؍ریختہ گو شعرا کا تذکرہ ''چمنستان شعراء'' کے نام سے تحریر کیا جس میں نہایت تحقیق کے ساتھ شعراء کے حالات جمع کیے اور ان کا منتخب کلام ترتیب دیا۔ یہ تذکرہ اردو ادب میں ایک نہایت وقیع اضافہ ہے اور ہمیں اس عہد کے بے شمار نامور اور گمنام شعراء سے متعارف کرواتا ہے۔ ''دکنی تذکروں میں حسنِ ترتیب' جامعیت اور ادبی معیار کے لحاظ سے ''چمنستان شعراء'' کا نام سرِ فہرست ہے''۔

______ڈاکٹر حنیف نقوی

اسلم مرزا

شفیق اورنگ آبادی: حیات اور ادبی کارنامے

(ایک سرسری جائزہ)

اٹھارہویں صدی عیسوی کے پُر آشوب دور میں بھی اورنگ آباد (خجستہ بنیاد) ایک اہم دینی، تمدنی ،ثقافتی اور علمی مرکز کی حیثیت سے ہندوستان گیر شہرت رکھتا تھا۔ یہ دکن کے صوبیداروں کا مستقر تھا۔ جب میر قمر الدین خان نظام الملک آصف جاہ دکن کی نظامت پر فائز ہوئے تو ان کے افراد خاندان اور تورانی امراء کی ایک بڑی تعداد نے اورنگ آباد کو اپنی رہائش کے لیے پسند کیا۔ آصف جاہ اول نہ صرف یہ کہ مدبر سیاست داں اور اہل سیف تھے بلکہ وہ ایک اچھے شاعر بھی تھے۔ وہ آصف اور شاکر تخلص تھے۔ تذکروں سے پتہ چلتا ہے کہ انھیں مرزا عبدالقادر بیدلؔ کی شاگردی کا شرف حاصل تھا۔

اس عہد میں ولیؔ اورنگ آبادی کی شعری روایات کی پاسداری کے فرائض شاہ سراج اورنگ آبادی اور میرزا داؤدؔ انجام دے رہے تھے جنھوں نے ''اردو زبان کو کچھ اور زیادہ صاف کر دیا نیز طرزِ بیان میں جدت اور اظہارِ خیال میں ندرت'' پیدا کی۔ ۱ سراجؔ اور داؤدؔ کے ساتھ ساتھ میر غلام علی آزاد بلگرامیؔ، عارف الدین خاں عاجزؔ، خواجہ خاں حمیدؔ، مرزا افضل بیگ قاقشالؔ، عبدالوہاب افتخارؔ، اسد علی خان تمناؔ، جمال اللہ عشقؔ، محمد عطا ضیاءؔ، فضائل بیگ الہامؔ، لائیک چند بہارؔ، لالہ جے کشن بیجانؔ، ضیاء الدین پروانہ، محمد رضا بیگ رضاؔ، شیخ غلام قادری ساميؔ، میرزا رضا بیگ قمرؔ، شاہ قاسم میر افضل کمترؔ، میرزا محمد خاں نثار، خواجہ عنایت اللہ فتوتؔ، نصیرؔ وغیرہ فارسی اور ریختہ میں دادِ سخن دے رہے تھے۔ کچھ عرصے کے لیے عبدالولی عزلتؔ، سورتیؔ، اور میاں نورالعین واقفؔ بھی اورنگ آباد آئے تھے۔ ان استادانِ فن شعر کی صفوں میں شفیقؔ بھی ''داخل ہو کر ان کے پہلو بہ پہلو بیٹھے اور ان بزرگوں کے فیض نے نابینا کو آنکھ والا اور زنگی کو کافور بنا دیا۔ ۲

شفیقؔ کے اجداد لاہوری کھتری تھے۔ ۱۶۵۸ء میں جب اورنگ زیب نے سموگڈھ کے مقام پر ایک فیصلہ کن جنگ میں داراشکوہ کو شکست دی اور اپنے دوسرے بھائیوں کا بھی قلع قمع کر دیا تو اُس نے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ اس وقت خواجہ عابد خان سمرقندی کو صدرِ کُل کے عہدہ پر مامور کیا۔ چھے سال بعد خواجہ عابد خان کو اُس نے اجمیر اور پھر ملتان کا صوبیدار مقرر کیا اور قلیج خان کے خطاب سے نوازا۔ قیاس اغلب ہے کہ شفیقؔ کے پردادا،

لالہ بال کشن اسی زمانے میں خواجہ عابد قلیچ خان سے متوسل ہوئے ہوں گے۔خواجہ عابد قلیچ خان نے مختلف علاقوں میں اپنی قابلیت کے جوہر دکھائے اس لیے ۱۶۸۶ء میں اورنگ زیب نے انھیں ظفرآباد (بیدر) کا صوبیدار مقرر کردیا۔اس طرح لالہ بال کشن بھی خواجہ عابد قلیچ خان کے ساتھ دکن آ گئے۔قمرالدین خان نظام الملک آصف جاہ انہی خواجہ عابد قلیچ خان کے پوتے تھے۔ ۳؎

لالہ بال کشن کی اولاد میں ایک لالہ بھوانی داس تھے جو خواجہ عابد خان کے صاحبزادے غازی الدین خان بہادر فیروز جنگ کی ملازمت میں اکاونٹنٹ کے عہدے پر فائز تھے۔بھوانی داس کے ایک بیٹے لالہ منسارام تھے جن کی پیدائش اورنگ آباد میں ہوئی۔لالہ منسارام نہایت کم عمری میں یتیم ہوگئے اس کے باوجود انھوں نے اپنی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا اور قلیل عرصے میں تمام مروجہ علوم میں استعداد پیدا کی۔غازی الدین خان فیروز جنگ کے صاحبزادے میر قمرالدین خان نظام الملک آصف جاہ نے لالہ منسارام کو اپنی ملازمت میں لے کر صوبہ جات دکن کی پیشکاری کی خدمات پر مامور کیا۔

لالہ منسارام بہترین انشاء نگار تھے۔انھیں تاریخ سے بھی دلچسپی تھی۔ہمیں ان کی دو تصنیفات کی اطلاع ملتی ہے۔پہلی ’’ماثر نظامی‘‘ جسے آصف جاہی عہد کی مستند تاریخ سمجھا جاتا ہے جس میں انھوں نے وہ واقعات قلمبند کیے ہیں جن کے وہ چشم دید گواہ تھے یا پھر معتبر اور ثقہ لوگوں کے بیانات سے استفادہ کیا ہے۔ان کی دوسری کتاب ’’دربارِ آصفی‘‘ ہے جس میں نواب آصف جاہ کے دور حکومت کے اصول وضوابط درج کیے گئے ہیں۔

اورنگ آباد کے محلّہ دیوڑھی بازار (مسجد لوٹا کارنجہ سے مغربی سمت) جہاں اب کلاسک اپارٹمنٹ کی تین منزلہ عمارت کھڑی ہے وہاں لالہ منسارام کی حویلی تھی۔اسی حویلی میں مورخہ ۲ رصفر ۱۱۵۸ھ (مطابق ۱۷۴۵ء) کو لچھمی نرائن کی ولادت ہوئی جو شفیقؔ اور صاحبؔ اورنگ آبادی کے نام سے مشہور ہوئے۔اس طرح وہ ایک علمی اور تعلیم یافتہ گھرانے میں پیدا ہوئے۔شفیقؔ کے ایک حقیقی بھائی لالہ روپ نرائن ۴ رجمادی الاول ۱۱۹۲ھ (۱۷۷۸ء) کو اورنگ آباد ہی میں پیدا ہوئے۔عبدالجبار ملکاپوری کے مطابق نشوونما کے بعد شہر میں علماء وفضلاء کی صحبت سے تعلیم پائی۔فارسی وعربی میں لیاقت پیدا کی۔حضرت آزادؔ اور میر ذکاؔ سے اصلاح لی۔لالہ روپ نرائن کا تخلص ذہینؔ تھا۔ ۴؎

لالہ منسارام نے اپنے بیٹے لچھمی نرائن کو ۱۱ سال کی عمر میں شہر کے ایک مشہور استاذ مُلّا شیخ عبدالقادر کے مدرسے میں داخل کردیا جہاں لچھمی نرائن نے علوم متداولہ یعنی عربی، فارسی، صرف ونحو اور انشاء وغیرہ میں سند حاصل کی۔چونکہ شعر وشاعری سے دلی رغبت تھی اس لیے تقریباً ۱۲ سال کی عمر ہی میں لچھمی نرائن نے فارسی اور ریختہ میں شاعری کی ابتداء کی۔پہلے میر عبدالقادر مہربانؔ سے شاعری میں اصلاح لی اور پھر غلام علی آزادؔ بلگرامی سے تلمذ حاصل کیا۔غلام علی آزاد نے ریختہ کی شاعری کے لیے ان کا تخلص صاحبؔ قرار دیا۔شفیقؔ کا اپنا بیان ہے کہ جب وہ اٹھارہ سال کی عمر کو پہنچے تو معلوم ہوا کہ میر محمد سمیع، فارسی کے مشہور شاعر گزرے، ان کا تخلص بھی صاحبؔ تھا۔اس وقت میر غلام علی آزادؔ نے کہا ٹھیک ہے اور شفیقؔ تخلص عنایت فرمایا۔’’چونکہ ریختہ میں ان کا تخلص صاحبؔ مشہور ہو چکا تھا اس لیے ریختہ میں صاحبؔ تخلص برقرار رکھا اور فارسی میں شفیقؔ‘‘۔ ۵؎

شفیقؔ اورنگ آبادی ایک ہمہ جہت شخصیت تھے۔ جہاں فارسی اور اردو شاعری سے انھیں ازلی مناسبت تھی وہیں نثر نگاری میں بھی انھوں نے کمال پیدا کیا اور تذکرہ نگاری، تاریخ نویسی اور لغت کی تدوین وتسوید میں گہری دلچسپی لی۔ انھوں نے علم رمل میں مہارت حاصل کی نیز علم قافیہ اور اسرار قاسمی عجائبیات وغرائبیات کی تحصیل کی۔ [6]

اٹھارہ سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے شفیقؔ نے شاعری کا بھرپور ذخیرہ کرلیا اور اپنا فارسی نیز اردو کا دیوان ترتیب دیا۔ کتب خانہ آصفیہ (ادارۂ تحقیقات علوم مشرقی) کے اسٹاک رجسٹر میں شفیقؔ کے فارسی دیوان کی نشاندہی کی گئی ہے۔ [7] ان کے ''دیوانِ صاحب'' کا حوالہ انجمن اردو پاکستان کے مخطوطات کی فہرست میں ملتا ہے۔ [8] ۔ شاید اب تک یہ دونوں دیوان طبع نہیں ہوئے۔

مولوی عبدالجبار ملکاپوری نے یہ ضرور لکھا کہ انھوں نے ''اکثر تذکروں میں شفیقؔ کے چیدہ چیدہ اشعار دیکھے ہیں [9] لیکن ملکاپوری نے اپنے تذکرے میں جو اشعار انتخاب کر کے شامل کیے ہیں وہ تمام فارسی کے ہیں۔ راقم الحروف نے سوائے ''چمنستان شعراء'' کے کسی اور تذکرے میں شفیقؔ کے اردو اشعار اور غزلیں نہیں دیکھیں۔ شفیقؔ کے ہم عصر عنایت الہ فتوتؔ کے تذکرہ ''ریاضِ حسنیٰ'' یا اسد علی خان تمناؔ کے تذکرے ''گل عجائب'' میں اور میرزا علی لطفؔ کے ''تذکرہ گلشن ہند'' میں نہ شفیق کا ترجمہ شامل ہے نہ اشعار۔ چونکہ شفیق کے اردو دیوان کی اشاعت کی کوئی اطلاع نہیں ہے اس لیے ہمیں ان اشعار سے ہی استفادہ کرنا پڑتا ہے جنھیں شفیقؔ نے خود اپنے ''تذکرہ چمنستان شعراء'' میں انتخاب کیا۔

شفیقؔ کی شاعری ان کے عہد کی آئینہ دار ہے۔ شاہ سراجؔ اور میرزا داؤد اور دیگر ہم عصر شعراء کی طرح انھوں نے بھی اردو زبان کو سنوارنے اور نکھارنے میں کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ انھوں نے مترنم بحروں میں حسن وعشق کے فلسفہ کیساتھ محبوب کے تغافل، ستم شعاری، وعدہ خلافی وغیرہ کو موضوع بنایا۔ ان کی شاعری میں واردات قلب کے اظہار کے ساتھ ساتھ عشق کی شکست وریخت، عاشق کی بیچارگی اور غم ہجراں کا شکوہ موجود ہے۔ شفیقؔ کے اظہارِ خیال اور اسلوب میں ہمیں رچاؤ اور گھلاوٹ کا احساس ہوتا ہے۔ شفیقؔ کے پاس ایک ایسی سادگی اور بے ساختگی ہے جو سامع کو اپنی طرف متوجہ اور فوراً متاثر کرتی ہے۔ انھوں نے خیال بندی، صناعی اور ادق لفظیات کو برتنے سے احتراز کیا اس لیے ان کی شاعری میں ندرت، حلاوت اور طرز اظہار کی پختگی کا احساس ہوتا ہے، مثلاً یہ اشعار ملاحظہ کیجیے:

کس طرح بیمار دل کی ہم شفا چاہیں گے آج
پڑ گئی ہے اس کی آنکھوں سے تو میخانے میں دھوم

کوئی گریباں چاک، بیدل کاں بسے گا صاحبا
کوہ میں فرہاد و مجنوں کی ہے ویرانے میں دھوم

شمع پر پروانہ جل کر راکھ ہوا
عاشقی کا نام روشن کردیا

ہمیں کنج قفس میں چھوڑ کر صیاد جاتا ہے
خدا جانے کہ ہم سے خوش ہے یا ناشاد جاتا ہے

ان وفاؤں کا یہ بدلہ ہے جفا یا قسمت
ہم چلے تم کو اب کر کے دعا یا قسمت

ہم ترستے ہی مریں لوٹے مزہ یوں پرویز
کوہ کن چیز کے سر کو یہ کہا یا قسمت

مہر اور لطف وتسلی ہے رقیبو کے نصیب
ہم پہ یہ جور و ستم اور بلا یا قسمت

بہار آئی جنوں نے سر اٹھایا ہے خدا حافظ
نسیم صبح نے دل کو ستایا ہے خدا حافظ

بہار آنے سے اب کے باغ میں اے ناصح مشفق
دیوانے دل نے کچھ سن گن تو پایا ہے خدا حافظ

ہزار افسوس اے صاحبؔ کہ اس کے طاقِ ابرو پر
یہ دل کا شیشہ تو نے یوں رکھایا ہے خدا حافظ

قتل پر کس کے چلا ہے یہ ستم گار کے بس
آستینوں کو چڑھا کھینچ کے تلوار کے بس

آخری دم ہے ٹک ایک دیکھ بھلا اے قاتل
بے طرح آج تڑپتا ہے یہ بیمار کے بس

ہر جہت بادِ صبا کے یہ قدم کا فیض ہے
مرقد بلبل پہ گل جو یوں چراغاں ہوگئے

جب کھلے بندوں گیا وہ رسمسا تو باغ میں
تیری ایسی طرح پر سب گل بھی خنداں ہوگئے

اگر وہ شعلہ خو ٹک منہ سے پردہ دور کردیوے
پتنگے جل مریں اور شمع کو بے نور کردیوے

اب شفیقؔ کی ایک قطعہ بند غزل کے چند اشعار [10]

پنجرے میں ہمیں نہ آنا تھا
کیا کریں یاں بھی آب و دانا تھا

اس کی جا کر گلی میں کھویا وقرؔ
اب میں جانا کہ واں نہ جانا تھا

ایک دن وہ نظر پڑا صاحبؔ
جس لیے شب کو تلملانا تھا

تب کہا چشم کو میں اے کم بخت
وصل میں اشک یہ بہانا تھا

اس کی تصویر آئی آنکھوں میں
پاؤں اس کے مجھے دھلانا تھا

شفیقؔ کی پہلی پسند حالانکہ غزل تھی لیکن انھوں نے قصیدہ، آشوب شہر، مثنوی، مخمس اور قطعات تاریخ وغیرہ میں بھی اپنے شاعرانہ کمال کے جوہر دکھائے ہیں جس سے ان کی قادرالکلامی کا اندازہ ہوتا ہے۔

مرزا رفیع سوداؔ نے نواب عماد الملک آصف جاہ نظام الملک بہادر کی مدح میں ۱۲۰/اشعار پر مشتمل قصیدہ لکھا۔ سوداؔ کے اس قصیدے کے چند اشعار یہ ہیں:

فجر ہوتے جو گئی آج مری آنکھ جھپک
دی وہیں آ کے خوشی نے درِ دل پر دستک

پوچھا میں کون ہے؟ بولی کہ وہ میں ہوں غافل
نہ لگے شوق میں جس کے کبھو شائق کی پلک

ہے خوشی نام مرا ہوں میں عزیز دلہا
زندگانی کی حلاوت ہے جہاں میں مجھ تک

کھول آغوشِ دل اور لے مجھے جلدی ناداں
پھر خدا جانے یہ دن کب تجھے دکھلائے فلک

سن کے یہ مژدۂ جاں بخش جو میں کھولی آنکھ
اشعۂ نور کی سی مجھ کو نظر آئی جھلک

شفیقؔ کو یہ قصیدۂ اس کی بحر اور قافیہ بہت پسند آئے تو شفیقؔ نے نعت رسول عربیؐ اور واقعۂ معراج نبویؐ لکھنے کے لیے یہی قوافی اور بحر کو استعمال کرتے ہوئے ۱۲۴/اشعار کا قصیدہ لکھا۔ اس کے مطالعے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہندو شاعر بھی نعت میں کتنے کامیاب شعر لکھ سکتا ہے[11]:

قصیدے کا آغاز:

شام کے وقت میں کل گرد سے دامن کو جھٹک
صحن میں گھر کے ٹہلتا تھا تفکر میں سڑک

گاہ ایوان سے کرتا تھا خیابان کی سیر
گہہ خیابان سے آتا تھا میں ایوان تلک

رات کا منظر:

رات کالی میں ستارے ہیں رہے ایسے چٹک
یا کہ ہے سوختہ کاغذ میں یہ اخگر کی چمک

یا کوئی حور نے مستی ستی بہکے بہکے
توڑ کر ہار گلے اپنے سے موتی یک یک

معراج کا بیان:

اللہ اللہ رے وہ رات مبارک پُرنور
بہرہ ور جس تھے سب آدمی اور جن وملک

جس گھڑی مسجد اقصیٰ سے سواری گزری
جانبِ عالم بالا یہ کمال وعزم وتزک

چرخ اول نے وہیں چاند کے دونوں ٹکڑے
جو کہ انگشتِ شہادت نے کیے تھے دوفک

چشم الطاف نے حضرتؐ کی اسے نور دیا
پھر بدستور یہ سرچشمہ ہوا صاف وخنک

مثلِ سابق کے ہوا گرچہ قمر نور فشاں
لیکن اس کی نہ گئی سینے سے اس ڈر کی کسک

عرشِ اعظم سے پرے تہج رہا ووہیں براق
صدر تک پہنچ کے جبریل ہے ووہیں ٹھٹک

الغرض ذات مقدس نے یہ سر کرکے جہات
چلہ کش جا کے بالآخر ہوئے قوسین تلک

صاحبؔ اب ضبط زباں کرکے یہاں ہے مشکل
راز کی بات کو اس طور سے بے باک نہ بک

اختتامیہ:

خاتمہ ہووے بخیر اب مرا اے ختمِ رُسلؐ
صدقے اس شخص کے جس کو تو کہا ہے لحمک

مجھ کو کیا منہ جو درود اب میں زباں پر لاؤں
بھیجتا تجھ پہ ہے صلوٰۃ خدا اور ملک

مقطع:

صاحبؔ اب تیرے تئیں اتنی کہاں ہے قدرت
نعت میں ذاتِ مبارک کی کہے حرف تنک

شفیقؔ کی غزلوں اور قصیدوں کی طرح ان کی مثنویاں بھی ایک مدتِ دراز تک نہایت مقبول رہیں۔ مثنوی ''تصویرِ جاناں''، مثنوی ''پیکرِ حسن''، مثنوی ''میخانۂ عاشق'' (ساقی نامہ) اور مثنوی ''زر اور گھونگچی'' بہت مشہور ہیں۔ ''مثنوی تصویرِ جاناں'' کی تخلیق کا پس منظر دیکھتے چلیں۔

میر نظام علی خاں آصف جاہ ثانی نے ۱۷۶۸ء میں نظام دکن کا پایۂ تخت اورنگ آباد سے حیدر آباد منتقل کر دیا تھا اور اس طرح اورنگ آباد کی تمام رونقیں بجھ گئیں۔ ارباب سیاست نیز امیر امراء کے ساتھ اورنگ آباد کے شعراء کی ایک بڑی تعداد جن میں شفیقؔ، اسدعلی خان تمناؔ، صمصام الملک صارمؔ، محمد علی شوقؔ، مرزا جمال اللہ عشقؔ، شیخ کریم بخش سالمؔ، اور حسین علی خاں ایماؔ وغیرہ حیدر آباد جا کر بس گئے[۱۲]۔ ان میں سے چند شعراء ارسطو جاہ کے اور کچھ نواب میر نظام علی خاں آصف جاہ ثانی کے بڑے فرزند میر احمد خاں عالی جاہ کے درباروں سے متوسل ہو گئے۔ ارسطو جاہ اور عالی جاہ

دونوں نہایت علم دوست اور فنونِ لطیفہ کے قدر دان تھے۔ شفیقؔ میر احمد خاں عالی جاہ کے دربار سے وابستہ رہے۔
نواب عالی جاہ کے محل میں قدیم کتابوں اور تصویروں کا ایک بڑا خزانہ تھا۔ انھوں نے شفیقؔ سے خواہش کی تھی کہ تمام تصویروں کے بارے میں اشعار اور نظمیں لکھیں۔ چنانچہ ان کے دیوان خانے کی ہر تصویر کے ساتھ شفیقؔ کا کلام بھی آویزاں کیا گیا تھا۔ [۱۳] اس طرح شفیقؔ نے ایک طویل مثنوی کہی جس میں اشعار کی تعداد ۲۸۷ ہے۔ اس مثنوی کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

سنو اے حسن کے تصویر سازو　　سنو اے عشق کے جادو طرازو
کہ فن عاشقی میں ہے یگانہ　　ٹک اک دل دے کے صاحبؔ کا فسانہ

☆

بہانہ میں اس کے یہ ہوش وخرد سے　　ارے ساقی شراب ناب کو دے
کہ دیکھوں جام میں ''تصویر جاناں''　　یہاں تک مست کر اور مجھ کو حیراں

ڈاکٹر لئیق صلاح جنھوں نے اس مثنوی کا بغور مطالعہ کیا ہے لکھتی ہیں کہ اس مثنوی میں شفیقؔ نے محاکات نگاری، جذبات نگاری، حسن نگاری، سنگار وغیرہ کی پیش کش نہایت عمدگی سے کی ہے۔ [۱۴] جیسے:

محاکات نگاری:

کہوں کیا کس قدر تاریک تھی رات　　جہاں اوپر پڑی تھی آ کے ظلمات
جہاں سنسان سارا ہو رہا تھا　　سب عالم اپنی سدھ بدھ کھو رہا تھا
نہیں آتی تھی تب آواز گھڑیال　　نہ تھا معلوم گھڑیالی کا احوال
تھکا چلنے سے خورشید جہاں گرد　　ہوا تھا آسماں پر ماہ بھی سرد

جذبات نگاری:

غرض تنہا میں اپنے گھر کے اندر　　تڑپتا سخت تھا بسر کے اوپر
کوئی مجھ پاس تب محرم نہیں تھا　　بجز دل کے کوئی ہمدم نہیں تھا

حسن کا بیان:

نزاکت بیچ جیوں نازک پہیلی　　پری لونڈی، تھی حور اس کی سہیلی
کہاں شیریں میں یہ شیریں ادائی　　کہاں لیلیٰ میں ایسی دلربائی
کہاں چندر بدن میں یہ صباحت　　کہاں ہے ہیر میں ایسی ملاحت
زلیخا میں کہاں یہ حسن یہ ناز　　کہاں سلمٰی کے تئیں یہ طرز وانداز
چھبیلی، چل بلی، چنچل پری ہے　　رنگیلی، رس میں ڈوبی گن بھری ہے
سراپا کی کروں میں اس کی تعریف　　کہ نصف العیش ہے عشرت کی توصیف

شفیقؔ کی دوسری مثنوی ہے ''پیکرِحسن''۔اس مثنوی میں شفیقؔ نے جہاں حسن اور خوبصورتی وغیرہ کو بیان کیا ہے وہیں بناؤ سنگار کے متعلق بہت سی معلومات دی ہے۔اس مثنوی میں بارہ سنگار اور سولہ سنگار کی تفصیلات درج ہیں۔حسین عورتوں کے بالوں کی ملائمت' بالوں کا سلجھانا' کنگھی کا الجھنا' مانگ نکالنا' مختلف رنگ برنگے لباس اور ان کی تفصیلات کے ساتھ بڑی مہارت اور نزاکت کے ساتھ ان تمام زیورات کی تفصیلات پیش کی ہے جو اس عہد میں خواتین میں مقبول اور مستعمل تھے' جیسے مرزا بے پروہ' کرن پھول' نتھ' چاند' وغیرہ۔آج سے دوسو سال پہلے دکن کی تہذیبی اور ثقافتی زندگی کے شب وروز کا احاطہ کرنے والی یہ مثنوی اپنی رنگین بیانی سے سرسبز وشاداب ہے۔شفیقؔ نے اس مثنوی میں حسن کے جانچنے اور پرکھنے کے معیار متعین کرتے ہوئے بتلایا ہے کہ اعضائے جسمانی میں کون سا عضو کس رنگ کا ہونا چاہیے۔[۱۵] اس مثنوی میں نہایت خوبصورت تشبیہیں بھی ملتی ہیں' جیسے:۔

جھپک سے آنکھ پر مژگان پیدا گویا بیمار پر کرتے ہیں پنکھا
جھپکتی اس طرح مژگاں کہاں ہیں جہازِ حسن کے یہ بادباں ہیں

سراسر رمز اور ایما ہیں آنکھیں اشاروں میں بہت گویا ہیں آنکھیں
نہیں یہ چشم وابرو میں گیا بھول دھرے ہیں طاق میں دو نرگسی پھول

چھپے تھے ابر میں ایسے ستارے رہیں جیوں راکھ کے اندر انگارے

شفیقؔ نے ساقی نامہ بھی لکھا جس کا نام ''میخانہ عاشقی'' ہے۔حمد اور نعت کے بعد مثنوی کا آغاز کیا ہے اور مختلف عنوانات کے تحت الگ الگ مضامین پیش کیے ہیں[۱۶]۔اس مثنوی کا پہلا عنوان ہے ''سخن ہائے شیشہ''۔اس میں شیشے کا شراب سے خطاب نہایت دلچسپ ہے اور اس سے شفیقؔ کی قادرالکلامی کا علم ہوتا ہے:

سنا بزم مستوں میں میں کل کی رات کیا شیشہ نے مے سے قلقل میں بات
کہ کیوں ہے تجھے میری الفت سے ننگ تو ہے دخترِ رز میں ہوں فرزندِ سنگ
مرے باپ کا گھر ہے دیر وحرم کہ ہے کفر واسلام میں محترم
جواہر کہ میرے حقیقی ہیں عم بہت کچھ ہیں دنیا میں وہ محتشم
میں قالب ہوں اور تو مری جان ہے تعجب مجھے تجھ سے ہر آن ہے
کہ مجلس میں جس وقت آتی ہے تو مجھے چھوڑ پیالے میں جاتی ہے تو
ترے میں وفا کی تنک بو نہیں تجھے پاس اخلاص کی خو نہیں

شفیقؔ کی ایک مثنوی ''زر اور گھونگچی'' ایک بالکل نئے موضوع کا احاطہ کرتی ہے۔اس میں ''زر'' اور ''گھونگچی'' کا مکالمہ پیش کیا گیا ہے جو سراسر ناصحانہ انداز میں ہے اور کسی داستان کا منظوم ترجمہ معلوم ہوتا ہے۔اس مثنوی میں زر پرستوں کے وقار اور متکبرانہ احساسات کی ترجمانی اور گھونگچی کے روپ میں شرفاء کی خصوصیات کا اظہار کیا گیا ہے جو

بظاہر دھن دولت والے نہیں ہوتے لیکن ان کی شرافت اور عزتِ نفس ہی ان کی سب سے بڑی دولت ہوتی ہے۔[۱۷]

قطعاتِ تاریخ کہنے میں بھی شفیقؔ کو مہارت حاصل تھی۔ مرزا رفیع سوداؔ دہلوی اور میرزا آزادؔ بلگرامی کی وفات پر کہے گئے قطعات ریختہ میں کہے گئے دو نمونتاً یہاں ملاحظہ کیجیے:

(۱) لکھنؤ بیچ میرزائے رفیع
چوتھی رجب کو جان سے گزرے
جب کہہ یکتا گیا ہوئی تاریخ
ہائے سوداؔ جہان سے گزرے
۱۱۹۵ء

(۲) گزر گئے جب جہاں سے میر آزاد
ہوا مدفن جو خلد آباد روضہ
سند رحلت کی جب صاحب نے پوچھا
کہا دل سوسن آزاد روضہ
۱۲۰۰ھ

شفیقؔ کا ایک نامکمل ''شہر آشوب'' بھی ہے۔ اس بند میں طنز کی پرشور لہروں کے ساتھ ماضی سے ہمدردانہ ہم آہنگی کے جذبات کا وفور ہمیں متوجہ کرتا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

ایک دن دل نے کہا مجھ سے کہ صاحب سن ادھر — کیوں ریاست دن بدن ایسی ذلیل اور ہے بتر
اس دکن کے بیچ چھے صوبوں کے چھے تھے بادشاہ — عادل اور فیاض صاحب عزم اور صاحب ہنر
ان کی دولت میں مرفّع اور سبھی خوش حال تھے — کیا رعیت کیا سپاہی کیا امیر و نامور
آسماں وو ہی ہے وو ہی ہے زمیں خلقت ہے وہ — پھر ہوئی کس واسطے یہ زندگانی مختصر
شامتِ نیت ہے یا تدبیر میں ہے کچھ قصور — تب تو دشواری پڑی ہے ہر کسی کو اس قدر

رواجِ زمانہ کے مطابق شفیقؔ نے مخمس بھی لکھے ہیں[۱۸]۔ ایک مخمس احسان اللہ خان بیاںؔ کی غزل پر اور دوسرا مخمس حافظؔ شیرازی کی غزل پر تضمیناً کیا ہے۔ بیاںؔ کی غزل پر جو مخمس تضمین کہا ہے وہ یہ ہیں:

حسن تو ہر کہیں ہے جلوہ نما — پر ضروری ہے جستجو ہر جا
اب زلیخا کی چشم کر پیدا — جو کوئی ہووے مستعد پورا
یوسف اس کاروان سے نکلے

حافظ شیرازی کی غزل پر تضمین کی مخمس کا ایک بند:

جس وقت میرے سامنے آئی تیری تصویر — جز ذوق گرفتاری نہ سوجھی مجھے تدبیر
تسخیر کے کرنے میں نہ کی زلف نے تقصیر — از راہ نظر مرغ دلم گشت ہوا گیر
اے دیدہ نگہ کن کہ بدام اوافتاد

اردو شعر و ادب کی تاریخ میں شفیقؔ کی شہرت ایک عمدہ شاعر کی بہ نسبت ایک تذکرہ نگار کی وجہ سے زیادہ ہے۔ شفیقؔ کا یہ کمال ہے کہ صرف ۱۸؍سال کی عمر میں انھوں نے ۲۱۳؍ریختہ گو شعرا کا تذکرہ ''چمنستان شعراء'' کے نام سے تحریر کیا جس میں نہایت تحقیق کے ساتھ شعراء کے حالات جمع کیے اور ان کا منتخب کلام ترتیب دیا۔ یہ تذکرہ

اردو ادب میں ایک نہایت وقیع اضافہ ہے اور ہمیں اس عہد کے بے شمار نامور اور گمنام شعراء سے متعارف کرواتا ہے۔ ڈاکٹر حنیف نقوی نے بجا طور پر لکھا ہے کہ ''دکنی تذکروں میں حسنِ ترتیب، جامعیت اور ادبی معیار کے لحاظ سے ''چمنستان شعراء'' کا نام سرِ فہرست ہے''۔[19]

اس تذکرے کے مطالعے سے ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ شفیقؔ ایک اعلیٰ درجے کے محقق تو تھے ہی انتقادی ذہن بھی رکھتے تھے۔ انھوں نے بہت احتیاط کے ساتھ کئی شعراء کے سنین وفات بھی جمع کیے۔ کئی شعراء سے بذاتِ خود ملاقات کی۔ ان کا منتخب کلام ان سے حاصل کیا اور خوبصورت پیرائے میں شعراء کا تعارف پیش کیا جس سے کئی شعراء کی شخصیت کے اہم گوشوں سے ہمیں معلومات حاصل ہوتی ہے۔ شفیقؔ نے جن شعراء کے کلام پر تنقید کی اس میں کہیں بھی تعصب اور جانب داری کو راہ نہیں دی۔ اس تذکرے کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ انھوں نے جہاں جہاں میر تقی میرؔ اور فتح علی خاں گردیزی کے تذکروں سے استفادہ کیا اس کا برملا حوالہ بھی دیا جس سے شفیقؔ کی صداقتِ طبع کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس تذکرہ کی تصنیف و تالیف کا کام شفیقؔ نے شاید حیدرآباد میں شروع کیا تھا کیوں کہ میر تقی میرؔ اور فتح علی خان گردیزی کے تذکرے انھیں سید عبدالولی عزلت سورتی کے ذریعہ سے ملے جو ان دنوں حیدرآباد میں مقیم تھے۔

حیدرآباد میں عزلتؔ کا ذاتی کتب خانہ تھا جہاں تشنگانِ علم و ادب آکر مستفید ہوتے تھے۔ اس کتب خانے میں شعرائے متقدمین و متاخرین کے فارسی اور ریختہ کے دواوین اور بعض دوسری کتابیں تھیں، ان کتابوں میں مندرجہ بالا تذکروں کے علاوہ سراج الدین علی خان آرزوؔ دہلوی کا تذکرہ ''مجمع الانفاس'' اور والہؔ داغستانی کا تذکرہ ''ریاض الشعراء'' بھی تھے جن سے فتوتؔ اورنگ آبادی اور شفیقؔ دونوں نے اپنے اپنے تذکروں کی تالیف و ترتیب کے وقت استفادہ کیا ہے۔ عزلتؔ کے ترجمے میں شفیقؔ نے ''چمنستانِ شعراء'' میں اعتراف کیا ہے کہ ''راقم جب حیدرآباد گیا تھا تو عزلتؔ سے ربط پیدا کیا تھا۔ چنانچہ ہر روز بلا ناغہ ان کی خدمت میں جاتا تھا اور وہ بھی غریب خانے پر تشریف لاتے تھے۔''[20]

شفیقؔ نے ۱۱۸۱ھ اور ۱۱۸۲ھ (۱۷۶۷ء۔۱۷۶۸ء) کے درمیان ہندوستان کے فارسی گو شعراء کا تذکرہ لکھا جس کا نام ''گل رعنا'' ہے اس میں ۱۲۹؍ مسلمان اور ۴۰؍ غیر مسلمان شعراء شامل ہیں۔ انھوں نے ان تمام ماخذات کے حوالے بھی لکھے ہیں جہاں سے انھیں ان شعراء کے کوائف حاصل ہوئے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شفیقؔ اصول و ضوابطِ تحقیق سے مکمل طور پر آگاہی رکھتے تھے۔

''گل رعنا'' کی طرح ان کا ایک اور تذکرہ ''شامِ غریباں'' ہے۔ لیکن اس میں ہندوستان نژاد شعراء کی بجائے ایسے شعراء کا ذکر ہے جو ایران اور دوسرے ممالک سے آکر ہندوستان میں آئے اور یہیں کے ہو رہے۔ یہ تذکرہ ۱۱۹۷ھ (۱۷۸۲ء) میں مکمل ہوا تھا۔

شفیقؔ کی شہرت ایک مورخ کی حیثیت سے بھی ہے۔ انھیں تاریخ نویسی کا اچھا سلیقہ تھا۔ انھوں نے اپنی تالیف ''بسائط الغنائم'' کے دیباچے میں لکھا ہے کہ ''تاریخ نویسی از شیوہائے عمدہ روزگار است''۔

شفیقؔ کی پانچ تاریخی کتب ہیں جن میں ''حقیقت ہائے ہندوستان'' یا خلاصۃ الہند ۱۲۰۴ھ میں مکمل

ہوئی۔اس میں عہد مغلیہ کے تمام صوبوں اور انکے ماحصل کی تفصیلات کے ساتھ ساتھ صوبوں' اضلاع تعلقہ جات اور ان کے تحت آنے والے دیہاتوں کی تعداد وغیرہ کی معلومات درج ہے۔آج بھی اس کتاب کی اہمیت ہے کیوں کہ مغلیہ عہد کے زراعتی' معاشی نیز جغرافیائی حالات کو سمجھنے کے لیے یہ کتاب ایک بنیادی ماخذ کا درجہ رکھتی ہے۔

۱۷۹۴ء میں شفیقؔ نے ''ماثر آصفی'' لکھی۔اس کتاب کی ترتیب وتدوین کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ۱۲۰۷ھ (۱۷۹۲ء) میں انھیں خیال آیا کہ مدتِ مدید تک انھوں نے آصف جاہی خاندان کا نمک کھایا ہے اس لیے کیوں نہ اس خاندان کی تاریخ لکھ کر یہ حقِ نمک ادا کیا جائے۔شفیقؔ اس بات کے بھی معترف ہیں کہ تاریخ لکھنے سے پہلے انھوں نے اپنے پیش رو مورخین کی کتابوں کا گہرا مطالعہ کیا۔دربارِ آصفی سے تعلق رکھنے والے بے شمار اشخاص سے بالمشافہ معلومات حاصل کی۔سرکاری دستاویزات اور خطوط سے استفادہ کیا اور بسیار تحقیق وتلاش کے بعد اپنے خیالات پیش کیے ہیں۔یہ کتاب جو ایک مخطوطے کی صورت میں ہے تقریباً ایک ہزار صفحات پر محیط ہے۔

شفیقؔ نے ۱۲۰۰ء میں ''تمنیق شنگرف'' لکھی۔یہ دکن کی تاریخ ہے جس میں بہمنی' عادل شاہی' نظام شاہی' عماد شاہی' قطب شاہی' برید شاہی اور خاندیس کے فاروقی حکمرانوں کے حالات اور آخر میں مغلیہ سلطنت کے حالات ۱۲۰۰ھ (۱۷۸۵ء) تک قلمبند کیے ہیں۔یہ کتاب بھی تاریخ پر کام کرنے والے اسکالرز کے لیے ایک بہترین ماخذ ہے۔

۱۲۱۴ھ (۱۷۹۹ء) میں شفیقؔ نے ''حالاتِ حیدر آباد'' لکھی۔اس میں انھوں نے حیدر آباد' بیدر اور اورنگ آباد کی تاریخی عمارتوں' مساجد' منادر اور باغات کی معلومات نہایت صراحت کے ساتھ پیش کی ہے۔اس کتاب کا قلمی نسخہ برٹش لائبریری لندن کا مخزونہ ہے۔ [۲۱]

''بسائط الغنائم'' میں شفیقؔ نے مراٹھوں کی تاریخ کو محفوظ کیا ہے۔اس کتاب کا دوسرا حصہ کسی مراٹھی ''بکھر'' کا ترجمہ ہے۔مولوی عبدالحق کے مطابق شفیقؔ نے یہ ترجمہ ایک انگریز سرجان مالکم کی فرمائش پر کیا تھا۔ چونکہ یہ بکھر کا راست ترجمہ ہے اس لیے اس میں تاریخی واقعات کے بیان میں غیر احتیاطی در آئی ہے۔''بکھر'' کے معنی ہے۔سرگزشت وقائع' خودنوشت' سیرت یا تذکرہ۔مراٹھی میں تحریر کردہ 'بکھر' تاریخی ماخذ کی حیثیت سے ناقابلِ اعتبار ہوتی ہیں۔چنانچہ جادوناتھ سرکار نے ان مراٹھی بکھروں کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ برائے نام' صاف طور پر ناواقف' ضعیف الاعتقاد' کند ذہن مصنفین کی پیداوار ہیں۔اسی لیے جادوناتھ سرکار نے مراٹھوں کی تاریخ لکھتے ہوئے مراٹھی بکھروں کی بجائے فارسی کتابوں سے استفادہ کیا ہے۔بسائط الغنائم میں کئی مقامات پر نہایت محیر العقول اور ناقابلِ یقین اور بے بنیاد واقعات ملتے ہیں جو تاریخی شواہد سے مبرّا اور شک وشبہات کو جنم دیتے ہیں۔

شفیقؔ نے سکھوں کے ''گرونانک جی'' پر بھی ایک معلوماتی کتابچہ لکھا تھا لیکن اس کی تفصیلات نہیں ملتیں۔

شفیقؔ کا ایک اور کارنامہ لغت نویسی بھی ہے۔انھوں نے دس زبانوں کی ایک لغت ترتیب دی تھی جس کا نام ''سوسن دہ زبان'' ہے۔لیکن شفیقؔ کی یہ گراں قدر لغت ناپید ہے۔ [۲۲]

تذکرۂ مخطوطات جلد دوم کے صفحہ ۱۴۱ پر ادارۂ ادبیات اردو' حیدر آباد کی مخزونہ ''گلزارِ شفیق'' کے بارے میں

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ لکھتے ہیں کہ شفیقؔ کے ایک خاص شاگرد حکومت رائے نے یہ کتاب اس وقت مرتب کی ہے جب کہ وہ اپنے استاد کے ساتھ اورنگ آباد سے حیدرآباد تک سفر کررہے تھے اس میں شفیقؔ کے خطوط ہیں جو ان کے معاصرین کے نام لکھے گئے تھے۔ یہ فارسی میں ہے اور ۱۱۸۶ھ (۱۷۷۲ء) کی مرتبہ ہے لیکن ناقص الاخر ہے۔

لالہ لچھمی نرائن شفیقؔ کا انتقال ۱۲۲۳ھ (۱۸۰۸ء) میں ہوا۔ ان کے ایک شاگرد غلام مصطفیٰ سخنؔ نے مندرجہ ذیل قطعہ تاریخ وفات کہی:

سالِ رحلت رقم نمود سخنؔ
وائے مشاطۂ معانی رفت
۱۲۲۳ھ

☆☆☆

حواشی

۱۔ شیخ چاند۔ اورنگ آباد اور اردو شاعری۔ مضمون مشمولہ: مضامینِ شیخ چاند، مرتبہ: ڈاکٹر سحر سعیدی۔ (۲۰۰۷ء)
۲۔ شفیقؔ اورنگ آبادی۔ چمنستانِ شعراء: صفحہ ۵۴، تلخیص ترجمہ و مرتبہ: عطا کاکوی۔
۳۔ عبدالمجید صدیقی۔ مقدمہ تاریخ دکن۔ صفحہ ۸۷/
۴۔ مولوی عبدالجبار ملکاپوری۔ محبوب الزمن تذکرۂ شعراء دکن۔ (۱۳۲۹ھ) جلد اول، صفحہ ۴۴۷/
۵۔ شفیقؔ اورنگ آبادی۔ تذکرہ چمنستان شعراء صفحہ ۵۵/
۶۔ شفیقؔ اورنگ آبادی نے تذکرہ چمنستان شعراء میں حاجی مہر علی اکبر رمال کے ترجمہ میں (صفحہ ۳۴/) اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ "حاجی مہر علی اکبر کی شاگردی اختیار کی اور علم رمل میں ماہر ہوگیا۔ اسی طرح علم قیافہ اور اسرار قاسمی عجائبات و غرائبات کی تحصیل کی۔"
۷۔ ڈاکٹر لئیق صلاح۔ عہد ارسطو جاہ، علمی و ادبی خدمات (۱۹۸۶ء) صفحہ ۱۲۵/ ۸۔ ایضاً
۹۔ مولوی عبدالجبار ملکاپوری۔ محبوب الزمن تذکرۂ شعراء دکن۔ (۱۳۲۹ھ) جلد اول، صفحہ ۵۷۹/
۱۰۔ نصیر الدین ہاشمی۔ دکن میں اردو، میں یہ غزل موجود ہے۔
۱۱۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور۔ تذکرۂ اردو مخطوطات (جلد اول) صفحہ ۱۸۱/ نیز دیکھئے ڈاکٹر لئیق صلاح کی کتاب 'عہد ارسطو جاہ علمی و ادبی خدمات'۔
۱۲۔ ڈاکٹر لئیق صلاح۔ عہد ارسطو جاہ، علمی و ادبی خدمات (۱۹۸۶ء) ۳۰/
۱۳۔ ڈاکٹر لئیق صلاح۔ عہد ارسطو جاہ، علمی و ادبی خدمات (۱۹۸۶ء) ۱۸۶/
۱۴۔ ڈاکٹر لئیق صلاح۔ عہد ارسطو جاہ، علمی و ادبی خدمات (۱۹۸۶ء) ۳۱۷/
۱۵۔ ڈاکٹر لئیق صلاح۔ عہد ارسطو جاہ، علمی و ادبی خدمات (۱۹۸۶ء) ۳۲۱/
۱۶۔ ڈاکٹر لئیق صلاح۔ عہد ارسطو جاہ، علمی و ادبی خدمات (۱۹۸۶ء)
۱۷۔ ڈاکٹر لئیق صلاح۔ عہد ارسطو جاہ، علمی و ادبی خدمات (۱۹۸۶ء)
۱۸۔ ڈاکٹر لئیق صلاح۔ عہد ارسطو جاہ، علمی و ادبی خدمات (۱۹۸۶ء)
۱۹۔ حنیف نقوی۔ شعرائے اردو کے تذکرے۔ ۱۹۹۸ء صفحہ ۱۲۷/
۲۰۔ اسلم مرزا "عطرِ گلِ مہتاب" (عزلتؔ سورتی پر چند مضامین) (۲۰۰۸ء) صفحہ ۲۱/۲۳/
۲۱۔ ڈاکٹر لئیق صلاح۔ عہد ارسطو جاہ، علمی و ادبی خدمات (۱۹۸۶ء) ۳۷۲/
۲۲۔ ڈاکٹر لئیق صلاح۔ عہد ارسطو جاہ، علمی و ادبی خدمات (۱۹۸۶ء) ۵۱۳/

......☆☆☆......

خطوط

بھائی دس بارہ دن سے طبیعت بہت بگڑ گئی ہے۔آنکھوں سے دکھائی بھی کم دیتا ہے۔'اردو چینل' پڑھ لیا تھا۔تم نے رسالے کوتقریباً یک موضوعی بنادیا ہے اور یہ بہت اچھا ہے۔اس بارلوک ادب تمھارا خصوصی موضوع ہے جس سے رسالے کی معنویت بڑھ گئی ہے۔اس موضوع پر کچھ اور شمارے شائع کرو۔

نیر مسعود
ADBISTAN Dindayal Road, Luckhnow-3

'اردو چینل' کا تازہ شمارہ مل گیا۔جہاں تک بھائی وارث علوی کا سوال ہے انھوں نے مِس حیدر کے فیملی ساگا ''کارِ جہاں دراز ہے'' پرنہیں ان کے ناول ''آخرشب کے ہم سفر''ایک طویل مضمون لکھا تھا جو باقر مہدی کے رسالے'اظہار' میں شائع ہوا تھا۔قرۃ العین حیدر نے یقیناً سخت ردِعمل کا اظہار کیا ہوگا جسے وارث علوی نے اپنے خط میں نقل کیا ہے۔وہ اپنی کسی تحریر پر ہلکی سی تنقید بھی برداشت نہیں کرتی تھیں چہ جائیکہ وارث کی 'خنجر مارکہ' تنقید۔لیکن میں پوچھتا ہوں کہ اردو کا کون سا ایسا اہم شاعر،فکشن رائٹر یا نقاد ہے جو اختلاف رائے کو برداشت کرتا ہے۔کچھ حضرات اگر نہایت جارحانہ انداز میں جواب دیتے ہیں اور دلواتے ہیں تو کچھ لوگ نرم انداز میں اپنی ناراضگی کا اظہار کرتے ہیں۔قرۃ العین حیدر کا ایک وصف یہ بھی تھا کہ انھیں اپنے بارے میں لکھے گئے توصیفی مضامین سے بھی خوشی نہیں ہوتی تھی۔ان کا ردِعمل یہ ہوتا تھا'' دیکھا آپ نے،فلاں صاحب نے میرے ناولوں کو سمجھے بغیر ہی اتنا طویل مضمون لکھ ڈالا۔''

پروین شاکر ایک اوسط درجے کی اچھی شاعرہ ہیں۔ان کا موازنہ فہمیدہ ریاض اور کشور ناہید سے بھی نہیں کیا جاسکتا۔قرۃ العین حیدر اردو کی سب سے بڑی ناول نگار ہیں۔مجھے بھی پروین شاکر کی نظم ''قرۃ العین حیدر'' بالکل پسند نہیں آئی۔نظم کے یہ مصرعے دیکھئے:

ریت پر چلتے چلتے/اب تو جلنے لگے ہیں پیر
ریت بھی ایسی جس کی چمک سے آنکھیں جھلس گئی ہیں
آب زر سے نام لکھے جانے کی تمنا تو پوری ہوئی پر
پیاسی آتما سونا کیسے پی لے

پروین شاکر نے دراصل یہ کہا ہے قرۃ العین حیدر کوشہرت تو بہت ملی مگر ان کی روح پیاسی ہے کیونکہ ان کی شادی نہیں ہوئی۔

خود قرۃ العین حیدر کو نہ تو شادی نہ ہونے کا افسوس تھا اور نہ ہی وہ احساس تنہائی کا شکار تھیں۔ وہ دوسرے بڑے شاعروں اور ادیبوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ مصروف رہا کرتی تھیں۔

آخر میں پروین شاکر کا یہ جملہ بھی دیکھئے جو انھوں نے قرۃ العین حیدر کو مخاطب کر کے لکھا تھا:

''ایک بات واضح کرتی چلوں کہ بمبئی اتنا بڑا شہر بہر حال نہیں ہے کہ کراچی کا کوئی رہنے والا وہاں جا کر بوکھلا جائے۔ خدا میرے پاکستان کو سلامت رکھے۔ کبھی فرصت ملے تو ذرا علی سردار جعفری صاحب سے پوچھئے گا کہ آپ کے شہر کے بارے میں میرے تاثرات کیا ہیں۔''

ممبئی جو کچھ بھی ہے اس کے بارے میں ساری دنیا جانتی ہے۔ افسوس کہ پروین شاکر کا انتقال بہت جلد ہو گیا اور وہ اپنے سابق شوہر کی ہونے والی دوسری بیوی کو اپنے ہاتھوں سے دلہن بنانے کی حسرت لیے ہوئے رخصت ہو گئیں۔ افسوس کہ وہ اب یہ بھی نہیں دیکھ سکتیں کہ ان کا پیارا پاکستان نہ صرف سلامت ہے بلکہ اتنی زیادہ ترقی کر چکا ہے کہ ساری دنیا کی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔

آخر میں یاد آ گیا کہ مرحومہ نے ممبئی میں اپنے قیام کے دوران ایک اور نظم بہ عنوان ''سلمیٰ کرشن'' بھی لکھی تھی۔ سلمیٰ صدیقی نے کرشن چندر کے ساتھ ایک طویل اور خوشگوار زندگی گزاری۔ ان دونوں کی شادی کبھی بھی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں رہی لیکن سلمیٰ صدیقی شروع سے ہی خود کو سلمیٰ صدیقی ہی لکھتی رہیں اور پھر آج سلمیٰ کرشن کے عنوان سے پروین شاکر کو نظم لکھنے کی ضرورت کیوں پڑی؟ صرف اس لیے کہ پاکستانیوں کو یہ بتائیں کہ دیکھئے رشید احمد صدیقی کی بیٹی نے ایک غیر مسلم کے ساتھ شادی کر لی۔ یہ نظم بھی پروین شاکر کی مریضانہ اور متعصّبانہ ذہنیت کا ثبوت ہے۔ کہنے کے لیے ابھی اور کئی باتیں ہیں۔ رسالے کے دوسرے مشمولات کے بارے میں، خیر پھر کبھی۔

❁فضیل جعفری

602/2-C, Dheeraj Upvan, Siddharth Nagar, Borivali-E, Mumbai-66

میں نے 'اردو چینل' کی تعریف تو بہت سنی تھی مگر مجھے اب دیکھنے کو ملا۔ اس کے مشمولات بہت دلچسپ اور کارآمد ہیں۔ اس شمارے میں مشمولہ خطوط بھی خوب ہیں۔ اس نئے شمارے میں گستاؤ لے کلز یو، محمد علی صدیقی اور علی حیدر ملک کی نگارشات میرے لیے بے حد کارآمد ثابت ہوئیں۔ رؤف خیر صاحب نے قرۃ العین حیدر اور پروین شاکر کی آپسی شکر رنجی کا دلچسپ تذکرہ کیا ہے مگر انھوں نے پروین شاکر کی وہ نظم بھی اپنے خط میں شامل کر دی جو پروین شاکر نے قرۃ العین کے لیے لکھی تھی۔ نظم کو پڑھ کر مجھے بھی یہی احساس ہوا کہ نظم کا پورا تاثر، ترحّمانہ (Pitiable) سا ہے۔ قرۃ العین کی خفگی قطعی حق بہ جانب ہے۔ کم از کم اس نظم کے پڑھنے کے بعد یہی احساس ہوا کہ قرۃ العین اپنی شادی کے انتظار میں بیٹھی ہیں اور وقت گزرتا جا رہا ہے۔

''موہنی / بھرا پیالہ ہاتھوں میں لیے پیاسی بیٹھی ہے / وقت کا راہو، گھونٹ پہ گھونٹ بھرے جاتا ہے / دیوی بے بس دیکھ رہی ہے / پیاس سے بیکل.......اور چپ ہے / ریت پر چلتے چلتے، اب تو جلنے لگے ہیں پیر /''

یہ سب ترحّمانہ بھی ہو سکتا ہے، طنزیہ بھی اور فخریہ بھی (اگر پروین شاکر شادی شدہ تھیں تب) کم از کم مجھ جیسے کم سمجھ قاری کے ذہن میں تو قرۃ العین کی تصویر یونہی ابھرتی ہے۔ مگر آپ نے جو دونوں خواتین (قرۃ العین اور پروین شاکر) کی تصویریں رسالے کے سرورق پر شائع کی ہیں ان کے اندازِ نظر بھی شاید میرے خیال کی تصدیق کرتے ہیں۔ ذرا غور سے دیکھئے گا۔

آپ نے جو مغربی ادیبوں کی مشہور کہانیوں کے اردو ترجمے شائع کیے ہیں، وہ خاصے کی چیز ہیں۔ اِن سے 'اردو چینل' کی اہمیت مزید بڑھ جاتی ہے۔

❁ پروفیسر سید محمد عقیل

"PINE VIEW" 80-B, Daryabad, Allahabad-211003 U.P

'اردو چینل' کا تازہ شمارہ کئی ماہ بعد شائع ہوا مگر اپنے مواد کے اعتبار سے ترو تازہ لگا۔ اس بار آپ نے لے کلز یو پر انگریزی ترجمے کے توسط جو کچھ شائع کیا ہے وہ پڑھنے میں دلچسپ لگا۔ اردو میں عالمی ادب کے دھارے میں شامل ہو کر اپنے ادب کو مرکزِ نگاہ بنانے والے ادیبوں کے تراجم ہوتے رہنے چاہئیں۔ ترقی پسند تحریک کے زمانے میں روسی اور چینی اور دوسرے سوشلسٹ ملکوں کے ادیبوں کے تراجم تواتر کے ساتھ رسالوں میں شائع ہوا کرتے تھے یہی وہ زمانہ تھا جب ہم اردو والے ٹالسٹائی، گورکی، چیخوف، پشکن، دستووسکی وغیرہ کے نمائندہ ادب سے واقف ہوئے، اس کے ساتھ ناظم حکمت، لوئی آراگاں، پبلو نرودا، محمود درویش اور لورکا کا ادب بھی ہماری زبان میں منتقل ہوا۔ جدیدیت کی رو جب شباب پر تھی تو کافکا، کامیو، ہرمن ہیس، سارتر، تھامس مان، گنز برگ، ورجینا وولف، ندائن، سلویا پلاتھ، گنتر گراس اور گبریل گارسیا مارکیز کے تراجم اور ان کے ادبی افکار ادب پسندوں کے بُک شیلف کا حصّہ بن گئے۔ آپ نے لے کلز یو پر تازہ تر اطلاعی اور معلوماتی مواد خود ترجمہ کر کے شامل کیا، انگریزی سے ادبیات کو اردو میں منتقل کرنے کا عمل سرسری نہیں ہوتا۔ آپ نے Text کو سمجھ کر ترجمہ کیا اس لیے اس کو پڑھتے ہوئے غرابت کا احساس نہیں ہوا۔ آپ کی تحریر رواں دواں تھی۔ اس سلسلے کو جاری رکھئے۔

اس بار 'لوک ادب' بھی آپ کے رسالے کا موضوع بنا ہے، جس نے رسالے کو غیر دلچسپ بننے نہیں دیا۔ اس سیکشن کو مرتب کرتے ہوئے بھی آپ نے ہندوستانی لوک ورثے کے تنوع کو کئی تحریروں کے حوالے سے اجاگر کرنے کی اچھی کوشش کی ہے۔ عبداللہ امتیاز کا مضمون لوک ادب کی روایت اور اس کے انسانی تہذیب وفکر پر اثرات کو عالمی حوالے سے سمیٹنے میں کامیاب ہے لیکن لوک ادب اور لوک ورثے کو ہندوستانی تناظر اور حوالے سے بھی دیکھنے کی ضرورت تھی۔ آسامی، بنگلہ اور پنجابی زبان اور تہذیب کے حوالے سے ان علاقوں کی لوک ثروت مندی کا احساس ہوتا ہے۔ ایک زمانے میں لوک ادب، لوک گیت اور لوک نرتیہ پر خاصا کچھ رسالوں اور کتابوں میں کی صورت شائع ہوتا رہتا تھا۔ یہ تہذیب اور شیلیوں کی بازیافت کا وہ زمانہ تھا جب ترسیل کے سب ہی ذرائع ہماری لوک پرمپراؤں کو تھیٹر، رقص، مصوری اور سنگیت کے حوالے سے گاؤں گاؤں جا کر ان کی کھوج کر رہے تھے۔ اس سلسلے میں افسانہ نگار دیوندر ستیارتھی نے گھر بار تیاگ کر لوک گیتوں کا گاؤں گاؤں پھر کر ایک خزانہ جمع کر لیا تھا جو" گائے جا ہندوستان" کی صورت کئی جلدوں میں شائع ہوا تھا۔ شام پر مارنے 'آنچلک' اور پہاڑی علاقوں کے لوک ادب اور لوک سنگیت پر بڑا وقیع کام کیا تھا۔ ہماری ثقافتی امور کی وزارت نے کئی جلدوں میں "سانسکرتی" نام سے کئی حصّوں میں خاصا معلوماتی ذخیرہ جمع کیا تھا۔ مجھے دو سال تک جب آل انڈیا ریڈیو میں پروگرام پلاننگ کے شعبے کی سربراہی ملی تھی، میں نے جو کئی طرح کے نشریاتی منصوبے بنائے تھے ان میں ایک منصوبہ لوک کہانیوں اور لوک گیتوں کی گائیکی کو علاقہ علاقہ جا کر اس کی اصل اور حقیقی انداز میں صدابندی کرنے کا تھا۔ چونکہ ایسی منصوبہ سازیوں میں میری دلچسپی فطری ہوا کرتی تھی اس لیے میں نے خود بھی برج اور میتھلی کے دور افتادہ مقامات پر جا کر دو چار 'صدابندیاں' کی تھیں۔

میرا خیال ہے اس سمت میں اردو والوں کو بھی کام کرتے رہنا چاہئے۔ کبھی کبھی مجھے جب اس طرح کی کوئی سنجیدہ

کوشش نظر آتی ہے تو مجھے خوشی ہوتی ہے ورنہ تو آپ کے نام دو چار سطریں لکھنا کافی تھا، ایسا خط لکھنے کی ضرورت نہ تھی۔ بہر حال 'اردو چینل' دیکھ کر خوشی ہوئی۔ یاد آیا الہ آباد کے ادارۂ انیس نے لوک روایتوں کے ذیل میں اردو کتابوں کی ایک سیریز شروع کی تھی۔

❁زبیر رضوی
7, Casmo Apts., Zakir Nagar, New Delhi-110025

اردو کے غیر سرکاری رسائل تو پہلے ہی تھکے ہوئے اور ژولیدہ حواس ہو چکے تھے اب غیر سرکاری رسائل جو برائے نام رہ گئے ہیں ان کا حال بھی پتلا ہو چکا ہے۔ ایسی حالت میں 'اردو چینل' کا شمارہ 27 خاصہ تازہ دم اور پر معنی ہے۔ نوبل انعام یافتہ کلزیو جس نے اپنا انعام قرۃ العین کو معنون کر دیا تھا اس پر آپ نے اچھی معلومات فراہم کی ہے۔ لوک ادب پر بھی عبداللہ امتیاز نے سیر حاصل مضمون تحریر کیا ہے۔ ادب اور کلچر کے زیر عنوان محمد علی صدیقی کا مضمون ادب اور احتساب اور علی حیدر ملک کا مضمون بیسٹ سیلر ادب بہت عمدہ ہیں بلکہ اس موضوع پر پہلی بار کچھ پڑھنے کو ملا۔ ژاں پال سارتر کی کہانی 'قاتل' پر موضوع کے اعتبار سے دستووسکی کی ناول 'کرائم اینڈ پنشمنٹ' کا گہرا اثر ہے۔ دستووسکی نے بھی اپنے ناول میں یہی سوال اٹھایا ہے۔ ایک معمولی سودخور بڑھیا کی زندگی، حوصلہ مند نوجوانوں کی بقا کے مقابلے میں کوئی معنی نہیں رکھتی۔ کاموکی قوت بیان اور وژن کی عمدہ نمائندگی کرنے والی کہانی 'الوداع ماں' پڑھوانے کا شکریہ قبول کیجئے۔ شعری حصّہ بھی خاصہ مالدار ہے۔ مجھے اس سے مطلب نہیں کہ یہ سارا سامان مطبوعہ ہے یا غیر مطبوعہ کیونکہ میرے مطالعے کے لیے نیا ہے۔ اس لیے میرے لیے گراں قدر ہے۔ سب گوشے بھی کام ہیں۔ آپ نے خاصی توجہ سے پرچہ مرتب کیا ہے۔ مبارکباد قبول کیجئے۔

❁اقبال مجید
B-132, Housing Board Colony, Koh-e-Fiza, Bhopal-462001

اردو چینل کی دستاویزی پیشکش ''انٹرویو نمبر'' کے بعد مجھے پوری امید تھی کہ آئندہ بھی اس طرح کے خصوصی شمارے پڑھنے کو ملیں گے۔ ایک لمبے عرصے کے انتظار کے بعد تازہ شمارہ دیکھنے کو ملا۔ بڑی خوشی ہوئی۔ 160 صفحات کے اس رسالہ نما کتابی سلسلے میں ستر بہتر صفحوں پر مشتمل ماری گستاوَلے کلزیو اور لوک ادب کے بظاہر دو الگ الگ مگر ایک دوسرے سے مربوط گوشے شامل کر کے نہ صرف یہ کہ قارئین کی امید پر کھرے اترے بلکہ آپ نے کھچڑی رسالوں کی بھیڑ میں اپنی ایک منفرد پہچان بھی بنالی ہے۔

بہت ادب سے درخواست ہے کہ اس پہچان کو بنائے رکھیے کیونکہ جو کام آپ کر رہے ہیں وہ آپ سے پہلے محمد طفیل اور صابر دت نے کیا تھا۔ مگر یہ میدان اتنا بڑا ہے کہ اس کی وسعت ناپنے کے لیے کئی شہسواروں کی ضرورت ہے۔ میری محبت، تعاون اور نیک خواہشات آپ کے ساتھ ہیں۔

❁جاوید صدیقی

کافی دنوں بعد 'اردو چینل' کا نیا شمارہ ملا۔ بہت خوب۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس پرچے کے چند ہی شماروں نے آپ کو اردو رسائل کے منفرد اور ناقابلِ فراموش مدیران کی صف میں لا کھڑا کیا ہے۔

آپ نے اداریے میں یہ کیا کہہ دیا کہ آج کل اردو میں اچھے افسانے لکھے جا رہے ہیں نہ اچھی غزل کہی جا رہی ہے اور چار غیر ملکی، نوبل انعام یافتگان کے افسانے (تراجم) اور عرفان صدیقی کی غزل نیز اسی زمین میں مزید چند شعرا کی غزلیات (بطور عمدہ نگارشات) شائع کی ہیں۔ بھائی بات اچھے لکھنے والوں کی 'اردو چینل' تک

رسائی یا آپ کی، اچھی تخلیقات تک نارسائی کی ہوسکتی ہے وگرنہ آج بھی اردو میں ان سے بہتر افسانے لکھے جارہے ہیں اور ان سے بہت اچھی غزلیں کہی جا رہی ہیں۔ ہر چند کہ ہمیشہ کی طرح ان کی تعداد کم ہے۔

❁پروفیسر مظفر حنفی

D-40, Batla House, New Delhi-110025

'اردو چینل' کا نیا شمارہ مل گیا۔ اس سے پہلے انٹرویو نمبر بھی ملا تھا۔ بیچ میں ایک بڑا گیپ پڑا تھا، جس کی وجوہات بھی نئے شمارے سے معلوم ہوئیں ورنہ میں تو سمجھ رہا تھا کہ:

مری بے نیازی سے روٹھ کر مرے غمگسار چلے گئے

نیا شمارہ بہت عمدہ ہے۔ خاص طور پر گستاؤ لےکلزیو کے خیالات، ادب کے بارے میں بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔ اپنی تہذیب، ثقافت اور روایت سے باہر رہ کر کسی زبان کا سچا ادب تخلیق نہیں کیا جاسکتا۔ کتابیں پڑھ کر کتابیں لکھنے والوں کے لیے یہ لمحۂ فکریہ ہے۔ محمد علی صدیقی کے دونوں مضامین اچھے ہیں۔

عزلت سورتی پر اسلم مرزا کا مضمون تعارفی ہے۔ اس قسم کے مضامین اور بھی آنے چاہئے تاکہ نئے لکھنے والے یہ اندازہ تو لگائیں کہ ہم کہاں سے چل کر کہاں تک پہنچے ہیں۔ رؤف خیر کا مضمون دلچسپ ہے۔

بہر حال یہ شمارہ بھی انٹرویو نمبر کی طرح محفوظ کرنے کے قابل ہے۔ اس قسم کے شماروں میں بس ایک خرابی یہ ہوتی ہے کہ احباب پڑھنے کے لیے لے جاتے ہیں اور شاید واپس کرنا بھول جاتے ہیں۔ کم از کم میرے ساتھ تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ میں اس شمارے کے لیے آپ کو مبارکباد نہ دینا ادبی بددیانتی سمجھتا ہوں۔ خدا کرے آپ 'اردو چینل' کو مسلسل تادیر جاری رکھ سکیں۔

❁بشر نواز

Near Sane Hospital, Bhadkal Gate, Aurangabad-431001 M.S

'اردو چینل' کا نیا شمارہ ملا۔ پورا رسالہ آپ کی بصیرت کا مظہر ہے۔ رسالہ نکالنے کے معنی ایک بڑے چیلنج کو قبول کرنا ہے۔ اسے سوائے دیوانگی کے اور کیا نام دیا جاسکتا ہے۔ یہ دیوانگی ہمارے بزرگوں میں بہت تھی لیکن ان کی ضروریاتِ زندگی کی فہرست کوتاہ ہوا کرتی تھی۔ آج کے لائف اسٹائل کو قائم رکھتے ہوئے کسی رسالے کی بِنا ڈالنے کا تصور بھی محال ہے۔ اس شمارے کے سارے مشمولات میں میرے لیے کافی ترغیب کا سامان تھا۔ میں نے ایک ہی دن میں سب کچھ پڑھ ڈالا۔ آپ میمنہ اور میسرہ کے چکر میں نہیں پڑے، یہ بات مجھے اچھی لگی۔ ایک خاص معیار کو قائم رکھنے کے لیے آپ کوشاں ہیں، ثابت قدمی اسی لیک پر جمے رہئے۔

❁پروفیسر عتیق اللہ

125-C, Flat No-5,Baera Appt., Noor Ngar Ext. New Delhi-110025

کمال ہے بھائی، آپ نے پھر کمال کردیا۔ 'اردو چینل' کا تازہ شمارہ ایک اور بے مثال، منفرد علمی و ادبی دستاویز ہے۔ ایک اور ناقابل فراموش اشاعت، مختصر مگر جامع بھرپور دل پذیر تحریروں سے مزین، تمام مضامین فکر انگیز، غور طلب، خصوصی توجہ طلب بلکہ بڑے گیان دھیان اور دھیرج سے پڑھنے والے۔ گوشۂ لےکلزیو ہو کہ لوک ادب یا ادب و کلچر کا گوشہ، کہانیاں ہوں کہ مکالمہ و مباحثہ..... سب اپنے اندر بڑی گہرائی و گیرائی اور غیر معمولی کشش رکھتے ہیں۔ 'شہر درد آباد کا

شاعر___ عزلت سورتی بھی ایک منتخب شعری آئینہ خانہ ہے۔عرفان صدیقی مرحوم کی ایک یادگار غزل پہ شعرانے طبع آزمائی خوب کی ہے،مگر۔ اس کی تمثال کو پانے میں زمانے لگ جائیں۔

احمد رئیس

Faizan E Moeen, 3-D-28/45, Nazimabad, Karachi, PAKISTAN

گزشتہ شمارہ (انٹرویونمبر) کے باب میں اعتراف کرتا ہوں کہ مجھے پسند آیا تھا۔عین ایسے زمانے میں، کہ جب ہمارا ناقد خالص ادبی موضوعات پر بات کرنے سے کترا رہا ہو،اردو چینل کے صفحات،ایک مثبت مکالمے کی فضا باندھنے کے جتن کررہے تھے اور یہ کوئی کم اہم بات نہیں تھی۔تنقید چاہتی تو اس مقام سے کروٹ لے کر اپنا رخ تخلیق کی طرف موڑ سکتی تھی مگر حیف کہ ہمارا ناقد تخلیقی عمل اور ادب پاروں سے پرے ادھر مغرب میں پہلے ہی فرسودہ ہو چکے فلسفیانہ مباحث کی جگالی کی ہوس میں ایسا مبتلا ہوا تھا کہ اس موقع سے بھرپور فائدہ نہ اٹھایا جا سکا۔ مجھے وہ شمارہ اگرچہ خوب بھایا تھا مگر میرے نام سے چھپنے والے انٹرویو نے مجھے الجھایا، کہ ایک تو مجھ سے پوچھا تک نہ گیا تھا اور دوسرا یہ کہ وہ تین چار لوگوں کے بیچ ایک خاص موضوع پر مکالمہ تھا جس میں سے کسی اعلان کے بغیر باقی حصے حذف کر کے اس کی نوعیت بدل دی گئی تھی۔

تازہ شمارے میں، یہ جو قمر تمہارا کہنا ہے کہ 'افسانے اور شاعری خراب لکھی جارہی ہو تراجم چھاپ لیے جائیں، کہیں اس سہل پسندی کا شاخسانہ تو نہیں ہے جو ہمارے ہاں کے بیشتر مدیران کو لاحق ہے۔بالعموم مدیروں کا یہ ٹولہ سنجیدہ تخلیق کاروں سے رابطہ کرنے کی کوشش کرتا ہے، نہ جرأت رکھتا ہے۔لہٰذا جو کچا پکا ہاتھ آتا ہے اسے چھاپ کر اندھوں میں کانا راجہ ہو بیٹھتا ہے۔معاملہ یہ ہے کہ ہر زمانے میں اچھا لکھنے والے موجود رہے ہیں اور دو چار ایسے پرچے بھی ہیں جو عمدہ تخلیقات چھاپ کر اس بات کا ثبوت فراہم کر رہے ہیں۔خیر تم اس بات کو دل پر نہ لے لینا اور یہ بھی نہ سمجھ لینا کہ میں تراجم کے خلاف ہوں۔ میں تو خود بھی کبھی کبھار تراجم کرتا رہتا ہوں اور ایمان رکھتا ہوں کہ اس دریچے کو ہر حال میں کھلا رہنا چاہیے۔تاہم یاد رکھو کہ ادب سب سے پہلے کچھ اور ہو نہ ہو Indigenous ہوتا ہے، اپنی مٹی، ہوا، پانی اور بو باس کو جھٹک کر اسے عالمی ہونے کی ہوس نہیں ہوتی۔اور یہ ایسا کیمیائی عمل ہے کہ اس کی عطا ترجمہ غارت کر دیتا ہے۔لہٰذا پیارے تراجم چھاپو،ضرور چھاپو،خوب چھاپو مگر انہیں اپنے ہاں کی تخلیقات کی قیمت پر نہ چھاپنا۔

زیر نظر شمارہ میں ادارہ کی محنت اور سنجیدگی جھلک دے رہی ہے۔ژاں ماری گستاؤ کلز یو کو میں نے ڈھنگ سے پڑھا نہیں تاہم اپنے انٹرویو میں جو کچھ اس نے کہا ہے وہ لائق توجہ ہے۔واقعہ یہ ہے کہ ایمیری انڈینس کی تہذیب پر کیا موقوف یورپ کی جارح 'تہذیب'(؟) نے کیا ہند مسلم تہذیب کا ناس مار کر نہیں رکھ دیا۔ہم بھی تو جدید دنیا کے ناحق دباؤ سے ٹوٹ پھوٹ گئے ہیں۔جس طرح ژاں ماری گستاؤ کلز یو کے نزدیک یورپ والوں کے لیے ایمیری انڈینس کی تہذیب کا سامنا کرنے ،اور اس سے سیکھنے کے لیے، بہت کچھ ہے، یورپ جارحیت چھوڑ کر لین دین کا چلن اپنائے تو اسے ہند مسلم تہذیب سے بھی بہت کچھ مل سکتا ہے۔تم نے اس مکالمہ کا ترجمہ بھی خوب کیا ہے۔لوک ادب پر مضامین اور منتخب لوک کہانیاں میں نے توجہ سے پڑھیں اور ''ادب کلچر اور سماج'' والے حصے میں محمد علی صدیقی اور علی حیدر ملک کی مختصر تحریریں بھی پڑھ گیا۔ جان گالز وردی، ہرمن ہیسے ،سارتر اور البیر کامیو کی کہانیوں کو ایک بار پھر پڑھنا لطف دے گیا۔سارتر کی کہانی کے قاتل کے چہرے میں مجھے تو عالمی سامراج کا ایسا چہرہ نظر آیا جو حفظ ماتقدم کی منطق کو اپنی پیش قدمی کے لیے حیلہ بنائے ہوئے ہے اور ''انسانیت کے وسیع تر مفاد'' کے تناظر میں جس

قدر چاہتا ہے انسان کشی کیے چلا جاتا ہے کہ کوئی عدالت ''انسانیت کے اس محسن'' پر مقدمہ نہیں چلا پاتی۔ اور ہاں جس ماں کو کامیو نے الوداع کہا ہے، المیہ یہ ہے کہ وہ بہت تیزی سے ہمارے سماج سے بھی الوداع ہو رہی ہے۔ شاعری کے حصے پر ذرا اور محنت درکار ہوگی۔ ہمارے ہاں اچھی نظم کہی جا رہی ہے اسے بھی پرچے کا حصہ بنا سکو تو مناسب ہوگا۔

❁محمد حمید شاھد

House No. 54, Gali No. 33, Sector. G-9/1, Islamabad, Pakistan

'اردو چینل' کے کچھ شمارے یہاں وہاں دیکھے تھے۔ پہلی بار پورا شمارہ پڑھا۔ سب کچھ بندھے ٹکے پیمانوں سے بالکل الگ ہے۔ جدید، پر کشش اور موضوعات کے تنوع نے اسے بالکل نیا چہرہ دیا ہے۔

موجودہ شمارے میں سب کچھ تو خوب ہے مگر دو اعلیٰ تعلیم یافتہ اور نہایت ذہین عورتوں کے درمیان اختلافات کے قلمی نمونے افسوس ناک ہیں۔ قرۃ العین حیدر نے اپنے او پر سخت مزاجی کا ایسا لبادہ اوڑھ رکھا تھا جس سے ان کی شخصیت کے نرم گوشے کبھی بے نقاب نہ ہو سکے لیکن پروین شاکر کی نظم کے تیکھے الفاظ ان کے زود حس اور زود رنج ہونے کے گواہ ہیں۔ معذرتی انداز میں نرم لہجہ اور مہذب الفاظ کی کاٹ کتنی شدید ہوتی ہے، یہ پروین شاکر کے خط نے خوب واضح کر دیا۔

❁پروفیسر قمر جهاں

A-45, ADS, Mirza Ali Khan Compound, Husainabad, Lucknow-226003. U.P

یہ جان کر اچھا لگا کہ 'اردو چینل' کو بارھواں برس لگ گیا ہے۔ اب تو مسیں بھیگنے لگی ہوں گی۔ ویسے آواز کا بھاری پن تو تمھارے اداریے سے ٹپکنے لگا ہے۔ ''خراب یا کم زور طبع زاد کہانی کو شائع کرنے سے بہتر ہے کہ کسی اور زبان کی اچھی کہانی شائع کی جائے۔'' اور ''اردو میں اگر افسانے خراب لکھے جا رہے ہیں تو شاعری اس سے بھی خراب ہو رہی ہے۔'' یہ بلوغت کے آثار نہیں تو کیا ہیں؟ تم نے اداریے میں یہ اطلاع بھی دی ہے کہ ''اردو لوک ادب پر عبداللہ امتیاز کا ایک خصوصی مضمون بھی شامل ہے۔'' تمھاری سفارش پر میں نے یہ مضمون بہ صد شوق و بہ غور پڑھا لیکن مجھے تلاش کرنے پر بھی اردو لوک ادب پر ایک سطر نہیں ملی۔ بلکہ ایسی لغزشیں نظر آئیں جو پرچے کی ادارت کے معیار کو بھی ٹھیس پہنچا سکتی ہیں۔ مثلاً ایک جگہ 'لوک ادب' کی تعریف کے طور پر ''ورلڈ بک آف انسائی کلو پیڈیا'' کا یہ کوٹیشن دیا گیا ہے:

Today scholars consider folk to be any group of people who share at least one common factor, may it be geography, religion or ethnic back ground.

آگے پروفیسر وہاب اشرفی کے مندرجۂ ذیل جملوں کو جن میں لوک ادب کی ایک خصوصیت کو بیان کیا گیا ہے، لوک ادب کی تعریف کے طور پر پیش کیا گیا ہے:

''لوک ادب ہماری مرتب، مہذب اور بہت حد تک مصنوعی نیز شہری زندگی کے مقابلے غیر مہذب، دہقانی اور فطری احساسات اور جذبات کا آئینہ ہے۔ اس میں زندگی کا بہاؤ حقیقی سطح پر اس حد تک ملتا ہے کہ مصنوعی زیر و بم کا تموج (؟) ہماری آنکھوں سے دور ہی رہتا ہے۔ کہہ سکتے ہیں کہ دہقانی کلچر کھرا ہوتا ہے اور دہقانی کلچر کا آئینہ خانہ لوک ادب ہے۔''

قطع نظر اس کے کہ اس اقتباس میں نہ صرف لفظوں کے استعمال میں احتیاط کی کمی (مثلاً غیر مہذب اور زیر و بم کا تموج) نظر آتی ہے بلکہ بے جا تکرار بھی کھٹکتی ہے۔ اسے لوک ادب کی تعریف میں شمار نہیں کیا جا سکتا۔

تمھیں چاہئے تھا کہ ایک ذمے دار مدیر کی حیثیت سے اس مضمون کو ایڈٹ کرتے اور اس میں شامل نظری

مباحث اورلوک ادب کی عالمی حیثیت اورمغرب ومشرق خصوصاً ہندوستان میں اس کی روایت کے جائزے کے پیش نظر اسے سرفہرست رکھتے مگرتم نے صرف عنوان دیکھا اوراسے ترتیب میں تیسرے نمبر پر رکھا۔(اس گمراہ کن عنوان کے لیے تمھیں مضمون نگار سے باز پرس بھی کرنی چاہیئے۔)

مجھ جیسے ترجمے کی صحت اور درستی میں جان کھپانے والے ادب کے ایک ادنیٰ خادم کے اختلاجِ قلب میں اضافے کا باعث اے کے رامانجن کا وہ اقتباس بھی ہے جوتم نے 'لوک ادب' والے حصّے کے آغاز میں شامل کیا ہے۔اگرتم اس اقتباس کو بامحاورہ اردو میں ربط وتسلسل اورسلاست کے ساتھ لکھ کر مجھے روانہ کرسکوتو ممون ہوں گا۔

قمرصدیقی،میں تمھاری محنت،تمھارے شوق اورتمھارے قلم کا قائل تھا اورقائل ہوں۔لیکن ادھرایک عرصے سے ان تینوں چیزوں میں استقامت کی کمی مجھے آزردہ وملول کرتی رہتی ہے۔میں خوداس کمی کے سبب اوراپنی ادنیٰ ترجیحات کے کارن اُن سربلندیوں سے محروم ہوتا چلا گیا ہوں جو میرا مطمحِ نظر ہونا چاہیئے تھیں۔اس لیےنہیں چاہتا کوئی اوراس محرومی کا شکار بنے۔

اوپر مذکورتلخ باتوں سے قطع نظر'اردو چینل' ایک عمدہ پرچہ ہے،اسے جاری رہنا چاہیئے۔اگراس نے دوسرے پرچوں کوراہ دکھائی ہے تواسے بھی نئی منزلیں سرکرنا نصیب ہوگا۔میری دعائیں تمھارے ساتھ ہیں۔

ڈاکٹر یونس اگاسکر

E-212, 'SHEETAL' VASWANI LANE, ANDHERI(W),MUMBAI-58

رسالہ دیکھ کرآپ کی خوش سلیقگی کی دادنہ دینا ناانصافی ہوگی۔میں نے برسوں پہلے اس رسالہ کا ایک شمارہ دیکھا تھالیکن آج اس کی جوشکل وصورت اورمعیار ہے جیسے زمین آسمان کا فرق ہوگیا ہو۔ہم سب اردو والوں کو یہ خوبصورت اور وقیع رسالہ مبارک ہو۔خدا سے دعا ہے کہ وہ آپ کے حوصلے جو برقرار رکھے اورآپ کی ذات سے وہ کام لے جس کی اردو زبان وادب کواس وقت شدید ضرورت ہے۔آمین۔

ڈاکٹر یعقوب یاور

Dept. of Urdu, B. H. U, Varanasi, U.P

'اردو چینل' کے شمارہ ۲۷ میں آپ نے نوبل کہانیاں اورگوشۂ لے کلزیو شامل کرکے ایک قابلِ تعریف کام کیا ہے۔ آپ نے ان پر مطلوبہ مواد حاصل کرنے میں جانے کتنے پاپڑ بیلے ہوں گے۔ایک بات جس کے لیے آپ لائق تحسین وستائش ہیں وہ ہے آپ کے ترجمہ کرنے کی صلاحیت۔آپ فن ترجمہ نگاری میں مہارت رکھتے ہیں۔مجھے ترجموں سے تھوڑی بہت دلچسپی ہےاوراس کی دشواریوں کا تھوڑا بہت اندازہ بھی ہے۔ماشاءاللہ آپ نے ان دشواریوں کوآسان کردیا ہے۔

رؤف خیر کا مضمون فکرانگیز ہے۔دلیپ چترے کا انٹرویو بھی قارئین کی ذہنی وسعتوں میں اضافہ کرتا ہے۔ 'کلاسک' کے تحت اسلم مرزا نے عزلت سورتی کا تعارف بخوبی کرایا ہے۔'لوک ادب' پربھی آپ نے قابلِ قدر مواد اکٹھا کیا ہے۔آپ کے لیے دل کی گہرائی سے دعائیں نکلتی ہیں۔

حیدر جعفری سید

Post Box No. 468, Kanpur-208001 U.P

ممبئی کوایک اہم ادبی مرکز کی حیثیت حاصل ہے،جہاں سے کئی ادبی رسائل شائع ہوتے ہیں۔افتخار امام

صدیقی کا ماہنامہ ''شاعر''، ساجد رشید کا سہ ماہی ''نیا ورق'' اور قمر صدیقی کا سہ ماہی ''اردو چینل'' وغیرہ۔ پچھلے دنوں 'اردو چینل' کا شمارہ نمبر 27 منظرِ عام پر آیا ہے۔ جس کا ایک گوشہ نوبل انعام یافتہ ادیب ژاں ماری گستاوَلے کلز یو کے لیے مختص کیا گیا ہے۔ 'لوک ادب' کے تحت کئی زبانوں کے لوک ادب سے متعلق مضامین شامل ہیں۔ 'ادب اور کلچر'، 'نوبل کہانیاں'، 'مکالمہ و مباحثہ'، 'غزلیں'، 'کلاسک' و دیگر عنوانات ہیں جن کے تحت نگارشات درج کی گئی ہیں۔ ایک اہم اور دلچسپ مضمون 'قرۃ العین حیدر اور پروین شاکر کے بیچ رنجش' ہے جسے رؤف خیر نے تحریر کیا ہے۔ دیگر لکھنے والوں میں ڈاکٹر محمد علی صدیقی، عرفان صدیقی اور ریحانہ روحی وغیرہ کے نام خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ ''اردو چینل' ان چند رسالوں میں ہے جس کا لکھنے اور پڑھنے والوں حلقوں میں انتظار کیا جاتا ہے اور اس کی وجہ قمر صدیقی کا حسنِ ادارت ہے۔

❁ علی حیدر ملک

A-10, Sector II-B, North Karachi, Karachi-75850. PAKISTAN

'اردو چینل' کا تازہ شمارہ ملا۔ شکریہ۔ آپ کی یہ بات مجھے پسند نہیں کہ اردو میں اچھے افسانے نہیں لکھے جا رہے ہیں اس لیے دوسری عالمی زبانوں کے تراجم پیش کرنا آپ کی مجبوری بن چکی ہے۔ یہ اچھی بات ہے کہ آپ کے اس رجحان کی وجہ سے کئی اچھی عالمی تخلیقات پڑھنے کو مل جاتی ہیں لیکن یہ رجحان اردو ادب کے فروغ کے لیے خوش آئند نہیں ہے۔ اچھا تو یہ ہوگا کہ اچھے افسانے بصد اصرار لکھوائے جائیں۔ پھر یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ کیا کابل میں گدھے نہیں ہوتے! ایسا لگتا ہے، آپ مغرب سے مرعوب ہیں۔ مدیروں کا یہی تو کمال ہوتا ہے کہ وہ اپنی پسند کو قارئین پر تھوپ دیتے ہیں۔ بہر حال 'اردو چینل' کا معیار بہت بلند اور منفرد ہے۔ میں کیا اور میری رائے کیا۔؟

❁ حسن جمال

Editor"SHESH", Loharpura, JODHPUR, (Rajisthan)

بھائی میرے ستائیسواں شمارہ تو کمال کا ہے۔ نہایت اطمینان اور مزے لے لے کر تمام نگارشات پڑھتا رہا اور آپ کے انتخاب و ترتیب کی داد دیتا رہا۔

ماری گستاوَلے کلز یو کو سلام کہ اس نے اپنا نوبل انعام جن مصنفین کے نام کیا اس میں قرۃ العین حیدر بھی شامل ہیں۔ یہ ہمارے لیے فخر کی بات ہے۔ آپ نے ایڈم اسمتھ کے انٹرویو کو نہایت چابک دستی اور خوبصورتی کے ساتھ ترجمہ کیا جس سے لے کلز یو کی شخصیت کے کئی گوشے منور ہو گئے۔

آپ نے 'لوک ادب' پر بہت جاندار اور دلچسپ مواد جمع کر دیا۔ پڑھ کر حد درجہ مستفید ہوا ہو لیکن عبداللہ امتیاز احمد نے اپنے مضمون ''اردو لوک ادب پر ایک نظر'' میں اردو کے لوک ادب کی نشان دہی نہیں کی۔ دیکھئے کہ پنجابی، آسامی اور بنگلہ لوک ادب پر مضامین نہایت صاف اور واضح ہیں۔ ویسے علاقائی زبانوں کی جو لوک کتھائیں آپ نے شامل کی ہیں وہ بڑی پر لطف اور فکر و خیال کے نئے باب کھولتی ہیں۔ اس میں ''اردو'' لوک کتھا کہاں سے آ گئی؟ 'جولاہا جنت میں کیسے جائے گا؟' کہاں سے حاصل ہوئی؟ جناب علی حیدر ملک کا مضمون ''بیسٹ سیلر ادب' نہایت محنت سے لکھا گیا ہے اور قابل تعریف ہے۔ لیکن انھوں نے انگریزی کے کئی بیسٹ سیلر ناولوں کو شامل نہیں کیا Sidney Sheldon اور Ann Rayad وغیرہ

کیسے بھول گئے؟ اردو میں راشدالخیری اوراسی طرح منشی تیرتھ رام فیروز پوری،مظہرالحق علوی، دت بھارتی چندنام یادآرہے ہیں بہت پاپولررہےاوران کی کتابیں خوب بکتی تھیں۔

نوبل انعام یافتہ کہانی کاروں کی تخلیقات نہایت نادراوراچھوتی ہیں۔ یہ آپ کی خوش سلیقگی ہے کہ آپ نے انھیں حاصل کیا،ان کے ترجمے کروائے اوراردوادب کو کچھ اورمتمول کردیا۔زندہ باد۔

دلیپ چترے میرا پسندیدہ شاعر ہے۔اس کی کئی نظمیں میں نے مراٹھی سے اردو میں ترجمہ کی ہیں اور کچھ تو شائع بھی ہوچکی ہیں۔چترے کاانٹریو خاصے کی چیز ہے۔

عرفان صدیقی کی زمین میں کئی شعرا کے یہاں ''ذوق یاروں نے بہت زورغزل میں مارا'' لیکن فرحت احساس اورعرفان جعفری نے اچھے شعرنکالے۔انھیں مبارکباد۔مجموعی طور پراردوچینل کا یہ شمارہ 27، Collection Item کی ذیل میں آتاہےجس کے لیےآپ اورعبیداعظم اعظمی نیز قاسم ندیم مبارکباد کے مستحق ہیں۔

۞اسلم مرزا

Flat No.8, 1st Floor, Saleem Complex, Dewrhi Bazar, Aurangabad-431001

'اردوچینل' کانیاشمارہ موصول ہوایہ جان کرافسوس ہوا کہ آپ اردو کے موجودہ تخلیقی ادب سے مایوس ہیں۔اردو کے لیے یہ افسوس ناک موسم ہے۔قارئین مدیران سے ناخوش،مدیرقارئین سے ناراض۔تخلیق کارناقدین سے شاکی اورناقدین تخلیق کاروں سے مایوس۔اس طرح سب یاسیت کا شکارہوجائیں گےاور جو کچھ تخلیقی سلسلے جاری ہیں وہ بھی رک جائیں گے۔

آج اردو میں میر و غالب تلاش نہ کریں۔کرشن چندر، بیدی اورمنٹواب دوسراجنم نہیں لینے والے۔وہ اپنے زمانے اورحالات کی نمائندگی کرکے چلے گئے۔اب جولوگ لکھ رہے ہیں وہ اپنے زمانے کی نمائندگی کررہے ہیں۔تخلیقی دنیا میں آپ کسی کے ذہن میں اپنی سوچ نہیں بھر سکتے۔کسی کے منہ میں اپنی زبان اورکسی کے ہاتھ میں اپنا قلم نہیں دے سکتے۔جو کچھ اردو میں لکھا جارہاہےاسی میں بہتر سے بہترانتخاب کرکےشائع کریں۔یہ سچ ہے کہ پرائی زبان کےتراجم اردو کی تخلیقی کھائیوں کو پرنہیں کرسکتے۔

۞نذیر فتح پوری

230/B/102,VEEMAN DARSHAN, SANJAY PARK, PUNE-411 032.

'اردوچینل' کا تازہ شمارہ دیدہ زیب اورخوبصورت تو ہے ہی،اس کا ''حصّۂ نثر'' اچھے اچھے پرچوں پر بھاری ہے۔ترجمے خوب ہیں۔مضامین بھی جاندار ہیں۔محمدعلی صدیقی کا مضمون 'زبان اورتہذیب' مختصرمگر جامع ہے۔ڈاکٹر صاحب نے اردووالوں کودعوتِ فکربھی دی ہےاورراستہ بھی دکھایاہے۔'بیسٹ سیلرادب' ہمیشہ ہی ہرزبان کےادب کے لیے ضروری رہاہےلیکن آج اردو کا ایک طبقہ ایسے عدق اورثقیل ادب کا حمایتی ہے جو لائبریریوں کی الماریوں میں یا پھر چند بقراطی قسم کےدانشوروں کی الماریوں میں بندرہے۔یہ سچ ہے کہ ادب کی ایک اعلیٰ سطح بھی ہوتی ہےمگرعوام تک پہنچنے والے ادب سے زبان باقی رہتی ہے۔افسوس اردواس سے دورہوتی جارہی ہے۔

حصّہ نظم پھیکا لگا۔صرف غزلیں ہی پڑھنے کوملیں اور وہ بھی ایک بحر، ردیف اورقافیے کی۔لگتا ہے کسی طرحی مشاعرے میں شامیانے کے نیچے بیٹھا ہوں۔'اردوچینل' جس کے مدیران شاعر ہیں،اس میں صرف غزلیں ہی پڑھنے پر

اکتفا کر کے تشنگی رہی۔ نہ کوئی نظم، نہ گیت، نہ دوہے، نہ ہائیکو، نہ ماہیئے، نہ ترائیلے، نہ سانیٹ، نہ رباعی، نہ قطعہ، نہ سلام، نہ حمد، منقبت نہ مرثیہ....اس طرف دھیان دیں۔

❁احمد وصی

Hnajar Nagar, Andheri-E, Mumbai

حالانکہ 'اردو چینل' کا شمارہ 27، انٹرویو نمبر کے کافی عرصے بعد آیا ہے لیکن ایمان کی بات یہ ہے کہ ابھی انٹرویو نمبر کا کیف وسحر ذہن پر طاری ہی تھا کہ تم نے ایک اور بہت ہی انہماک آفریں سامانِ مطالعہ فراہم کر دیا ہے۔ بھرا پُرا، متنوع اور ٹھوس مشمولات سے پُر۔ ملکی اور غیر ملکی ادب کی ایک کشید پیشِ نگاہ ہے۔ ہر باب نظر میں جما کر پڑھنے اور حظ اندوز ہونے کے لیے ہے۔ کن کن مضامین کی تحسین کی جائے۔ ابھی مکمل پڑھ نہیں پایا ہوں مگر جتنا پڑھا ہے، بقیہ پڑھنے کا ادعا اور بھی انگیز ہو گیا ہے۔

آج کی تیز روز زندگی میں جب کسی کتاب کا بالاستیعاب مطالعہ بے حد مشکل ہو گا ہے، 'اردو چینل' کے پائے کے رسالے ایک ارتکاز مہیا کر دیتے ہیں جو تسکینِ خاطر کا باعث ہوتا ہے۔ تمھاری محنت اور لگن بار آور ہو رہی ہے۔ اسے برقرار رہنا چاہئے بلکہ فزوں تر!

❁عبد الاحد ساز

149, Yusuf Meherali Rd., Zakaria Manor, 4th Floor, Mumbai-400004

'اردو چینل' کا تازہ شمارہ ملا۔ یقیناً مزاج اور معیار کے لحاظ سے یہ رسالہ اردو کے دیگر رسائل سے بہت مختلف ہے۔ یہ نہ صرف ادبی حلقہ کی سیرابی کا کام کر رہا ہے بلکہ وہ طلباء جو تحقیق وتنقید کی منزلیں طے کر رہے ہیں ان کے لیے بھی نہایت مفید اور کارآمد ہے۔

چونکہ افسانہ نگاری سے میرا تعلق ہے اور آپ نے جو سوال اٹھایا ہے کہ اردو میں خراب افسانے لکھے جا رہے ہیں یہ ایک نئی بحث کا موضوع بھی بن سکتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہم اردو والے ابھی تک رویوں میں ہونے والی تبدیلیوں اور معاشرے کی بدلتی قدروں پر ہی حرف نمائی کر رہے ہیں۔ گو انٹرنیٹ کے ذرائع نے دنیا کو سمیٹ دیا ہے لیکن اس کے باوجود ابھی ہمارے پاس دنیا میں ہونے والی سائنسی، طبّی اور تکنیکی ایجادات کی صحیح تفصیلات کے ساتھ افسانے نہیں لکھے جا رہے ہیں۔ ساتھ ہی وہ موضوعات بھی نہیں ہیں جو مغربی فنکار برت رہے ہیں۔ (اگر چہ مشرقی اور مغربی ماحول میں بڑا تہذیبی فرق ہے)۔ ابھی ہمارے پاس وہ علم بھی نہیں ہے۔ صرف مطالعہ کی بنیاد پر اگر موضوعات برتے جائیں تو لڑکھڑانے کا جواز بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ دوسری بات یہ بھی کہ شاید ہمارا قاری بھی ان تفصیلات سے اکتاہٹ محسوس کرے گا۔ یہ تبدیلی آئے گی ضرور لیکن آہستہ آہستہ۔ اور ایسا بھی نہیں کہ محض خراب ہی افسانے لکھے جا رہے ہوں! ہمارے کچھ ادیب بین الاقوامی موضوعات پر بھی افسانے لکھ رہے ہیں گو ان کی تعداد ابھی بہت کم ہے لیکن امید تو باندھی جا سکتی ہے۔

'لوک ادب' کی اپنی ایک اہمیت ہے۔ یہ ہمارے ماضی کی تہذیبی، معاشرتی زندگیوں کی بازیافت کا سب سے موثر ذریعہ ہے۔ حالانکہ اپنی لاپرواہیوں کی وجہ سے ہم نے اپنے لوک ادب کا بہت سارا حصّہ دریا برد کر دیا ہے۔ اس سلسلے میں جس طرح کے مضامین حاصل کر کے آپ قاری تک پہنچا رہے ہیں یہ ایک اہم کارنامہ ہے۔ اور بھائی میں اب بھی ماضی پرست ہوں اور اسی میں پناہیں ڈھونڈتا ہوں۔

نوبل انعام یافتگان کے افسانوں کے تراجم میرے جیسے قاری کے لیے کسی نعمت سے کم نہیں۔ آپ کا انتخاب

بھی لاجواب ہے۔اسی طرح نوبل انعام یافتہ فنکار ماری گستاؤ لےکلز یو کا گوشہ مختصر ہوتے ہوئے بھی عمدہ ہے۔'اردو چینل' کا یہ شمارہ اپنے قاری پر بھر پور تاثر قائم کرتا ہے۔

نورالحسنین

Flat No.8, 1st Floor, Saleem Complex, Dewrhi Bazar, Aurangabad-431001

اردو چینل کا نیا شمارہ باصرہ نواز ہوا۔ادب کو لے کر تمہارا نظریہ ہمیشہ سے صاف رہا ہے—

اور میں مکمل اتفاق نہ کرتے ہوئے بھی ہمیشہ تمہارے ساتھ رہا—اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ ادب میں ہمیشہ سے اظہار کی آزادی رہی ہے—اسی آزادی نے کبھی ترقی پسند تحریک کا نعرہ دیا تو کبھی جدیدیت اور کبھی مابعد جدیدیت کی شمع روشن کی— ہم تم الگ الگ نظریے کے مسافر ہو سکتے ہیں لیکن مختلف راستے جہاں جا کر ایک ہو جاتے ہیں، وہ ادب ہے— تمھارا رسالہ ان معاملوں میں دوسرے رسائل سے مختلف ہے کہ تم ہمیشہ نئے نئے بحث ومباحث کی فضا پیدا کرتے ہو— میرے بھائی، اختلاف اس لیے بھی ضروری ہے کہ، بات نکلی تو بہت دور تلک جائے گی— شروع میں مجھے اس بات کا شک ہوا تھا کہ تمہارے رسالہ پر کہیں 'شب خون' کی حکومت تو نہیں— مجھے آہستہ آہستہ اس بات کا احساس ہوا کہ تم پر فاروقیت حاوی نہیں ہے— ہاں، تم ان سے متاثر ضرور ہیں اور کسی سے متاثر ہونا کوئی گناہ یا کوئی جرم نہیں ہے— تمھارا ذہن کشادہ ہے—اور ہمیشہ تم کچھ نیا دینے کے بارے میں سوچتے رہتے ہیں۔تازہ شمارہ کی ترجمہ کہانیاں پڑھی ہوئی تھیں— مضامین کا حصہ وقیع ہے— تم اردو چینل کا بڑا استعمال نئی نسل کو سامنے لانے میں کر سکتے ہیں۔آج ہندی میں 'بڑوں' سے زیادہ نوجوان چھا گئے ہیں۔گیان پیٹھ اور راجکمل جیسے پبلی کیشن انہیں اہتمام سے اور نمایاں طور پر جگہ دے رہے ہیں— اس لیے میری خواہش ہے کہ اردو چینل نئی نسل کے لیے بھی ایک بڑا پلیٹ فارم ثابت ہو—

مشرف عالم ذوقی

D-304TAJ ENCLAVE, GEETA COLONY, DELHI-110031

آپ نے ہمیشہ چونکانے والا کام پیش کیا ہے۔پچھلی بار دنیا بھر کے اہم فنکاروں کے انٹرویوز جمع کر دیئے تھے، اس بار لوک کہانیوں کا ڈھیر لگا دیا۔اردو کے ساتھ ساتھ، بنگالی، آسامی، پنجابی، گونڈی، سنتھالی، راجستھانی وغیرہ لوک کہانیاں ہندوستانی تہذیب وثقافت کی مظہر ہیں۔جناب علی حیدر ملک نے بیسٹ سیلر ادب کے تعلق سے خوب لکھا ہے۔انھوں نے انگریزی ادب کی کتابوں کے بارے میں معلومات بہم پہنچائی ہیں۔انھوں نے اردو کتابوں کی تعداد کے بارے میں بالکل بجا فرمایا کہ اردو کتابوں کی اشاعت کا کاروبار غیر سائنسی طریقے سے ہوتا آ رہا ہے۔انھوں نے جاسوسی دنیا، رومانی دنیا کی مقبولیت کا حوالہ دیا مگر ''شمع'' اور شمع کے ادارے سے شائع ہونے والے دیگر رسائل کا ذکر نہیں کیا جیسے شمع کے ساتھ سشما (ہندی)، شبستان، مجرم، کھلونا، بانو وغیرہ بھی تھے جو ہزاروں کی تعداد میں شائع ہوتے تھے۔ماہنامہ 'بیسویں صدی' جیسا کچھ تھا، عوام میں مقبول تھا اور خوب بکتا تھا۔

جناب اسلم مرزا کا مضمون 'شہر درد آباد کا شاعر: عزلت سورتی' بہت معلوماتی ہے۔عرفان صدیقی کی زمین میں فرحت احساس نے اتنی پیاری غزل کہی کہ خود عرفان کی صدیقی کی غزل پھیکی پڑ گئی:

سب کے جیسی نہ بنا زلف کہ ہم سادہ نگاہ   تیرے دھوکے میں کسی اور کے شانے لگ جائیں

رؤف خیر

9-11-137/1, Moti Mahal, Qila Goolkonda, Hydrabad-500008 A.P

اردو چینل کا تازہ شمارہ کئی دنوں پہلے ہی مل گیا تھا. شکریہ!

سوچا کہ اچھی طرح پڑھ لوں تو خط لکھوں اس چکّر میں تاخیر ہوگئی۔ مطالعہ کے بعد یہی خیال قائم ہوا کہ سابقہ شماروں کی طرح اس شمارے نے بھی اپنے منفرد اور اہم ہونے کا ریکارڈ برقرار رکھا ہے۔

اردو والوں کے لئے یہ بڑی خوش خبری ہے کہ لے کلز یو نے اپنا نوبل انعام جن لوگوں کے نام معنون کیا ہے ان میں ہماری عینی آپا بھی شامل ہیں۔ لے کلز یو کے انٹرویو، مضامین اور ان پر لکھے گئے مضامین کا قمر صدیقی نے خوب ترجمہ کیا ہے۔ لوک ادب پر شامل کے گئے مضامین اہم ہیں اور ہماری جانکاری میں اضافہ کرتے ہیں۔ جان گالزوردی کی کہانی 'موچی'، سارتر کی کہانی 'قاتل' اور کامیو کی کہانی 'الوداع ماں' مجھے خاص طور پر پسند آئیں۔ انھوں نے کتنی سادگی اور آہستگی سے ڈرامایت کے بغیر اپنی بات قاری کے سامنے رکھ دی ہے۔ ہمارے یہاں چونکانے کی نفسیات سے کم فنکار اپنی کہانی کو الگ رکھ پاتے ہیں۔ دوسری زبانوں کی کہانیوں کا ترجمہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ نئے تناظر سے ہماری واقفیت ہو۔ سب لوگ براہ راست دوسری زبانوں کے ادب کا مطالعہ نہیں کر پاتے۔ دلیپ چترے سے کی گئی گفتگو بھی اپنی اہمیت کا احساس کراتی ہے۔ دو فنکاروں کی نوک جھونک سے رؤف خیر نے دلچسپ مضمون تیار کیا ہے جو ان (فنکاروں کی) کی نفسیات سے واقف کراتا ہے۔

عرفان صدیقی کی زمین میں غزلیں کہلوا کر اچھی شروعات کی ہے۔ عام طور پر دوسروں کی زمینوں میں کہی گئی غزلوں میں باسی پن جھلکتا ہے مگر تمام فنکاروں نے اپنے اشعار میں تازگی کا احساس کرایا۔

مجموعی طور پر تازہ شمارہ ہر اعتبار سے اہم شمارہ ہے اور اس کے لئے آپ لوگوں کی ٹیم مبارکباد کی مستحق!

❁عالم خورشید
%The D. A. (P), Exhibition Road, Patna-800001

'اردو چینل' کا تازہ شمارہ دیکھ کر طبیعت خوش ہوگئی۔ اگر چہ بہت سے لوگوں نے یہ سمجھ لیا تھا کہ رسالہ بند ہوگیا، لیکن مجھے یقین تھا کہ آپ اسے دوبارہ جوش وخروش کے ساتھ منظر عام پر لائیں گے اور اس کا معیار سابقہ شماروں سے کہیں بہتر ہوگا۔ خدا کا شکر ہے کہ مجھے مایوسی نہیں ہوئی۔

27ویں شمارے کو آپ نے بڑی محنت سے ترتیب دیا ہے۔ گستاؤ لے کلز یو کا گوشہ بہت خوب ہے۔ نوبل انعام یافتگان کی کہانیوں کے ترجمے مزہ دے گئے۔ 'لوک ادب' سے متعلق مضامین ادب اور کلچر کو سمجھنے میں مدد کرتے ہیں۔ رؤف خیر کی تحریر میں نے دلچسپی سے پڑھی۔ اس مرتبہ عرفان صدیقی کی زمین میں مختلف شعرا کی غزلیں پڑھ کر تازگی کا احساس ہوا، لیکن فرحت احساس نے جو اشعار نکالے ہیں ان کا جواب نہیں۔ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ آج اچھی شاعری نہیں ہو رہی ہے۔ کم ہو رہی ہے، یہ بات بالکل درست ہے۔

❁راشد انور راشد
Dept. of Urdu, Aligarh Muslim University, Aligarh U.P

'اردو چینل' پہلی بار نظر سے گزرا اور میں حیران ہوں کہ اتنا معیاری اور معلوماتی اہم رسالہ اب تک کہاں تھا؟ ''دیر آید درست آید'' والی بات ہوئی۔ یہ رسالہ صرف ایک رسالہ نہیں بلکہ اہم دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ کیونکہ اس میں آپ نے زبان کے سلسلے میں اور مختلف ریاستوں کے لوک ادب، لوک تہذیب پر جو مضامین شامل کیے ہیں، خاص طور سے 'ہندوستان کی علاقائی زبانیں'، 'جنوب ہند میں زبان وتہذیب کا ارتقا'، 'اردو لوک ادب'، 'بنگلہ لوک ادب'، 'آسامی، پنجابی

لوک تہذیب، یہ تمام کے تمام مضامین بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔
خطوط کے حصّے کو پڑھ کر اندازہ ہوا کہ شمارہ 26 انٹرویو نمبر تھا۔ جس کو دیکھنے کی خواہش ہے۔ ژاں ماری گستاوَ لے کلز یو کا گوشہ بھی خوب ہے۔ ان کا انٹرویو بڑا دلچسپ لگا۔ قرۃ العین حیدر اور پروین شاکر پر رؤف خیر نے مضمون لکھ کر اس شکر رنجی کو دلچسپ بنا دیا ہے۔

ڈاکٹر افسر کاظمی

Flat No. 6, M. Khan Colony, Azad Nagar, Jamshedpur-832110 Jharkhand

اردو چینل کا 27 واں شمارہ، جس کے مطالعہ کا شرف حاصل ہو رہا ہے جبکہ 26 ویں شمارے کا ذکر نہ صرف یہ کہ تقریب میں جو کہ انٹرویوز کے مجموعے کے حوالے سے منعقد ہوئی بلکہ ہفت روزہ اخبار جہاں میں جناب علی حیدر ملک نے کراچی کا ادبی منظر نامہ کے زیر عنوان کالم میں بھی تذکرہ کیا ہے اور موجودہ شمارہ میں اپنے خط میں بھی چنانچہ اشتیاق بڑھتا جا رہا ہے۔ کوشش کروں گا کہ حاصل کروں اور پڑھوں۔
اداریہ کے مطالعے سے معلوم ہوا کہ لمبے وقفے کے بعد یہ شمارہ منظر عام پر آیا ہے جس کی یقینی وجہ موجود رہی ہوگی مگر آئندہ پابندی سے اشاعت کی نوید سے قدرے اطمینان ہوا۔ نوبل انعام یافتگان کی کہانیاں، لے کلز یو کا گوشہ، لوک ادب، ادب اور کلچر کے علاوہ مکالمہ و مباحثہ، غزلیں، کلاسک اور خطوط کے خانوں میں تقسیم کی فہرست دیکھ اور پڑھ کر بے حد خوشی ہوئی۔ مضامین کا انتخاب عمومی طور پر خوب ہے لیکن پروفیسر علی حیدر ملک کا مضمون "بیسٹ سیلر ادب" خاصے کی چیز ہے گو کہ اس مضمون کو کئی باران کے مضامین کے مجموعے "ادبی معروضات" میں پڑھ چکا ہوں پھر بھی اسے دوبارہ پڑھا۔ 160 صفحات پر مشتمل یہ کتابی سلسلہ اردو ماہناموں، سہ ماہیوں اور سالناموں کی بھیڑ میں امتیازی حیثیت کا حامل ہے۔

ابن عظیم فاطمی

ibneazimfatmi@gmail.com

'اردو چینل' اپنے ٹریک پر گامزن ہے۔ کافی طویل وقفے کے بعد 27 واں شمارہ ہمدست و ہم نظر ہوا ہے۔ اداریے میں تاخیر کے سبب پہ گفتگو ہے۔ پیش نظر شمارے میں ژاں ماری گستاوَ لے کلز یو پر گوشہ شامل اشاعت ہے۔ لے کلز یو پر یہ گوشہ آپ کے نقطۂ نظر کی وضاحت اور حفاظت کر رہا ہے۔ اس شمارہ کو 'لوک ادب نمبر' پر محمول کیا جا سکتا ہے۔
دراصل اردو فکشن پر آپ انفرادی طور پر ورک کر رہے ہیں۔ فکشن اردو ادب میں زوال آمادہ ہے۔ آپ نے مختلف زبانوں کے ادیبوں کی نگارشات کو اردو زبان میں نفوذ کیا ہے۔ 'کلاسک' میں عزلت سورتی پر اسلم مرزا کا مضمون قابل مطالعہ ہے۔ 'قرۃ العین حیدر اور پروین شاکر کے بیچ رنجش' رؤف خیر کا دلچسپ مضمون ہے۔ دونوں خاتون ادیب اپنے اپنے دائرے میں بہت عظیم ہیں۔ قرۃ العین اردو فکشن کی نامی گرامی دستخط ہیں تو پروین شاکر شاعری میں بہت بلند اور معتبر آواز ہے۔ قرۃ العین حیدر کی سینئرٹی بہر حال اپنی گھن گرج بنائے ہوئے تھی۔ پروین شاکر کا لہجہ متانت آمیز اور بھرپور ہے۔
منظوم حصّے میں اس بار اردو کے منفرد اور معتبر شاعر عرفان صدیقی کی غزل کی زمین میں شعراء کرام کے مشق سخن کا نمونہ زیب قرطاس ہے۔ عرفان صاحب کی یہ غزل بہر حال ایک خوبصورت اور انفرادیت کی حامل غزل ہے۔ دراصل اس غزل کی زمین میں 'ردیف' ہی اصل چیز ہے۔ جس کو نبھانا ہی اصل کارنامہ ہے۔ فرحت احساس کی گیارہ اور پرویز باغی کی نو اشعار پر

مشتمل غزل بھی شریک اشاعت ہے۔قمر صدیقی ،عرفان جعفری، حماد انجم ،اختر جمال، قاسم ندیم، مقصود بستوی، طارق متین اور ریحانہ روحی وشہناز نبی کی غزلیں بھی شامل کی گئی ہیں۔ایک ہی زمین میں تفنن یقیناً دلچسپ ہوتا ہے کہ یہ شاعر کی قدرتِ کلام کا امتحان لے لیتا ہے۔ یہ بھی آپ کی انفرادیت کی مثال ہے۔ میری غزل کے دوسرے اور تیسرے شعر میں قافیہ کمپوزر نے غلط کر دیا ہے۔دوسرے شعر میں قافیہ ''بتانے''،''سنانے''نہیں ایس طرح تیسرے شعر میں قافیہ'' آنے'' ہے،'' جانے''نہیں۔

'اردو چینل' کے 'خطوط' کا کالم بھی بڑا دلچسپ ہوتا ہے۔ دیر ہی سے سہی لیکن ایک خوبصورت شمارہ منصۂ شہود پہ آیا ہے اس کے لیے آپ بہر حال قابل مبارکباد ہیں۔

❁ حماد انجم

Karankjot, Loharsan, Sant Kabir Nagar-U.P

اردو چینل ۲۷ میں آپ نے بہت سی عمدہ چیزیں جمع کر دی ہیں۔ آپ ترجمہ اور کلاسک پر زور دے رہے ہیں تو یہ بہت اچھی بات ہے۔ معاصر رسالوں میں 'آج' اور 'دنیا زاد' پہلے ہی ترجمے کے ذریعے بہترین ادب ہم تک پہنچاتے رہے ہیں۔لگتا ہے آپ لوگوں نے ایذرا پاونڈ کی اس رائے سے شدید تاثر قبول کیا ہے کہ ''تخلیق کا دور ترجمے کے دور کے بعد آتا ہے۔'' ہمارے یہاں عسکری صاحب تو ہمیشہ ترجمے کی ضرورت پر زور دیتے رہے ہیں۔انھوں نے خود بھی اعلیٰ درجے کے تراجم اردو ادب کو دیئے ہیں۔ کم سے کم فی الحال تو مجھے اردو کے کسی ایسے آدمی کا نام یاد نہیں آ رہا جس نے عسکری صاحب سے بہتر ترجمہ پیش کیا ہو۔ آپ نے آغاز کے تحت مولانا اشرف علی تھانویؒ صاحب کی جو عبارت پیش کی ہے اس میں ہمارے شاعروں کے لیے بہت سی باتیں کام کی ہیں۔ عسکری اور فاروقی صاحب مولانا تھانویؒ کے یوں ہی قائل نہیں ہیں۔ادب اور کلچر کے تحت آپ نے ڈاکٹر محمد علی صدیقی کے جو دو مختصر مضامین شائع کئے ہیں، وہ بہت اہم ہیں۔شاعری کے حصے میں جو یہ آپ نے نیا تجربہ کیا ہے وہ بہت دلچسپ ہے۔عرفان صدیقی کی غزل پر غزل کہنا تو بڑا مشکل امر تھا مگر فرحت احساس اور شہناز نبی کی غزلیں مزہ دے گئیں۔ یہ دونوں ہمارے بڑے طاقتور شاعر ہیں۔

❁ ندیم احمد

Dept. of Urdu, University of Calcutta, Calcutta, (W.B)(11)